Scanned with CamScanner

پرکاش ٹنڈن

ترجمہ: رشید ملک

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب : پنجاب کے سو سال

مصنف : پرکاش ٹنڈن

ترجمہ : رشید ملک

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض ظہور

اشاعت اوّل : 2002ء

اشاعت دوئم : 2006ء

اشاعت سوئم : 2018ء

قیمت : -/500 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

ڈاکٹر مبارک علی کے نام

جنہوں نے مجھے تاریخ کا شعور عطا کیا

رشید ملک

فہرست

پیش لفظ

اس کتاب کے بارے میں مصنف کے درج ذیل بیان کے بعد اس کتاب کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہتی۔

• مارس زرکن اور اس کی بیوی ٹایا' دونوں ہندوستان میں برابر اور بڑے جذباتی طریقے سے دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ ملک کیسے چل رہا ہے۔ انہیں اور مجھے بھی یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اگرچہ میں کئی برسوں سے پنجاب سے باہر ہوں لیکن میری جڑیں اب بھی مضبوط اور تازہ ہیں۔ مجھے بھی بڑے حساس طریقے سے وہ پنجاب یاد ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا اور پلا بڑھا تھا۔ وہ پنجاب تو تقسیم کے بعد واقع ہونے والی تباہی میں غائب ہو گیا لیکن اس کے رسم و رواج کی اجتماعی نسلی یادوں میں میرا بھی حصہ ہے۔ مجھ سے یہ کتاب ان دونوں نے مل کر لکھوائی ہے۔

طباعت کے لئے لکھنا مجھے اپنے بس کی بات نہیں لگتی تھی۔ گفتگو میں تو میں (موضوع کی) چھان بین کر سکتا تھا اور اسے پیش بھی کر سکتا تھا لیکن تحریر کے ضابطوں کی پابندی میرے لئے مشکل تھی۔ مارس اور ٹایا دونوں مصر تھے کہ مجھے کوشش کرنی چاہئے کیونکہ پنجاب کے بارے میں جو کچھ مجھے یاد ہے اسے عام طور پر یاد نہیں رکھا جاتا۔ لوگ یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ مارس کے لئے سوشل تاریخ ہی تاریخ کا وہ پس منظر ہے جو مورخ کو وہ جہت عطا کرتا ہے جو عصری ریکارڈ میں موجود نہیں ہوتی۔ سوشل تاریخ لوگوں' ان کے رہن سہن اور رسم و رواج میں ماضی کو دوبارہ زندہ کرتی ہے۔ اس کا کہنا تھا ان کے بغیر سنجیدہ تاریخ مرتب ہو ہی نہیں سکتی۔ میں صرف کاروباری خط و کتابت اور رپورٹیں لکھنے کا عادی تھا اور کتاب کی صورت میں لکھنے کے متعلق میں بے یقینی کا شکار تھا۔ لیکن ان دونوں کے مجموعی دباؤ کے تحت میں نے اس شرط پر صرف ایک باب لکھنے کی حامی بھر لی کہ وہ اسے اپنے پبلشرز کو بھیجیں گے اور ان کی رائے معلوم کریں گے۔ اگر اس باب سے کتاب

برآمد ہوتی نظر آتی ہے تو پھر اس کوشش کو جاری رکھنا بامعرف ہو گا"۔ پنجابی ساگا:
۴۳۷، ۴۳۸

اور یہ کوشش بڑی بامعرف ثابت ہوئی۔ پہلی کتاب تو یہی "پنجاب سینچری" (Punjab Century) تھی جس کا ترجمہ پنجاب کے سو سال کے عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے۔ دوسری کتاب "بی یانڈ پنجاب" (Beyond Punjab) طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے اور تیسری کتاب "بیک ٹو پنجاب" (Back to Punjab) زیر ترجمہ ہے۔

یہ کتاب ایک ایسی خود نوشت ہے جو پنجاب اور ہندو پنجابیوں کی سو سالہ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۴۷ء) تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس عرصے میں یہ اس خطے میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیتی ہے اور ان کے پس پردہ محرکات پر روشنی ڈالتی ہے۔ رسم و رواج، رہن سہن، انفرادی اور سماجی عادات و اطوار، یہاں کے رہنے والوں کے شخصی اور سماجی رویوں اور قدروں اور زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر اس کتاب کے خاص موضوعات ہیں۔ ان میں تبدیلیاں بڑی سست رو ہوتی ہیں اور ماضی میں انہیں رضائے الٰہی یا نوشتہ تقدیر (تاریخ کی ہیئت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ تھا) سمجھ کر قبول کر لیا جاتا تھا اور تاریخی لحاظ سے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن تاریخ کے متعلق حالیہ نظریات نے اس قسم کی تاریخ کو بڑا اہم قرار دیا ہے۔

راقم کی اطلاع کے مطابق جناب پرکاش ٹنڈن چند سال پہلے یہاں آئے تھے اور انہوں نے چند دن گجرات میں گزارے۔ انہوں نے شہر کو دیکھا، ان گلیوں میں گھومے پھرے جہاں وہ اپنی والدہ کے ہمراہ ملنے ملانے اور منڈی سے سودا سلف خریدنے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے کالری دروازے کے اندر محلہ قانونگو میں اپنے اس مکان کو بھی دیکھا جہاں وہ رہتے تھے اور شاید اس کے حالیہ مکینوں سے بھی ملاقات کی۔

پرکاش ٹنڈن کی "پنجاب سینچری" میسرز شیٹو اینڈ ونڈس نے لندن سے ۱۹۶۱ء میں شائع کی تھی۔ پھر یہ کتاب دوسری دو کتابوں کے ہمراہ پنجابی ساگا کے عنوان سے وائیکنگ نے ۱۹۸۸ء میں دہلی سے شائع کی۔

اس کتاب کی اشاعت پر پہلا حق لاہور کا تھا جو بوجوہ اسے نہ مل سکا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر کے گلشن ہاؤس، لاہور اس کا ازالہ کر رہا ہے۔

ترجمے پر نظر ثانی اور تصحیحات کے لئے راقم جناب پروفیسر شریف کنجاہی کا تہ دل سے ممنون ہے تاہم اغلاط کی تمام تر ذمہ داری راقم کی ہی ہے۔

رشید ملک

لاہور

ستمبر ۱۹۹۵ء

پہلا باب

خاندانی طور پر ہم کھتری ہیں۔ ہمارا تعلق پنجاب کے دیہاتی علاقے سے ہے۔ ہمارا خاندان دریائے جہلم کے کبھی دائیں کنارے اور کبھی بائیں کنارے پر اور کبھی کبھی اس کی ترائی میں رہتا تھا جہاں یہ دریا پنجاب کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔

پنجاب میں اپنے خاندان کے شجرے محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ تھا۔ گنگا کے کنارے ہردوار جیسی مقدس جگہوں پر خاندان کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ وہاں ہمارا ایک پانڈا تھا۔ پانڈے کا منصب موروثی ہے اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا ہے۔ جب کوئی وفات ہوتی تھی تو ارتھیاں دریائے گنگا کے سپرد کرنے کے لئے خاندان میں سے کوئی نہ کوئی ہردوار جاتا تھا۔ پرانی قسم کے دیسی لمبوترے رجسٹر میں جس کی جلد پر سرخ کپڑا چڑھا ہوتا تھا' ہمارے خاندان کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ تمام پیدائشیں' اموات بیاہ شادیاں اور خاندان کی نقل مکانی اور دوسرے اہم واقعات کا اندراج وہ پانڈا اس رجسٹر میں کر دیتا تھا۔

جب میں پہلی دفعہ ہردوار گیا تو میرے صرف یہ کہنے پر کہ میں گجرات کا شنڈن ہوں ہجوم میں سے ایک پانڈا آگے آیا اور کئی پشتوں تک ہمارا شجرہ بیان کر ڈالا۔ وہ میرے والد' چچاؤں اور بڑے بھائی سے مل چکا تھا۔ اس کے پاس ان دوسرے کھتریوں کا ریکارڈ بھی ہوتا ہے جن کا وہ پروہت ہے۔ جب کبھی ہم میں سے کوئی ہردوار جاتا ہے تو گنگا کے کنارے پوجا پاٹ میں یہ پانڈا اس کی مدد کرتا ہے۔ بدلے میں اسے کچھ رقم مل جاتی ہے۔ یہی اس کا روزگار ہے۔ ان پانڈوں کا تجارتی سرمایہ یہی رجسٹر ہیں۔ کئی خاندانوں کے شجرے انہیں زبانی یاد ہیں۔ اپنے بزرگوں کی طرح بچپن سے ہی ان کی تربیت کی جاتی ہے جس سے ان کا حافظہ حیران کن حد تک تیز ہو جاتا ہے۔

ہردوار کے علاوہ کروکشتر میں جہاں مہابھارت کی جنگ ہوئی تھی' اور کشمیر میں مٹن کے مقامات پر بھی ہمارے خاندان کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ میرے پڑدادا کے بھائی نے اس پرانی سڑک پر پیدل سفر کیا تھا جو گجرات سے پیرپنجال کے دروں تک جاتی تھی۔ اس سفر کا حال میں نے ایسے ہی ایک رجسٹر میں دیکھا ہے۔ ہندو تقویم کے مطابق یہ واقع ۱۸۱۱ء میں

یعنی میری پیدائش سے پورے ایک سو سال پہلے پیش آیا۔ یہ اندراج فارسی میں ہے۔ اس میں کشمیر کے اس مشکل سفر اور کشمیر کی دلکشی کا حال ہے۔ اس اندراج میں ہمارے کئی اور رشتے داروں کا بھی ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق میرے پڑدادا کا بھائی کشمیر سے سیب بھی لایا ہو گا اور اپنی پگڑی کے ہر بل میں اس نے ایک سیب رکھا ہو گا۔ اپنی بخیریت واپسی پر اس نے ان سیبوں کے آدھے آدھے اور چار چار ٹکڑے کر کے اپنی بخیریت واپسی پر شکرانے کے طور پر اپنے رشتے داروں میں بانٹے ہوں گے۔

اپنے بچپن میں کچھ عرصے کے لئے میں گجرات کے ایک سکول میں داخل ہوا تھا۔ مغلوں کے زمانے کی ایک سڑک گجرات سے شروع ہو کر بھمبر اور مظفر پور ہوتی ہوئی سری نگر جاتی تھی۔ راولپنڈی سے کشمیر جانے والی سڑک کے بننے سے پہلے یہ پرانی سڑک ہی استعمال ہوتی تھی۔ گجرات کے ریلوے سٹیشن سے سری نگر تک تانگے چلتے تھے اور تقریباً دو ہفتوں میں سری نگر پہنچتے تھے۔ سردیوں کے دنوں میں میں اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر برف سے ڈھکی ہوئی جموں کی پہاڑیوں کی چوٹیوں کو دیکھا کرتا تھا اور اپنے پڑدادا کے اس بھائی کو اس بیچدار سڑک پر چڑھتے ہوئے اپنی تصور کی آنکھ سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن میں شاید دس میل پیدل چل کر یہ سفر اس نے غالباً پندرہ بیس دن میں طے کیا ہو گا۔ آج موٹر کار کے ذریعے یہ سفر صرف ایک دن میں ہی طے ہو جاتا ہے اور ہوائی جہاز سے تو اس میں صرف بیس منٹ لگتے ہیں۔

سکھوں کے دور میں ہمارا پیشہ کاشت کاری تھا۔ کبھی کبھی ہم سکھوں کی ملازمت بھی کر لیتے تھے۔ ہمارے والد ہمیں بتایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں زندگی میں ایک بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ زندگی خطروں سے پر تھی۔ پنجاب ہماچل، جموں، کشمیر اور کسی حد تک افغانستان پر سکھ چھائے ہوئے تھے۔ صرف رنجیت سنگھ کے دور میں مرکزی حکومت کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ انصاف مفقود تھا۔ میرے زمانے تک سکھا شاہی کا مطلب ہی سینہ زوری تھا۔ لیکن سکھ حکومت اتنی جابر بھی نہیں تھی۔ مسلمانوں کے دور میں ہم کمتر شہری تھے مگر سکھوں کے دلوں میں ہندوؤں کے لئے کچھ نرمی ضرور تھی۔ ہمارے لئے سکھوں کی حکومت کا قیام شاید خوشگوار تبدیلی ہو سکتا تھا۔ آخر سکھوں اور ہندوؤں کی نسل ایک ہی تو تھی۔ اکثر ہندوؤں کی رشتے داریاں سکھوں سے تھیں۔ اور باہمی شادیاں بڑی عام تھی۔

ہمارے اپنے خاندان میں میرے بڑے بھائی نے ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جس کی ماں تو ہندو تھی لیکن والد سکھ تھا۔ اسی لڑکی کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو پہلے انگریزوں کی اور بعد میں

ہندوستان کی فوج میں ملازم تھا۔ اس نے مشہور سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ فاتح کابل کی پوتی سے شادی کی۔ ہری سنگھ نلوہ کی بڑی دہشت تھی۔ پٹھان عورتیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لئے کہتی تھیں: "چپ ہو جاؤ نلوہ آ رہا ہے۔"

ہمارے اور سکھوں کے رسم و رواج اور ذاتیں ایک ہی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہماری برادریوں میں شامل ہوتے تھے۔ دیہاتوں میں ہم اکٹھے رہتے تھے۔ ہمارے تہوار بھی مشترک تھے۔ کئی عورتیں خصوصاً ہماری خواتین پوجا کے لئے گردوارے بھی جاتی تھیں۔ بعض اوقات اولاد نرینہ سے محروم ایک جوڑا منت مانتا تھا کہ اگر ان کے ہاں لڑکا ہوا تو وہ اسے سکھ بنائیں گے۔ اگرچہ ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور سکھ بھی ہندوؤں کو اچھا سمجھتے تھے مگر اس زمانے میں نظم و نسق کی حالت بڑی خراب تھی اور ترقی کے مواقع مفقود تھے۔ مقامی افسر من مانی کرتے تھے اور بڑے لالچی تھی۔ افسروں کے خوف اور ان کی نظروں سے بچنے کے لئے لوگ اپنی اصل حیثیت چھپاتے تھے اور اپنے آپ کو کمتر سے کمتر ہی ظاہر کرتے تھے۔

اس روش نے ہمارے خاندان کو خاصا نقصان پہنچایا کیونکہ جب انگریزوں نے زمینوں کا بندوبست کیا تو ہم نے دوسرے کھتری خاندانوں کی طرح اپنے آپ کو زمیندار ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔ اس سے ہم ان مخصوص حقوق سے محروم رہ گئے جو بعد میں زراعت پیشہ لوگوں کو حاصل ہوئے۔

ہمارے والد ہمیں بتاتے تھے کہ ان کے دادا کا ایک بھائی سکھوں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف ۱۸۴۹ء میں چیلیانوالہ کی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ جب میرے والد ابھی بچے ہی تھے تو میرے والد کے دادا کا یہ بھائی طویل القامت کڑیل جوان تھا۔ ہولی کے تہوار پر وہ شیر بنتا تھا اور ایک سالم بکری کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر اٹھا لے جاتا تھا۔ میرے بچپن میں وہ گاؤں کے لڑکوں کو اس جنگ کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ چیلانوالہ کی جنگ میں انگریزوں کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ ہلاک ہونے والے انگریزوں کو میدان جنگ ہی میں دفن کر دیا گیا تھا۔ میرے بچپن تک ہر سنیچر کے دن پیشہ ور نوحہ خواں وہاں چند آنوں کے عوض نوحہ خوانی کرتے تھے اور اپنی چھاتیاں پیٹا کرتے تھے۔ ہمارا یہ بزرگ بتایا کرتا تھا کہ جب کوئی انگریز زخمی ہو کر میدان جنگ میں گرتا تھا تو وہ اپنے منہ میں گھاس لے کر کہتا تھا: "دیکھو ہم گھاس کھاتا ہے۔" (یعنی مجھے نہ مارو میں تو گائے ہوں۔ دیکھو میں گھاس کھا رہا ہوں)۔ "بھلا کوئی گائے کو کیسے مار سکتا ہے؟" ہمارا یہ بزرگ پوچھتا۔

پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ انگریزوں کو دیکھ کر پنجابی بڑے حیران ہوتے تھے۔ انہوں نے ایسے ناپسندیدہ لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پنجابیوں نے پٹھان تو دیکھے تھے اور خود ان میں کئی لوگ گورے رنگ کے بھی ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں اور بال بھی بھورے رنگ کے ہوتے تھے۔ ہمارے اپنے ایک چچا زاد بھائی کا رنگ گورا تھا۔ اس کے بال جنجر رنگ کے تھے اور جلد سرخ و سپید تھی۔ وہ ان چیزوں کو اپنی بدنصیبی سمجھتا تھا کیونکہ اسے بندر کی پچھاڑی سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ لیکن پنجابیوں نے انگریزوں جیسے ناقابل یقین حد تک سرخ چہرے نہیں دیکھے تھے۔ یہ لوگ عجیب و غریب قسم کا چست لباس پہنتے تھے جس میں بڑی بے حیائی سے ان کے پچھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ پنجابیوں نے ایسی عورتیں بھی نہیں دیکھیں تھیں جو عجیب قسم کا لباس پہنتی تھیں اور نقاب نہیں اوڑھتی تھیں۔ وہ غیر مردوں سے مردانہ خود اعتمادی سے بے جھجک باتیں کرتی تھیں۔ ہمارے بزرگوں کو انگریزوں کے بچے بڑے خوبصورت لگتے تھے۔

پہلے پہل تو دیہاتوں کے لوگ ان سے بہت خوف زدہ تھے۔ ان کو دیکھ کر عورتیں اپنے بچے چھپالیتی تھیں۔ لیکن جلد ہی خوف حیرانی میں اور پھر مباحثوں میں بدل گیا کہ یہ انگریز لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ان کے خیالات ماضی کے فاتحوں سے مختلف تھے۔ وہ عجیب و غریب باتیں کرتے تھے مثلاً وہ ہر کسان سے پوچھتے تھے کہ اس کی کتنی زمین ہے۔ اس زمین کا وہ اسے مستقل مالک بنا دیتے تھے۔ اس ملکیت کے بدلے اسے ایک مقرر لگان دینا ہوتا تھا جو فصل اچھی نہ ہونے کی صورت میں معاف بھی ہو سکتا تھا۔ محافظوں اور کسی شان و شوکت کے بغیر وہ آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ معائنہ کرنے والے افسر آبادی کے باہر ہی اپنا تنبو گاڑ لیتے تھے اور کسی درخت کے نیچے اپنا دفتر جما لیتے تھے۔ وہاں ہر کس و ناکس ان سے مل سکتا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو آدمیوں کے ہمراہ وہ گھنٹوں کھیتوں کا معائنہ کرتے اور لوگوں سے باتیں کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر اچھی پنجابی جانتے تھے۔ کچھ تو بڑی اچھی پنجابی بول بھی لیتے تھے۔ ہم پنجابی ان کی عورتوں کو میم صاحب کہتے تھے۔ وہ بڑی آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں اور گاؤں کی عورتوں سے گھل مل جاتی تھیں۔ وہ ہر قسم کی معلومات اکٹھی کرتی رہتی تھیں۔ ہمارے رسم و رواج کے لئے افسروں اور ان کی بیگمات میں لا محدود تجسس تھا۔ ہمارے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے ہوئے وہ تھکتے نہیں تھے۔ ان کے لئے عادات و اطوار گو ہم سے بہت مختلف تھے لیکن ان کے دلوں میں ہمارے لئے ایک نرم گوشہ ضرور تھا۔ وہ لوگ نہ تو

جھگڑالو تھے اور نہ ہی وہ ہمیں بے عزت کرتے تھے۔ ان کا مزاج بھی چڑچڑا نہ تھا ان کا لباس اور ان کے طور اطوار ایسے فاتح لوگوں جیسے نہیں تھے جن سے پنجابیوں کو ماضی میں واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر یہ بھی جلد واضح ہو جاتا تھا کہ انگریزوں میں تحکم کی کوئی کمی نہیں۔

ہماری بزرگوں کی نسل انگریزوں کے اس طرز عمل سے بڑی متاثر تھی۔ انگریزوں سے پہلے کے افسران بھی گو بہت اچھے اور راست باز ہوتے تھے اور رعایا کا بھی خیال رکھتے تھے مگر حکومت کا مقصد رعایا کی فلاح و بہبود نہیں تھا جب تک کہ اس میں حکام کا کوئی اپنا ذاتی مفاد شامل نہ ہو۔ انگریزوں کی اس قسم کی کئی اور باتوں کے متعلق لوگ پہلے تو متجسس تھے لیکن بعد میں مطمئن ہو گئے۔

پنجابی اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ ان کا واسطہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے نہیں پڑا۔ سال ۱۸۵۷ء سے پہلے پنجاب پر ایک کمشن کی حکومت تھی جو لارنس کے تحت تھا۔ اس کے افسران کا مقصد تجارت کی بجائے ملک کی ترقی تھا۔ کمپنی کی حکومت کی بجائے پنجاب نے برطانوی حکومت سے آغاز کیا۔ ماضی پر آنسو بہانے کی بجائے حکومت نے نظم و نسق بحال کرنا شروع کیا۔ اس میں دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے خاندان نے بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ نئے نظام حکومت میں جدید نظام عدل' پولیس کا پہلی دفعہ قیام' زمین کے ریکارڈ محفوظ کرنے کا طریق کار' بنجر زمینوں کو آب پاشی کے ذریعے زرخیز زمینوں میں بدلنے کے لئے نہروں کا جال بچھانے کے منصوبے اور دوسری اصلاحات شامل تھیں۔ یوں پر امن اور خوشحال دیہاتوں کی بنیادیں رکھی گئیں۔ یہ ایک رعایا پرور حکومت تھی جس نے تعمیری کام کے بہت سے مواقع فراہم کئے۔ کچھ لوگوں کے لئے جو حسب گنجائش اور اہلیت اس کام میں حصہ لینا چاہتے تھے یہ انتہائی دل خوش کن نظام تھا۔

جب میں ابھی سکول میں تھا تو ہمارے نصاب میں تاریخ کی ایسی کتاب ہوا کرتی تھی جس میں تاریخ کو ہندو' مسلم اور برطانوی ادوار میں تقسیم کرنے کے بعد ایک باب "انگریزی راج کی برکتیں" کے عنوان سے شامل ہوتا تھا۔ اس میں برطانوی راج کی ایک درجن برکتوں کا ذکر تھا: نظم و نسق' سکول' ریلوے' تار برقی اور حفظان صحت وغیرہ۔ میری نسل کے لوگ تو ان کو معمول کی چیزیں سمجھتے تھے لیکن میرے والد بتاتے تھے کہ وہ بھی اگرچہ امن کے دنوں میں ہی پیدا ہوئے تھے مگر ان کے بزرگوں کے لئے امن کا قیام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سکھ حکومت کے خاتمے پر بنیادی حقوق اور جان و مال کا تحفظ جیسے تصورات اجنبی تھے۔ صرف اس نسل کے لوگ ہی محسوس کر سکتے تھے کہ برخواست شدہ یا سبکدوش سکھ سپاہیوں

کے گروہوں کی لوٹ مار سے بچنا کتنا سنگین مسئلہ تھا۔ ان کو جہانگیر کا کشمیر کا سفر بھی یاد آ جاتا تھا جس کے دوران بادشاہ کا دو لاکھ سپاہ اور کارندوں کا لشکر اس علاقے سے ٹڈی دل کی طرح گزر جاتا تھا اور اپنے پیچھے ایک سو میل لمبی بربادی کی ایک لکیر چھوڑ جاتا تھا جس میں کھانے کے لئے ایک دانہ بھی باقی نہیں بچتا تھا۔ پنجابی زبان میں ایسی ضرب الامثال کی کثرت ہے جن میں حکام کی سینہ زوری نظر آتی ہے مثلاً "ہمیشہ افسر کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے بچو"۔ لیکن اچانک ہی سکھ سپاہیوں نے لوٹ مار ترک کر دی۔ اس لئے کہ ان کو روزگار مل گیا اور انہوں نے لوٹ مار کرنا چھوڑ دیا۔ برطانوی سپاہی سادہ تھے۔ وہ مفت چیزیں نہیں اٹھاتے تھے ان کی پوری قیمت دیتے تھے۔ نصابی کتابوں میں درج انگریزی راج کی برکتوں کو ہماری نسل تو مذاق سمجھتی تھی لیکن میرے دادا والی نسل کے لئے یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ تھا۔ وہ نسل ان کی غیر مشروط تعریفیں کرتی تھی۔ میرے والد کی نسل بھی ان برکتوں کی معترف تھی۔

میرا خیال ہے کہ ہم پنجابیوں اور انگریزوں میں کوئی نہ کوئی چیز مشترک ضرور تھی جس کی بنا پر ہمارے تعلقات شروع سے ہی خوشگوار تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ہم کٹر نہیں تھے۔ نہ تو ہم جنوبی ہند کے برہمنوں کی طرح عزلت پسند تھے اور نہ ہی ہم میں ان جیسے الجھاؤ تھے۔ ہم نے انگریزوں کو برابری کی سطح پر قبول کیا۔ ہمارا معاشرہ ملنسار اور حالات کے مطابق ڈھل جانے والا تھا۔ اس معاشرے نے اپنی اندرونی ساخت کو قایم رکھتے ہوئے ہر تبدیلی کو خوش دلی سے قبول کیا۔ آثار کی کھدائیوں میں نظر آنے والی پرتوں کی طرح ہمارے معاشرے میں بھی مختلف پرت دکھائی دیتے ہیں جو مختلف تصادموں کی پیداوار ہیں۔ برطانوی اختلاط اتنا نرم اور خوبصورت تھا کہ حکومت کی اس تبدیلی اور اس سے مطابقت کے عمل سے پنجابی بڑے مطمئن ہوئے۔

مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ اقتدار نے جو اکثر و بیشتر تنگ خیال، تشدد اور متعصب تھا، ہندو ازم کے ظاہری خدوخال کو مٹا دیا اور جو باقی بچ گیا اس نے اندر کی طرف رخ کیا۔ یوں ہندو دھرم کٹر قسم کی رسومات کی بجائے صرف عقیدہ اور ایک خاص طرز زندگی بن کر رہ گیا۔ ہمارے نام، لباس، خوراک، زبان، علوم، اور شاید ہماری قانونی روش بھی مسلمانوں سے مستعار ہیں۔ ہمارے کھانا پکانے کے اکثر طریقے اسلامی ہیں۔ ہمارے نام سنسکرت اور فارسی، اور بعض اوقات یونانی زبانوں کا مرکب ہیں۔ ہمارے مردوں اور عورتوں کی شلوار قمیض اور برائے نام پردہ بھی مسلمانوں سے ہی مستعار ہے۔ میرے نام کا پہلا لفظ سنسکرت

ہے اور دوسرا لفظ "لال" فارسی ہے۔ کئی لڑکوں کا نام سکندر بھی تھا اور کئی دوسروں کا نام ولائتی تھا جس سے مراد غیر ملکی ہے۔ یہ انگریزوں کے مترادف ہے۔ بعد میں انگریزی سپاہیوں نے اس لفظ کو بگاڑ کر بلائٹی بنا لیا جس سے ان کی مراد انگلستان تھی۔ جو شخص بحث میں جیت جائے اسے ہماری زبان میں افلاطون کہتے ہیں اور جس کے لئے قانون اہم ہو وہ رانیکین کہلاتا ہے۔ یہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر رانیکین کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ایسے لین دین میں ہم نے ضرور کچھ کھویا ہو گا لیکن ہم نے پایا بہت کچھ۔ ہم میں اس منفعت کی صورت راستی اور حالات کے مطابق ڈھلنے کی اہلیت تھی۔ شاید یہی چیز انگریزوں کو پسند آئی۔ اسی بنا پر وہ اپنے تدریسی اور تعمیری کاموں سے لطف اندوز ہوئے اور ہمیں انہوں نے نئے علم اور ہنر سیکھنے کے لئے بڑا موزوں پایا۔

میرے دادا مایا داس ہمارے خاندان کے پہلے فرد تھے جنہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ وہ اپنے تینوں بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ پنجاب فتح ہونے سے پیشتر وہ ۱۸۴۰ء میں جہلم کے کنارے کالا سرائے میں پیدا ہوئے۔ وہ دھرم شالا میں چھوٹے سے سکول میں داخل ہوئے۔ اس سکول میں بچوں کو فارسی اور ابتدائی حساب سکھایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی زبان فارسی ہی تھی۔ سکول سے فراغت کے بعد انہیں محکمہ مال میں قانون گو کی چھوٹی سی ملازمت مل گئی۔ ان کی تنخواہ بڑی تھوڑی تھی۔ شاید بیس روپے ماہوار ہو گر ان کا واسطہ کسانوں سے تھا۔ سبزیاں، گھی، اور دوسری اجناس انہیں تحفے میں مل جاتی تھیں۔ اگر یہ تحفے تحائف خاص حدود میں رہیں تو کسان بھی ان کو برا نہیں سمجھتے تھے۔

شروع شروع میں ملازمتوں میں نظم و ضبط پیدا کرنے میں بڑی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ یہ فطری بھی تھیں اور دلچسپ بھی۔ انگریزوں کا ایک پہلو نظم و ضبط یعنی ڈسپلن تھا۔ ہمارے لوگوں، کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ان کے لئے یہ تصور نیا تھا۔ ہمارے دادا ایک شخص کی کہانی سنایا کرتے تھے جو محکمے میں بطور پٹواری بھرتی ہوا تھا۔ پٹواری کا کام بڑا آسان ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی خاص تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے چند رجسٹروں میں صرف زمینوں کا ریکارڈ رکھنا ہوتا ہے یا زمینوں کے انتقال درج کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں تمام ملازمتوں کی طرح اس میں بھی ڈسپلن ضروری سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات اس شخص کی سمجھ سے باہر تھی۔ اسے ایک روزنامچہ بھی رکھنا ہوتا تھا جس میں روزانہ کی کاروائی درج کی جاتی تھی۔ اس کو بتا دیا گیا تھا کہ اتوار کو چھٹی ہو گی اور اس دن

اسے کوئی سرکاری کام نہیں کرنا ہو گا۔ تہواروں پر بھی چھٹی ہوتی تھی لیکن اتوار کو جو اس کی نظر میں باقی دنوں ہی کی طرح کا ایک دن تھا' کام نہ کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب انگریز افسر معائنے کے لئے آیا تو اس نے دیکھا کہ اس شخص کی کارگزاری تو معمول سے بھی کم ہے۔ لیکن جس چیز نے اس افسر کو پریشان کیا وہ اس کے روزنامچے میں یہ اندارج تھا "آج اتوار منایا گیا۔" مال افسر نے محسوس کر لیا کہ ایک غلط آدمی کو ملازم رکھ لیا گیا ہے اور اسے فارغ کر دیا گیا۔ لیکن اس شخص کو ملازمت کے چلے جانے کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کیونکہ ان دنوں ضروریات بڑی تھوڑی تھیں اور کھانے پینے کی چیزوں کی افراط تھی۔ یوں بھی بغیر کام کے گاؤں میں رہنا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن جس چیز نے اسے پریشان رکھا وہ ایک عیسائی تہوار منانے کی (جو ایک طرح کی خوشامد تھی) داد نہ دینا تھا۔

میرے دادا کے اس رفیق کار کی برطرفی ہر شخص کے لئے ایک غیر معمولی بات تھی۔ تمام چیزوں کو ایک مخصوص تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ جنازہ' بیماری' شادی' کسی پڑوسی یا رشتے دار کی مدد کے لئے بلاوہ ایسے واقعات ہیں جن کو ہر کام پر ترجیح دینے کی ضرورت ہے خواہ ان کو پورا کرنے کے لئے کئی دنوں تک غیر حاضر ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ یہ لازمی فرائض ہیں جن کو ہر حالت میں پورا کرنا ضروری ہے۔ ان کے لئے ہر کام کو چھوڑ چھاڑ گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جانا پڑتا ہے۔ یہ بیچارہ شخص تو معاشرے کے رواج کے مطابق چل رہا تھا گو اس نے نئے قواعد سے فایدہ ضرور اٹھایا جن میں چھٹی کی اجازت تھی۔ چنانچہ اس لحاظ سے ملازمت سے برخواستگی ایک سزا تھی جس کا وہ مستحق نہیں تھا۔ وہ بیوہ خالہ کیا کہے گی اگر اس کے بچے کے لئے منڈن کی رسم پر وہ نہ گیا خصوصاً اس وقت جب وہ سرکار کا ملازم تھا اور اس لحاظ سے وہ صاحب حیثیت تھا اور اس کی موجودگی ضروری تھی اس لئے وہ چلا گیا لیکن روزنامچے میں اس امر کا واضح اندراج کرنا ایک غیر محتاط حرکت تھی۔

ماضی کی طرف دیکھنے پر لگتا ہے بدلتے ہوئے پیشہ ورانہ حالات اور اقتصادی تبدیلیوں کی بنا پر ڈسپلن کا معاشرے میں رفتہ رفتہ اور بتدریج ترقی کرنا ضروری ہے لیکن اسے اوپر سے نافذ کرنا ہمارے بزرگوں کے لئے بالکل ناقابل فہم تھا اور اسے صرف افسران بالا کا انوکھا پن ہی قرار دیا جا سکتا تھا۔ البتہ میرے والد کی نسل نے ڈسپلن کی تصور کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

میرے دادا اپنی جوانی میں ہی فوت ہو گئے۔ ادنے ملازم کے طور پر وہ ایک پیشے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہو گا۔ انہیں یہ بھی

احساس ہو گا کہ دھرم شالے کی تعلیم کافی نہیں۔ لوگ اب نئے سکولوں کی بات کر رہے تھے جہاں انگریزی زبان بھی پڑھائی جاتی تھی جو زندگی میں کامیابی کی کنجی تھی۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین لڑکے کو گجرات بھیج دیں جہاں نزدیک ترین سکول تھا۔ یہ سکول ہمارے گاؤں سے چالیس میل دور تھا۔ یہیں میرے والد' میرے چچا اور ہم سب بھائیوں نے تعلیم حاصل کی اور بعد میں پیشوں میں داخل ہوئے جن کا آغاز ہمارے دادا نے کیا تھا۔

میرے دادا کے بھائی ٹھاکرداس سال ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے جس کے بعد انگریزوں نے آخری جنگ گجرات میں لڑی۔ ہمیں علم ہے کہ اجداد کے نام پر بچوں کے نام رکھنے کا رواج ہمارے ہاں نہیں تھا۔ لیکن اس بڑے چچا کا نام ایک ایسے بزرگ کے نام پر رکھا گیا جو کم از کم چھ پشت پہلے ہو گزرا تھا۔ اس کی وجہ بھی بڑی عجیب تھی۔ جب میری پڑدادی حاملہ تھی تو اس نے خواب میں خاندان کے ایک بزرگ کو دیکھا جو اس پڑدادی کو کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے بطن سے نیا جنم لے رہا ہے۔ جب اس خاتون کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس بزرگ کے احترام میں اس کا نام ٹھاکرداس ہی رکھا گیا۔ ہردوار میں موجود اپنے خاندان کے ریکارڈ میں میں نے دیکھا کہ صرف یہی ایک نام دہرایا گیا ہے۔

ٹھاکرداس نے تعلیم حاصل کرنے کے اس موقعے سے بھرپور فایدہ اٹھایا۔ کھتری لڑکے کئی پشتوں سے ملازمتوں کے جائز حقوق سے محروم تھے۔ موقعہ ملنے پر وہ اب دل لگا کر پڑھتے تھے۔ میرے دادا نے خوب دل لگا کر پڑھا۔ خاندان میں وہ پہلا شخص تھا جس نے میٹرک پاس کیا۔ اس موقعے پر گاؤں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور جلد ہی انہیں بابو کا خطاب مل گیا۔ یہ خطاب یو۔ پی اور بنگال کے کلرکوں سے مخصوص تھا جنہیں ملازمت کے سلسلے میں انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابھی تک شاید ہی کوئی پنجابی ہو جس نے اتنی تعلیم حاصل کی ہو اور بابو کہلایا ہو۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ وہ انگریز ہیڈ ماسٹر کی نظروں میں آ گئے تھے۔ اسی نے انہیں اپنے سکول میں بطور ٹیچر بھرتی کر لیا۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۸۷۰ء کے قریب حکومت نئی نئی قایم شدہ عدالتوں میں قانون کے پیشے کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اسی ہیڈ ماسٹر کے اثر و رسوخ سے میرے دادا کے بھائی کو لاہور میں ایک سال کی قانون کی تربیت کی پیشکش ہوئی۔ ہمارے گاؤں والوں کے لئے یہ واقعہ بڑا حیرت انگیز تھا۔ شاید میرے یہ دادا گاؤں کے پہلے شخص تھے جس نے لاہور تک کا

سفر کیا۔ لیکن شہر میں ایک نئے نئے کالج میں تعلیم حاصل کرنا، بحث کرنا، ملزم کی صفائی پیش کرنا اور ایک انگریز جج کے سامنے جرح کرنا واقعی ایسی باتیں تھیں جن کے چرچے ہوں۔ اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ میرے اس دادا نے انگریزی سیکھ لی تھی اور اب وہ "گٹ مٹ" کر سکتے تھے۔ جب پنجابیوں نے پہلے پہلے انگریزی زبان سنی تو انہوں نے اس کا نام "گٹ مٹ" رکھ دیا۔ میرے دادا نے ایک سال بعد قانون کی تعلیم ختم کی اور بڑے فخر سے اپنے نام کا بورڈ لٹکا دیا۔ بورڈ کا فریم لکڑی کا تھا جس کے اندر دھات کی پلیٹ پر انگریزی زبان میں ایک قوس کی صورت میں اور اس کے نیچے سیدھی سطر میں اردو میں ان کا نام اور پیشہ لکھا ہوا تھا۔ پچاس سال بعد ہم مدھم پڑے ہوئے انگریزی الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس پر لکھا ہوا تھا لالہ ٹھاکر داس ٹنڈن، وکیل، گجرات۔

پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کا عمل اب تیزی سے جاری تھا۔ جلد ہی ایک کوچر کھتری نے بھی اپنا ایسا ہی بورڈ نصب کر دیا۔ اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو کالج میں تعلیم دلوا کر بڑی شہرت حاصل کی۔ ان میں سے سب سے بڑا پنجاب کا پہلا ہندوستانی جج بنا، دوسرا وکیل اور تیسرا ڈاکٹر جو فوج میں چلا گیا۔ اگر اس وقت یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی پوتی مہاراشٹر کے ایک فوجی افسر سے شادی کرے گی جو بعد میں ہندوستانی فوج کا چیف آف سٹاف بنے گا تو ہماری حیرانی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

جدت پسندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جب ہمارے دادا کی وکالت نے ترقی کی تو اس نے شہر کی فصیل کے باہر ایک دروازے کے سامنے نیا گھر بنا لیا۔ یہ پہلا مکان تھا جس میں انگریزی طرز کے بنگلے کی جھلک نظر آتی تھی۔ ابھی تک شہر کے اندر کے مکان دو منزلہ یا کبھی کبھی تین منزلہ ہوتے تھے۔ اندرون شہر جگہ محدود تھی اس لئے ایک منزلہ گھر خال خال ہی نظر آتے تھے۔ تین منزلوں سے اوپر گھر تعمیر ہی نہیں ہوتے تھے۔ چھت کے اوپر ایک یا دو کھلے کمرے ہوتے تھے تاکہ تازہ ہوا آ سکے اور برسات کے موسم میں بارش سے بچا جا سکے۔ امن و امان قائم ہو جانے پر لوگوں نے شہر کے باہر گھر بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ابھی تک لوگ سول سٹیشن کے قریب جانا پسند نہیں کرتے تھے جہاں انگریز بڑے بڑے بنگلوں میں رہتے تھے۔ وہ اپنے لوگوں سے بھی اتنا دور جانا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بھی جنگل میں۔ اور اگر صاحب لوگ اجازت دے بھی دیتے تو شہریوں میں اتنی دور جانے کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ شہر کی فصیل سے باہر نکلنا ہی پہلا قدم تھا۔

ہمارے دادا کے گھر کے ارد گرد ایک اونچی دیوار تھی۔ اس کے تین طرف تو کچھ نہ

تھا لیکن سڑک کے رخ دیوار میں محرابیں کرائے پر اٹھا دی جاتی تھیں۔ یوں ان سے آمدنی بھی ہوتی تھی اور گھر کی حفاظت بھی۔ چونکہ یہ گھر شہر کے دروازے کے سامنے تھا اس لئے جلد ہی یہاں تانگوں کا اڈا بھی بن گیا جہاں سے دو پہیوں والی گھوڑے گاڑیاں گجرات کے ریلوے سٹیشن، قریبی قصبوں، دیہاتوں اور کشمیر کو جاتی تھیں۔ بڑے دروازے کے بعد گھر میں ایک چوکور صحن تھا جس کے دو طرف کمرے اور دادا کے تانگے کے لئے ایک شیڈ اور اصطبل تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ایک سیدھی دیوار تھی۔ ان کمروں میں دادا کے منشی، ملازم، دور پار کے رشتے دار، ہمارے گاؤں کے لوگ جو شہر آتے جاتے تھے اور دادا کے موکل ٹھہرتے تھے۔ موکلوں کا اپنے وکیل کے ہاں ہی ٹھہرنے کا رواج تھا۔ کھانا وہ باہر کھاتے تھے۔ گھر میں سوتے اور آرام کرتے ہوئے موکل ایک وکیل کی کامیابی کا واضح اعلان تھا۔

صحن کے بائیں طرف جہاں سادی دیوار تھی، ایک اور دروازہ تھا جو گھر کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ اس دروازے کی ساتھ نیم تاریک سی ڈیوڑھی تھی۔ اس جگہ ایک باؤلی بھی تھی جہاں سے گھر کے لئے پانی لیا جاتا تھا۔ ڈیوڑھی کا دوسرا دروازہ گھر کے اندر کھلتا تھا۔ سودا سلف بیچنے والے صرف یہاں تک ہی آ سکتے تھے۔ گھر کے کمرے ایک مربعہ صحن کے اطراف بنے ہوئے تھے۔ داخلی دروازے کے عین سامنے رسوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مودی خانہ تھا۔ ان کے سامنے رہنے کے کمرے تھے۔ صحن کے دائیں طرف ایک دیوار تھی اور ایک لمبا کمرہ تھا۔ یہ دادا کا دفتر بھی تھا اور بیٹھک بھی۔ اس لمبے کمرے کا ایک اور دروازہ بھی تھا۔ اس کے سامنے راستہ تھا جس سے گھر میں اندر داخل ہوئے بغیر بیرونی صحن سے ہی ملاقاتی اور موکل آتے جاتے تھے اور دادا کے کمرے میں داخل ہو سکتے تھے۔ اس راستے کے دوسری طرف ایک باغیچہ تھا جس میں سنگترے اور آم کے درختوں کے علاوہ چنبیلی اور گلاب کے پھول بھی تھے۔ اپنی پوجا کے لئے دادی یہیں سے پھول لیا کرتی تھی۔ سنگتروں اور آموں والے باغ میں ہم بچوں کے لئے بڑی کشش تھی۔ لیکن گرے ہوئے پھلوں کے علاوہ ہمیں کسی دوسری چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر کے اندر باغ کا ہونا بہت بڑی بات تھی اور ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔ شہری لوگوں کے پھلوں کے باغ تو تھے لیکن وہ شہر سے کافی دور تھے اور باغوں سے زیادہ وہ کھیت نظر آتے تھے۔

گھر کی تعمیر میں قدیم طرز کی پتلی اینٹیں استعمال ہوئی تھیں۔ یہ موٹی انگریزی اینٹوں کی مقابلے میں ٹائیلوں سے زیادہ مشابہ تھیں۔ کچھ عرصے بعد ہی میرے دادا کے گھر جیسے گھر

بننے بند ہو گئے۔ جیسے ہی شہر کے اندر دباؤ بڑھا مضافات بننے شروع ہو گئے۔ جب لوگوں نے کچھ ہندوستانی افسروں کو سول لائنز میں رہتے دیکھا تو عام لوگوں کو بھی اس کے قرب و جوار میں انگریزی طرز کے گھر بنانے کا حوصلہ ہوا۔ کچھ تو شہر کے مضافات میں چلے گئے اور شہری گھروں کی طرح کے گھر تعمیر کر لئے۔ ان میں جدید لیکن بھدی قسم کے عناصر تھے۔ میرے دادا کی طرز کے گھر غیر مقبول ہو گئے۔

ہمارا گھر اندر سے کافی کشادہ تھا۔ اس کی چھتیں بڑی اونچی تھیں اور اس وجہ سے گھر اندر سے ٹھنڈا رہتا تھا لیکن سردیوں میں ٹھنڈے کمروں کو گرم کرنے کے لئے کوئیلوں کی انگیٹھی جلانا پڑتی تھی۔ گھر میں فرنیچر بڑا سادہ تھا۔ اس میں نواڑ سے بنی ہوئی چارپائیاں اور نواڑ ہی سے بنی ہوئی پیڑھیاں تھیں۔ ان سب کے پائیوں پر شوخ رنگ کیا ہوا تھا۔ شب خوابی کے بڑے کمرے میں ایک ایسی ہی پیڑھی تھی جس کا رنگ مدھم پڑ چکا تھا یہ رنگین رسیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی پشت بڑی اونچی تھی اور اس کی لکڑی پر بڑا آرائشی کام کیا ہوا تھا۔ اس میں شیشے بھی جڑے ہوئے تھے۔ یہ پیڑھی دوسری پنجابی دلہنوں کی طرح دادی اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ اس کے قریب ہی ڈیزائن دار بڑا پلنگ تھا جو میری دادا کی مسہری تھی۔ اس قسم کا فرنیچر گجرات اور سوراشٹر میں آج بھی نظر آتا ہے۔ ہمارے اپنے گھر میں ایک بہت پرانا پلنگ تھا جس پر ہمارے والد کی دادی اپنی شب عروسی کو سوئی تھی۔ باقی فرنیچر لوہے کے ٹرنک اور لکڑی کے صندوق تھے۔ ایک بہت بڑا ٹرنک بھی تھا جس میں ہماری دادی اپنا جہیز لائی تھی۔ اس میں کپڑے' چادریں' کمبل' شالیں' لحاف' تانبے کے برتن زیور اور پھلکاریاں تھیں۔

بیٹھک ایک شاندار کمرہ تھا۔ اسے پرانے طریقے سے سجایا گیا تھا۔ یہ ملاقات کا کمرہ' مطالعہ کا کمرہ اور دفتر بھی تھا۔ پورے فرش پر ایک سوتی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ بیٹھنے کے لئے چاندنی پر روئی کے گدے تھے اور ٹیک لگانے کے لئے گاؤ تکیے۔ گدوں کے قریب آم کی لکڑی سے بنی ہوئی چھوٹی ہشت پہلو تپائیاں تھیں جن پر ہاتھی دانت کا کام کیا ہوا تھا۔ قریب ہی پیتل کے اوگالدان تھے۔ دری کے ایک طرف ایک بڑا تخت (دیوان) تھا جہاں دادا بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی لمبی نے والا پیچوان حقہ ہوتا تھا۔ کمرے کا پورا تاثر' صفائی' سلیقہ اور پاکیزگی کا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جوتے باہر ہی اتار دیئے جاتے تھے۔

کمرے کی دیواروں میں محراب دار طاقچے تھے جن میں تختے لگے ہوئے تھے۔ ان

طاقچوں کے پٹ روز ووڈ سے مزین تھے اور کئی بغیر پٹوں کے تھے۔ دیواروں پر قلعی کی ہوئی تھی اور الماریوں کی دیواروں پر سبز رنگ تھا۔

بیٹھک کے شمالی حصے میں ایک شہ نشین تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ ذرا نیچی تھی۔ یہ اینٹوں سے بنا ہوا ایک پلیٹ فارم تھا جس پر دریاں' چاندنیاں اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کا یہ حصہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک جدید قسم کا گھومنے والا شیلف بھی تھا۔ اس میں دادا کی قانون کی کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ اسی حصے میں زمین پر بیٹھ کر لکھنے کے لئے ڈیسک بھی تھے جنکے سامنے کے حصے میں ذرا سی ڈھلوان بھی ہوتی تھی۔ ان پر مٹی کی دواتیں تھیں۔ ان میں دیسی سیاہی میں تر کر کے کپڑے کی چندیاں ڈالی جاتی تھیں۔ قلم سرکنڈوں کو تراش کر بنائے جاتے تھے۔ جدید قسم کے انگریزی قلم بھی تھے جو سیہ کے کانٹوں کے آگے انگریزی نب لگا کر بنائے جاتے تھے۔ سیاہی خشک کرنے کے لئے پیتل کے ریگ دان ہوتے تھے جن میں سے کاغذ پر ایک باریک ریت ڈال کر سیاہی خشک کی جاتی تھی۔

شہ نشین میں دیوار پر ایک قطار میں لٹکی ہوئی تصویریں تھیں جو قدرے آگے کو جھکی ہوئی تھیں۔ ہم بچوں کے لئے یہ تصویریں بڑی پر کشش تھیں۔ یہ ٹراونکور کے شاہی خاندان کے فرد روی ورما کی بنائی ہوئی تھیں۔ یہ شخص ہندوؤں کی مذہبی تصویریں بناتا تھا۔ ان میں ٹراونکو کے ہرے بھرے جنگل' پہاڑ اور ندیاں دکھائی جاتی تھیں جو خشک ملک کے پنجابیوں کے لئے اگرچہ اجنبی تھیں مگر تھیں بڑی خوبصورت اور پر کشش۔ تصویروں میں دکھائی جانے والی عورتیں جیسے سیتائیں' دمنتیاں' سرسوتیاں بڑی بڑی تھیں لیکن شمالی ہند کی عورتوں کی طرح بڑی متناسب' گوری اور بڑی خوبصورت عورتیں تھیں لیکن ان کا ماڈل کنانور کے ساحل کی بھورے رنگ والی تیا عورتیں تھیں۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اہم ترین مقام انگریزی تصویر کے ایک پرنٹ کو دیا گیا تھا جو روی ورما کی تصویروں کی طرح تقریباً نصف صدی تک مقبول رہی۔ اس میں زندگی سیڑھیوں کی صورت میں پیش کی گئی تھی۔ ہر سیڑھی دس سال ظاہر کرتی تھی۔ مقام عروج پر پہنچ کر یہ سیڑھیاں نیچے اترنا شروع کر دیتی تھیں اور موت پر ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ بچے کی پیدائش سے شروع ہوتی تھیں اور موت پر ختم ہو جاتی تھیں۔ دونوں موقعوں پر فرشتے دعائیں مانگتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

پہلی سیڑھی پر ایک بچے کو جھولے میں دکھایا گیا تھا۔ دوسری سیڑھی پر ریشمی بالوں والی

ایک لڑکی بیڈ مشن کھیلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جلدی ہی وہ بغیر داڑھی کے ایک نوجوان کے بازوؤں میں نیم رضامندی کی صورت میں دکھائی دیتی تھی۔ اگلی سیڑھی پر ایک داڑھی والا مرد اور پختگی کی طرف بڑھی ہوئی عورت اپنے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ سب سے اونچی سیڑھی پر سفید بالوں والا مرد اور سفید بالوں والی عورت ایک کنبے کے والدین کی صورت میں پیش کئے گئے تھے۔ اس کے بعد سیڑھیاں نیچے اترنا شروع کرتی تھیں۔ دونوں دادا دادی کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ضعیفی اور ناتوانی کو پہنچتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ عورت ایک فرشتے کے بازوؤں میں گرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ زندگی تھی جسے بدلتی علامتوں میں پیش کیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ حصے تو ہم لوگوں کے لئے ناشائستہ تھے جیسے ایک عورت کو مرد کی آغوش میں دکھانا مگر شکر ہے کہ وہ بوس و کنار میں مصروف نہیں تھے کیونکہ اس صورت میں گھر میں اس کی نمائش ناممکن تھی۔ اس تصویر کی بڑی تعریف ہوتی تھی۔ میرے دادا کے ملاقاتی اسے بہت پسند کرتے تھے۔

میرے بچپن کی یادوں میں ایک یاد میرے دادا کی ہے۔ اپنے سفید بالوں اور چورس داڑھی کے ساتھ وہ ایک قابل احترام شخصیت نظر آتے تھے۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیض، کریم رنگ کا سوتی یا بھورے رنگ کا اونی کوٹ، ڈھلی ڈھالی سفید پگڑی اور مضبوط پنجابی جوتا پہنتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ بڑے خوش خلقی، شائستگی اور روایتی شفقت سے پیش آتے تھے جو ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات تھی لیکن ہمیں اس پر ہنسی ضرور آتی. تھی کیونکہ اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ ملاقات کرنے والے بچوں کے ساتھ بڑے بزرگ ایسے پیش آتے تھے جیسے وہ بچے نہیں بلکہ بالغ لوگ ہوں۔ لیکن ہمارے دادا ہمیں لنگور اور بڑی دم والے بندر بھی کہتے تھے۔ یہ ایک تلمیح تھی جس سے مراد رامائن میں مذکور بندر ہنومان تھا جس نے راون کے ساتھ جنگ میں رام اور لکشمن کی مدد کی تھی۔ ہمیں اس تقابل سے خوشی ہوتی تھی کیونکہ رام لیلا کے مقامی کھیل میں ہم سب ہنومان کی فوج میں بندروں کا کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔

دادا اپنا کام صبح سویرے شروع کر دیتے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ جاتے تھے اور ان کا منشی ان موکلوں کو باری باری بلاتا تھا جن کے مقدموں کی اس دن عدالت میں ساعت مقرر ہوتی تھی۔ موکل ایک سادہ دیہاتی ہوتا تھا جو اپنے اوپر ہوئے ظلم کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا تھا اور اپنی بے گناہی اور اپنے مخالف کی خیانت یا دھوکے بازی کو بیان کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ خدا کے بعد اسے میرے دادا پر ہی بھروسہ ہے جس کے سامنے سچ سچ بیان

کر دینا ضروری ہے اور اسے یقین ہے کہ بالآخر انصاف ہی کا بول بالا ہو گا اور انصاف اس کے حق میں ہو گا۔ اس دوران دادا ضروری نکات لکھتے جاتے تھے اور اپنے منشی کو کہتے کہ وہ اس موکل کو سمجھا دے کہ وہ اپنے بیان میں صرف ضروری کوائف کا ہی ذکر کرے اور غیر ضروری باتیں نہ کرے۔

سردیوں میں صبح نو بجے تک کام کرنے کے بعد دادا کھانے کے لئے اندر چلے جاتے تھے۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اکٹھا ہوتا تھا۔ سردیوں میں وہ اندر والے صحن میں دھوپ میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ نوکروں سے کھانا پکوانے اور کھانا پیش کرنے کا ابھی رواج نہیں تھا۔ کھانا عموماً صحن ہی میں تیار ہوتا اور دادا چولہے کے قریب ہی بیٹھتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد صحن ہی میں یا اگر کام کو آخری شکل دینی ہوتی تو دفتر میں وہ حقے کے چند کش لیتے۔ تقریباً دس بجے کے قریب وہ پگڑی باندھ کر اور کوٹ اور جوتے پہن کر عدالت کو چلے جاتے تھے۔ ان کا تانگہ باہر انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ قانون کی ضروری کتابوں کے ساتھ وہ اور ان کا منشی تانگے میں بیٹھ جاتے تھے۔ تانگے والا پاؤں سے بجنے والی گھنٹی دباتا اور تانگہ غیر ضروری مگر مترنم آوازیں نکالتا ہوا روانہ ہو جاتا۔ سائیس بڑے فخر سے تانگہ چلاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں نجی تانگے چند ہی تھے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ عدالتوں میں کیا ہوتا ہے۔ وہاں بحث کیسے ہوتی ہے اور جج حضرات کیا کرتے ہیں۔ دادا شام کو چار بجے گھر لوٹتے تھے۔ کچھ مٹھائی یا پھل کھانے یا دودھ پینے یا گرمیوں میں باداموں اور پھلوں کا رس پینے کے بعد وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں لوگ ابھی چائے سے واقف نہیں تھے۔ چائے کو سینے کی تکلیفوں کے لئے بطور دوائی استعمال کیا جاتا تھا۔ دادا شام کو نئے مقدمات لیتے تھے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ پھر کام میں لگ جاتے تھے۔ اس وقت وہ قانون کی کتابیں دیکھتے یا صبح کے لئے مقدمات تیار کرتے تھے۔ گرمیوں میں عدالتیں صبح سات بجے شروع ہو جاتی تھیں۔ ان دنوں میں مقدمات کی تیاری کا کام رات کی خنکی میں اور علی الصبح کر لیتے تھے۔

ہر شام گرد آلود پکی اینٹوں کے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ دادا ایک موڑھے پر وہاں بیٹھ جاتے تھے۔ بعد میں موڑھے کی جگہ کپڑے والی انگریزی آرام کرسی نے لے لی۔ وہاں وہ حقہ پیتے تھے اور ملاقاتیں کرتے تھے۔ ان کے دوست احباب ملنے کے لئے یا گپ لگانے کے لئے، خبروں پر تبصرے کے لئے یا مشوروں کے لئے وہاں آ جاتے تھے۔ رشتے دار ملنے کے لئے اندرونی صحن میں چلے آتے تھے۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو ستر سال سے

اوپر تھے۔ وہ صاف ستھری پنجابی میں گفتگو کرتے تھے جس میں فارسی' اردو اور کبھی کبھی انگریزی کا کوئی لفظ شامل ہوتا تھا۔ گفتگو میں باشعور حکمت کے ساتھ ساتھ کئی پنجابی' فارسی یا اردو ضرب الامثال بھی شامل ہوتی تھیں۔ ہر شخص یہ توقع کرتا تھا کہ اپنی عمر کے لحاظ سے اور اپنے علم اور تجربے کی بنا پر وہ باوقار گفتگو کریں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اور پنجاب سے باہر جانے والے اشخاص میں وہ پہلے تھے جو انگریزوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کر سکتے تھے۔

ان امور نے اور ان کے ساتھ ان کی عمر نے قدرتی طور پر شہر اور ہندوؤں کی قیادت ان کے حوالے کر دی تھی۔

ان کی دلچسپیاں بھی بڑی متنوع تھیں۔ وہ پرانے سکے اکٹھے کرتے تھے اور یہ مشہور تھا کہ ان کے پاس کئی نادر سکے ہیں۔ یہ زمانہ تھا جب ہندوستانیوں کو ہابی کا کچھ شعور نہ تھا۔ خاص خاص موقعوں پر جب ان کی ملاقات ایسے شخص سے ہوتی جسے سکوں میں دلچسپی ہو تو ڈرائنگ روم کی مقفل الماریوں سے وہ سکوں کی تھیلیاں باہر نکالتے تھے۔ میرے چچا جو ایک دفعہ اس وقت موجود تھے بتاتے تھے کہ یہ ایک مخصوص رسم معلوم ہوتی تھی۔ میرے دادا ان سکوں کو کپڑے کی تھیلیوں میں رکھتے تھے جن کے منہ سوت کی ڈوریوں سے بند ہو جاتے تھے۔ ان تھیلیوں سے ایک وقت میں وہ صرف ایک ہی سکہ باہر نکالتے تھے۔ میرے یہی چچا کہتے تھے کہ میرے دادا اپنے ملاقاتی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہی چچا دادا کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ ہمارے خاندان میں صرف وہی ایک فرد تھے جنہوں نے بزرگوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی۔ بعد میں وہ ہمارے دادا سے الگ ہو گئے جو تقریباً ارتداد کے مترادف تھا۔ میرے دادا کی دوسری دلچسپی اپنے خاندان کی تاریخ تھی۔ اس مقصد کے لئے دریائے جہلم کے کنارے انہوں نے بہت تحقیق کی تھی۔ وہ اپنی چھٹیاں اکثر ہردوار میں پانڈوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ وہاں وہ خاندان کی دستاویزات کا مطالعہ کرتے تھے۔ جب میں ۱۹۵۰ء میں پہلی دفعہ ہردوار گیا تو معلوم ہوا کہ پانڈوں کو لالہ ٹھاکر داس کی تحقیق کا علم تھا۔ مجھے معلوم نہیں اس ریکارڈ کا کیا بنا جس پر انہوں نے اتنا وقت اور اتنا پیسہ خرچ کیا تھا۔

وفات کے وقت ان کی عمر اسی برسوں سے اوپر ہو گی۔ آخری وقت وہ بھمبر جانے والی سڑک پر صبح اور شام کی سیر کے لئے بلا ناغہ نکلتے تھے۔ سردیوں کے دنوں میں صبح کے وقت اپنے بھورے رنگ کے کوٹ اور شال میں لپٹے ہوئے اس راستے پر نکل جاتے جس کے

ساتھ بغیر پتوں کے شیشم کے درخت خاموش کھڑے رہتے تھے۔ درختوں کے اوپر سے صبح کی روشنی میں میدانی علاقوں کی نیلاہٹ کے مقابلے میں ہمالیہ کی پہلی قطار کی چوٹیاں گہری گلابی رنگ کی نظر آتیں۔ شام کے وقت روانہ ہوتے تو وہ پھر ان کو دیکھتے۔ اس وقت وہ شمالی ہند میں سردیوں کے دوران میدانوں کے گہرے ارغوانی رنگ کے مقابلے میں ہلکے ارغوانی رنگ میں بدل چکی ہوتیں۔ گرمیوں میں سوائے ان دنوں کے جب بارشیں آتیں تھیں اور ہوا گرد سے صاف ہو جاتی تھی' گرد کی وجہ سے پہاڑ نظروں سے اوجھل ہوتے تھے۔ سیر کے دوران کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ کا مقصد ایسے امور پر مشورہ کرنا ہوتا تھا جن کا ذکر شام کے وقت دوسرے لوگوں کی موجودگی میں وہ نہیں کر سکتے تھے یا خاندانی جھگڑے کی اطلاع کرنے میں پہل کرنی ہوتی تھی۔

انہیں اپنی زندگی اچھی لگتی تھی جو بری بھی تھی اور ہنگامے سے پر بھی۔ وہ نسل اس پل کا پہلا پاٹ تھا جس کی تعمیر ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی۔ میرے والد والی پشت دوسرا پاٹ تھا اور میرے ساتھ تیسرا پاٹ شروع ہوا۔ میرے پردادا انگریزی راج کے شروع ہونے سے سات سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور میرے دادا نے اس کے خاتمے سے سات سال بعد وفات پائی۔

دوسرا باب

میرے والد ۱۸۷۱ء میں جہلم سے تین میل دور سرائے کالا میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ صرف بارہ سال کے تھے جب ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ وہ چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ عام یتیمی کے حالات میں تو وہ گاؤں میں ہی رہ رہے ہوتے لیکن کندھوں پر گھر کی ذمے داریاں آتے سے وہ سنبھل گئے۔ اس معاملے میں ایک پرانا قرضہ ابھی باقی تھا۔ ایسے ہی حالات میں میرے دادا نے میرے چچا کو تعلیم دلوائی تھی۔ اب ان کی باری تھی کہ وہ میرے والد کو تعلیم دلوائیں۔ اپنی باری پر میرے والد نے اپنے تینوں بھائیوں کو تعلیم دلوا کر یہ قرض اتار دیا۔

میرے والد اپنے چچا کے ہاں گجرات چلے گئے جہاں انہیں سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ مختلف ضلعوں کے صدر مقامات پر ہائی اور چھوٹے شہروں میں مڈل اور قصبوں میں پرائمری سکول کھل چکے تھے۔ اسی زمانے میں پروٹسٹنٹ مشن نے بھی پنجاب میں سکول کھولنے شروع کر دیے تھے۔ وہ مشہور بھی بہت تھے۔ میرے والد کے زمانے میں اکثر ہیڈ ماسٹر انگریز ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے نصاب مرتب کرتے "کتابوں کے ترجمے کرتے اور نئی کتابیں لکھنے میں ہراول دستے کا کام کیا۔ میرے والد اپنے ہیڈ ماسٹر کی بڑی تعریف کرتے تھے جس نے اپنے گھر سے دور بڑی تھوڑی تنخواہ پر سخت محنت سے کام کیا ہوگا۔ ایسی ہی تعریف وہ ان دوسرے انگریزوں کی بھی کرتے تھے جن سے سکول "کالج یا ملازمت کے دوران ان کا واسطہ رہا تھا۔ کچھ تو حالات سے مجبور ہو کر وہ ایسی جگہوں پر پڑے تھے کیوں کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے اور اگر ایسا نہ بھی کرتے تو وہ کہیں اور جا بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن اسے دوسرے زاویۂ نظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان انگریزوں کا طرزِ عمل نا امید جلاوطنوں کا بھی ہو سکتا تھا اور وہ صرف اتنا کام ہی کرتے جس سے ان کی گزر بسر ہو جاتی مگر میرے والد ان کی تعریف اس وجہ سے کرتے تھے ان میں سے کئی واقعی ہندوستان سے محبت کرتے تھے اور ان کی جڑیں بڑی دور تک اس سرزمین میں اتر چکی تھیں۔ ان جڑوں سے نئی شاخیں پھوٹیں جو میرے والد کے زمانے میں تناور درخت بنے۔

کئی انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر جا سکتے تھے لیکن اپنی مرضی سے ہی وہ اس ملک کے کئی گمنام کونوں میں پڑے رہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ٹیلر کی مثال بڑی خوبصورت ہے۔ اس شخص نے کامیاب فوجی ملازمت چھوڑ کر گجرات شہر سے دس میل دور ایک قصبے جلال پور جٹاں میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں اس نے آنکھوں کی جراحی کا کام شروع کیا۔ گجرات جیسے شہر میں اسے بہتر سہولتیں اور اپنے ہم وطنوں کی صحبت بھی میسر آ سکتی تھی مگر اس نے گجرات میں رہنا صرف اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ وہاں پہلے ہی ایک ہسپتال موجود تھا اور دیہات میں وہ زیادہ مفید کام کر سکتا تھا۔ اس نے خلق خدا کی خدمت اور مہارت سے بڑا نام پیدا کیا۔ گجرات کے علاوہ سو سو میل دور قصبات سے بھی لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ وہ ایک داستان بن گیا تھا۔ وہ موتیے کا سپیشلسٹ تھا۔ معمولی جراحت سے وہ مریض کی نظر بحال کر دیتا تھا۔ پھر ایک مس براؤن تھی جس نے لدھیانے میں زنانہ ہسپتال قائم کیا جو میرے خیال میں بعد میں پہلا زنانہ میڈیکل سکول بنا۔

اپنے چچا کے گھر میرے والد کا رہنا بڑا مشکل تھا۔ خاندانی ذمہ داریوں کی تنظیم کے تحت غریب رشتے داروں خصوصاً چھوٹی عمر کے لوگوں کا خیال تو رکھا جاتا تھا مگر ان کا وجود مشکل سے ہی برداشت کیا جاتا تھا۔ روزانہ انہیں ان کی محتاجی کا طعنہ ملتا تھا۔ اس کام میں عورتیں پیش پیش تھیں۔ مرد لاتعلق تھے اور ان بچوں کو اپنے بچوں جیسی شفقت نہیں دے سکتے تھے۔ جب تک میرے والد اپنے چچا کی چلم ٹھیک ٹھیک بھرتے تھے ان کے چچا ان سے مشفقانہ لاتعلقی سے پیش آتے تھے۔ حقہ بھرنے کے ذلیل کام کی وجہ سے میرے والد کو زندگی بھر تمباکو سے نفرت رہی۔ مگر والد کی چچی اپنے میاں سے دو قدم آگے تھی۔ سکول کے علاوہ وہ سارا سارا دن میرے والد کو سودا سلف لانے میں مصروف رکھتی اور ساتھ ہی قدم قدم پر وہ ان کی محتاجی کا طعنہ بھی دیتی تھی۔

زندگی میں کامیابی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کے بعد ہمارے بچپن میں جب ہمارے والد ہمیں اپنے چچی کے پاس لے جاتے تھے تو وہ خاتون ہمیں بتایا کرتی تھیں کہ انہوں نے ہمارے والد کا کتنا خیال رکھا اور ان پر کس حد تک اپنی شفقت اور محبت نچھاور کی کہ ان کے اپنے بچے بھی ہمارے والد سے حسد کرنے لگتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑی آبدیدہ ہو کر پوچھتی تھیں کہ کیا ہماری والدہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی محبت بھرا سلوک کرتی ہیں جیسے وہ ہمارے والد کے ساتھ کرتی تھیں۔ اپنے والد کے متعلق ایسے مشفقانہ کلمات سے ہمارے دل بھر آتے تھے اور ہم ان کے خلاف تھوڑا سا حسد بھی محسوس کرنے لگتے تھے

کیونکہ ہمیں اپنی وہ خواہشات یاد آ جاتی تھیں جو ابھی پوری نہ ہوئی تھیں اور ہماری چچی نے اپنے بچوں کو محروم رکھ کر اس یتیم بچے کی ہر خواہش پوری کی تھی۔ بڑے ہونے پر ہی اصل صورت حال سامنے آئی اور ہمیں اس کا مزاحیہ پہلو نظر آیا۔ لیکن ہماری والدہ نے اس مزاح کے پہلو کو کبھی سامنے نہیں رکھا۔ وہ اس معاملے میں بڑی سنجیدہ تھیں۔ بہو ہونے کے ناتے وہ اپنی زبان کھول نہیں سکتی تھیں گھر جا کر وہ بڑی برہم رہتیں۔ میرے والد نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

تعلیم حاصل کرنے میں میرے والد بڑے کامیاب تھے۔ اپنی چچی کے کاموں کے باوجود جب بھی انہیں وقت ملتا وہ دل لگا کر پڑھتے تھے۔ یہ محنت کرنے کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ایسی کہانیاں بھی تھیں جہاں پڑھائی کے لئے اپنے آپ کو اذیتیں دی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ مشہور تھا کہ نیند سے بچنے کے لئے طالب علم اپنے سر کی چوٹی کو رسی میں گرہ دے کر چھت سے باندھ دیتے تھے تاکہ اگر اونگھ آئے تو رسی سے جھٹکا لگنے سے ان کی نیند کھل جائے۔ وہ آنکھوں میں کڑوا تیل بھی ڈال لیتے تھے۔ اس سے آنکھیں تو جل اٹھتی تھیں مگر نیند بھاگ جاتی تھی۔ نیند سے بچنے کے لئے سردیوں کی راتوں میں وہ اپنے گرم لحاف اور بند کمرے سے نکل کر یخ بستہ ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے تھے اور صبح ہونے تک اپنی پڑھائی میں جٹے رہتے تھے۔ وہ جاگتے رہنے کے لئے سخت قسم کی ورزشیں کرتے تھے۔ تعلیم تقریباً مفت تھی اور نتائج روشن اور خوش آئند۔

ممکن ہے کہ گجرات کے گورنمنٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے شاید سوچا ہو کہ اس قسم کی محنت طالب علموں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے لیکن نتائج شاید اسے مطمئن کر دیتے ہوں۔ اس کی وجہ شاید ان کی سادہ لگن اور علم کا شوق ہوں۔ طالب علموں نے ایک مثل بنائی ہوئی تھی کہ کتابیں گھوٹ کر پی جاؤ کیونکہ اسی طریقے سے ان کے علم میں اضافہ بھی ہو گا اور وہ ان کا جزو بدن بھی بن جائے گا۔ سوچنے کی بات یہ تھی وہ کونسی چیز تھی جس نے اس ہیڈ ماسٹر جیسے لوگوں کو ان کاموں میں مگن رکھا۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اپنے کام سے پیدا کئے ہوئے ہمارے ردعمل سے وہ متاثر ہوتے ہوں گے ۔ مگر لوگوں میں بھی علم کی طلب بہت زیادہ تھی اور ان کی لگن کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہندوستان میں محنت اور پرخلوص خدمت جلد ہی انسان کو سنتوں کے مقام پر پہنچا دیتی ہیں۔ یہ مقام عطا نہیں کیا جاتا اور نہ ہی رسمی اعلانوں سے کوئی سنت بنا ہے۔ ایسا تو صرف عوام کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ پنجاب میں تعلیم کے شعبے سے متعلق اور خدمت خلق میں مصروف کچھ لوگوں نے یہ مقام

حاصل کر لیا ہے۔

میرے والد ہمیں اپنی طالب علمی کی مثال دیا کرتے تھے۔ یہ یاد ماضی نہیں تھی کیونکہ ان کی نسل کے لوگوں نے زندگی بھر سخت محنت اور لگن سے کام کیا تھا۔ تعلیم اور زندگی میں آگے بڑھنے کے بیسیوں مواقع تھے اور وہ ان لوگوں کے لئے بھی کھلے تھے جنہوں نے کبھی ان کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ چنانچہ ان کی کشت ویران قابل اور بااصول لوگوں کی مشقت سے گل و گلزار ہو گئی۔ کتنی نسلوں سے پنجابی کھتریوں کو انتظامی معاملات میں حصہ لینے سے محروم رکھا گیا تھا۔ اب اچانک ہی ان پر زندگی کے دروازے کھل گئے تھے اور ہر کوئی ان میں داخل ہو سکتا تھا۔ کھتریوں اور کئی دوسری ذاتوں نے ایسے موقعوں سے بھرپور فایدہ اٹھایا۔ دوسرے کھتریوں کے علاوہ' کھنے' کپور' چوپڑے' ملہوترے' ساہنی' دھون' نگواڑ اور پوری اور اروڑوں میں بترے' کمار' اور پوری ذاتوں کے لوگ جلد ہی پنجاب گورنمنٹ کی سول لسٹ' فوج کی میڈیکل سروس جو اہل ہند کے لئے فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے کھلی' اور وکیلوں' بیرسٹروں' ڈاکٹروں' سائنس دانوں اور پروفیسروں جیسے پیشوں پر چھا گئے۔ ان میں سے بہت سے ادنیٰ مقام سے اٹھے اور اپنے آپ کو خود تعلیم سے آراستہ کر کے اعلیٰ مقامات پر پہنچے۔ تقریباً پچاس سال ہوئے محکمہ مال میں بطور بستہ بردار کے بھرتی ہونے والا ایک شخص ان چند ہندوستانیوں میں سے تھا جو ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک پہنچے۔ ان میں سے کچھ لوگ بہتر مواقع اور زیادہ ذمہ داریوں کی تلاش میں ممنوعہ کالے پانیوں کے پار جزائر ماریشش' فجی' ملایا' برما اور ایسٹ افریقہ تک جا پہنچے۔ کئی نوجوان منشی تھے جو نوجوانوں پر وبیشتر انگریز افسروں کو اردو اور پنجابی پڑھاتے تھے اور پنجاب کے رسم و رواج بتانے پر مامور تھے تاکہ انگریز افسر ملازمت کا امتحان آسانی سے پاس کر سکیں۔ ان منشیوں نے اپنے بل بوتے پر بڑی محنت سے تعلیم حاصل کی۔ جب ان کے شاگرد انگریز افسروں پر اپنے ان استادوں (منشیوں) کی اہلیت ثابت ہو گئی تو ان انگریز افسروں نے بھی ایسے لوگوں کی مدد کی اور وہ منشی بھی اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔

گجرات سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے والد دیانند اینگلو ویدک کالج میں داخلہ لینے کے لئے لاہور چلے گئے لیکن کالج میں اپنی پڑھائی کے دوران ہی انہوں نے روڑکی کے انجنیرنگ کالج میں داخلہ لینے کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کالج رایل انجنیرز نے ۱۸۴۴ء میں قایم کیا تھا اور وہ ہی اس کو چلاتے تھے۔ پنجاب میں بندوبست اراضی کے بعد حکومت نے چند انگریزوں اور ہندوستانیوں کو بھی اس کالج میں

تربیت دینی شروع کر دی تاکہ نئے نئے قایم شدہ محکمہ پبلک ورکس کو تربیت یافتہ انجنیر دستیاب ہو سکیں۔ اس محکمے کے تحت عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر اور آب پاشی کی نہریں شامل تھیں۔ پنجاب اور مغربی یو پی میں نہری سلسلہ اتنا پھیلا کہ جلد ہی اس کالج کو صرف سول انجنیرز کے لئے مختص کر دیا گیا۔

رڑکی کے ٹامسن انجنیرنگ کالج کا عملہ انتہائی قابل استادوں پر مشتمل تھا۔ داخلہ صرف مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا تھا۔ چنانچہ طالب علموں کی تعداد محدود ہوتی تھی اور جو بھی اس امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا اس کی آئندہ ملازمت یقینی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ رڑکی میں داخلہ ایک ایسا انعام تھا جس کو حاصل کرنا کچھ لوگوں کی زبردست خواہش تھی۔ اپنے چچا کو بتائے بغیر میرے والد رڑکی کے لئے روانہ ہو گئے کیونکہ وہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتے تھے۔ ان کا داخلہ صرف ایک نمبر کی کمی سے رہ گیا۔ ناامیدی کے باوجود وہ کالج کے پرنسپل تک پہنچے اور اسے صرف ایک اور طالب علم کو داخل کرنے کی درخواست کی۔ ایک سادہ دیہاتی لڑکے کی اس تجویز پر پرنسپل کو کسی حد تک اچنبہ ضرور ہوا ہو گا لیکن میرے والد نے محسوس کیا کہ وہ ناراض نہیں ہوا۔ پرنسپل نے میرے والد کو دوسرے دن آنے کو کہا۔ قسمت نے یاوری کی اور ایک لڑکے نے داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ خالی جگہ میرے والد کو مل گئی۔ ان کے چچا کو اس بات پر بڑی خوشی ہوئی اور وہ دو سال تک میرے والد کے اخراجات اٹھانے پر رضامند ہو گئے۔ ان دنوں یہ انتہائی مہنگی تعلیم تھی۔ اس کے اخراجات تیس روپے ماہوار تھے۔

کبھی کبھی روڑکی میں اپنے قیام کو میرے والد ایک خواب کی طرح بیان کرتے تھے۔ گو کسی انجنیر کو انہوں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا لیکن ان کو پتہ تھا کہ وہ دو سال میں انتہائی پسندیدہ سرکاری ملازمت میں بطور انجنیر شامل ہو جائیں گے۔ ان کی تنخواہ مقرر ہو گی اور اتنی ہو گی کہ انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا کریں گے۔ ایسے خیالات نے انہیں اور محنت کرنے کی ترغیب دی۔ اتنی محنت انہوں نے کبھی نہیں کی تھی۔ تعلیم کا اختتام قریب نظر آتا تھا اور اس کا حاصل ان کی مٹھی میں تھا۔ ان کا محتاجی کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ گجرات میں اپنے گاؤں میں وہ بڑی نمایاں حیثیت سے جائیں گے یعنی گاؤں کا پہلا انجنیر اور ضلع گجرات کا دوسرا۔ ان کے فخر و انبساط کا تصور کرنا مشکل ہے۔ کم از کم میری زندگی میں فخر و انبساط کا ایسا کوئی لمحہ نہیں جس کا موازنہ میں ان کی زندگی میں اس لمحے سے کر سکوں۔ اگرچہ میری ملازمت میں سرکاری شان و شوکت نہیں تھی تاہم میرا ایک انگریز

تجارتی فرم میں شامل ہونا شاید اتنا ہی انوکھا اور اہم ہو جتنا کہ میرے والد کا انجنیئر بنا۔
میرے والد نے ۱۸۹۸ء میں تعلیم مکمل کر لی اور پنجاب کے محکمہ انہار میں بطور انجنیئر شامل ہو گئے۔ ان کے چچا کا سر بجا طور پر فخر سے بلند ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کا قرض چکا دیا تھا۔ میری تائی کا خیال تھا کہ میرے والد کی کامیابی میں ان کی محبت اور شفقت کو بڑا دخل تھا۔

جب میرے والد نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تو ہمارے ذات پات کے نظام کی طرح سرکاری ملازمت کے قوانین بھی بڑی واضح تھے۔ انہیں سب جانتے تھے اور قبول کرتے تھے۔ قدرتی قوانین کی طرح انہیں بھی قبول عام حاصل تھا۔ ہندوؤں کی ذات پات کی طرح سرکاری ملازمت میں بھی تین طبقے یعنی گریڈ تھے اور ان میں داخلہ بھی ذات پات کے نظام کی طرح پیدائش کی بناء پر پہلے ہی سے تعین ہو جاتا تھا۔ سب سے اونچا گریڈ انگلستان میں پیدا ہونے والے انگریزوں کا تھا۔ دوسرے گریڈ میں ہندوستان میں پیدا ہونے والے انگریز اور مخلوط النسل یعنی اینگلو انڈین داخل ہو سکتے تھے۔ سب سے کم تر گریڈ ذات پات کے لحاظ کے بغیر ہندوستانیوں کا تھا۔ ہم لوگ تو انگلستان میں پیدا ہونے والے اور ہندوستان میں پیدا ہونے والے انگریزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں دونوں ہی ایک جیسے لگتے تھے۔ دونوں کا رنگ سرخ تھا۔ ہمارے لئے ان دونوں کے درمیان فرق انتہائی مشکل کام تھا۔ ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے تھے کہ انگلستان میں پیدا ہونے والے انگریز شاید اعلیٰ خاندان کے ہوں اور ہندوستان میں پیدا ہونے والے انگریزوں کی نسبت ان کی تعلیم بھی اعلیٰ درجے کی ہو اور اس لئے وہ اعلیٰ ترین گریڈ کے مستحق تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مقامی انگریز بھی انگلستان ہی کو اپنا وطن مالوف سمجھتے تھے اور وہ بھی اسے "ہوم" ہی کہتے تھے۔

ہمارے والد کی نسل نے اس تفریق کو بلا چون و چرا قبول کر لیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں: اول، تقدم انگریزوں کے ہاتھ میں تھا جو ملک کو ترقی کی طرف لے جا رہے تھے اور سرکاری ملازمتوں میں ایک تنظیم پیدا کر رہے تھے۔ چونکہ وہ لیڈر تھے اور ہندوستانیوں کو نئے علوم سکھا رہے تھے اس لئے اعلیٰ ترین گریڈوں اور مراعات پر ان کا اولین حق تھا۔ استاد اور بزرگ کا احترام ہمارا شیوہ ہے۔ اس پرائمری سکول میں جہاں میرے والد نے داخلہ لیا تھا، طالب علم اپنے استاد کے گھر میں جھاڑو لگاتے تھے، پانی بھرتے تھے، لکڑیاں کاٹتے تھے اور دودھ، دہی، سبزی، ترکاری، اناج اور پھل اپنے استاد کے لئے بطور نذرانہ

لاتے تھے۔ حقیقت یہ کہ استاد کا حق اجناس اور خدمت کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ سکولوں میں فیس ادا کرنے کے رواج کے بعد بھی کافی دیر تک نذرانے اور تحفوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے والد بھی دودھ دہی کے ساتھ انگریزی اخبار جو صرف ہمارے گھر میں آتا تھا، اپنے استاد کے لئے لے کر جاتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کی اعلیٰ گریڈ میں تعیناتی کھلے دل سے قبول کی جاتی تھی۔ جب صورت حال تبدیل ہوئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو پڑھانا شروع کر دیا تو انگریزوں کے حقوق پر اعتراضات ہونے لگے لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرے والد کی ملازمت کے آغاز کے وقت اس صورت حال کو بلا کسی اعتراض کے قبول کیا جاتا تھا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جب وہ ہندوستانیوں کو سکھانے پڑھانے میں مصروف تھے انگریزوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ مستقبل میں جب ان کے شاگرد ان سے پڑھ لکھ جائیں گے تو وہ برابری کا تقاضا کریں گے یا شاید انہیں یہ خیال ہو کہ ایسی نوبت کبھی آئے گی ہی نہیں اور وہ ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت جاری رکھیں گے یعنی ایک قسم کا دوام جہاں ان کے زیر سرپرستی شخص خود کو اپنا امین یا متولی کبھی نہیں بنا سکے گا۔ دراصل یہ عمل قدرتی طور پر جاری رہا مگر جھٹکوں کے ساتھ اور بلندی کی طرف۔ تبدیلی کی ہر منزل پر ایک جھٹکا لگتا تھا، کچھ تاخیر ہوتی تھی اور کچھ محرومی، لیکن جلد ہی کوئی نہ کوئی رکاوٹ کو عبور کر کے اختیار اور ذمہ داریوں کے اعلیٰ منازل کی طرف رواں ہو جاتا تھا۔ میرے والد نے ملازمت نچلے گریڈ سے شروع کی اور بڑی محنت اور مشقت کے بعد اپنے نروان کی منزل تک پہنچے۔ اس نروان کو امپیریل سروس آف انجنیئرز کہتے تھے۔

بچپن سے ہی مصیبتوں نے ------ یتیمی، محتاجی، پیشے میں داخلے کے لئے شدید محنت اور اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی تھکن ------ میرے والد کو ایک خاموش اور مستقل مزاج اور کم سخن بنا دیا تھا۔ اپنے کام میں کمال پرستی کی حد تک وہ باریک بین اور بااصول تھے۔ اپنی تعلیم کے آغاز سے ہی جب وہ ڈرائنگ بورڈ پر بیٹھتے تھے، ان میں وہ جذبہ موجود تھا جو انہیں اپنے کام میں خوب سے خوب تر کی طرف جانے کے لئے مجبور کرتا تھا۔ ان کے کئے ہوئے بہترین حسابات، نقشے اور اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونے کا جذبہ، یہ سب اعلیٰ ترین مراحل پر پہنچ کر بھی کبھی ان کے اطمینان کا باعث نہیں بنے۔ انہیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی بہتر سے بہتر کارکردگی کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ زندگی میں ان کا لطف اندوزی کا ذریعہ صرف کام تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کام کے علاوہ وہ کبھی کسی اور چیز سے لطف

انددز ہوئے ہوں۔ شاید وہ صرف کام کرنا ہی جانتے تھے اور یہ وہ بڑے احسن طریقے سے کرتے تھے۔ ان کے بیشتر رفقائے کار جنہیں میں جانتا تھا' ویسے ہی تھے۔ وہ سب اپنے کام کے لئے زندہ تھے اور باتیں بھی کام ہی کے متعلق کرتے تھے گو وہ انگریز کے کام اور آرام کو اکٹھا کرنے کی اہلیت پر شک ضرور کرتے تھے۔ میرے والد جنہوں نے کام کے دوران کبھی آرام نہیں کیا یہ جواز پیش کرتے تھے کہ اگر انگریز کوئی غلطی کرتا تھا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس کی وضاحت کر لیتے تھے اور انہیں خیال تھا کہ کبھی کبھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب کوئی ہندوستانی غلطی کرتا تھا تو ایک ہمدرد افسر کا ردعمل بھی یہی ہوتا کہ اس شخص میں مشکل کام کرنے کی اہلیت کی کمی ہے۔ آخر ہندوستانیوں میں تجربے اور مہارت کی کمی تو ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو کوئی ذمہ داری دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے اور اس کے کام کی نگرانی مزید کڑی کرنی چاہئے۔ نیک نیت پر مبنی ایسے ریمارکس خواہ ان میں غفلت شعاری کا الزام مفقود ہی کیوں نہ ہو' بڑی تکلیف کا باعث بنتے تھے۔ ان حالات میں وہ ایک مسلسل امتحان کی کیفیت سے دوچار رہتے تھے۔ اس بنا پر وہ اپنے طرز عمل میں مزید باضابطہ اور مزید بااصول ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ لگاتار کام کرتے رہے اور انہوں نے اپنی پہلی چھٹی اپنی ملازمت کے اٹھائیس سال پورا ہونے پر لی۔ موت یا شادی بیاہ کے لئے اتفاقیہ چھٹی انہوں نے ضرور لی لیکن پینتیس سال کی ملازمت میں آرام اور فراغت کے لئے انہوں نے چھٹی صرف ایک ہی دفعہ لی۔ ان چھ ماہ کی چھٹیوں میں وہ اور میں سیر و سیاحت کے لئے کشمیر چلے گئے۔ وہاں ہم نے پیدل سیاحت کی' کشتی رانی کی اور پہاڑوں پر چڑھے۔ اس دوران کام کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہاں ہم نے پڑ دادا کی روایت جاری رکھی اور متن میں اپنے خاندان کے حالات کے رجسٹر میں اندراج کر کے اسے تازہ ترین بنایا۔

میرے والد برسوں تک اپنے کام میں اتنے مصروف رہے کہ انہوں نے مذہب کے بارے میں کبھی کچھ نہ سوچا تھا۔ ہمارا خاندان لامذہب نہیں تھا۔ ہمارے دلوں میں خدا کا خوف ہمیشہ رہا اور ہم اس کے حضور ہمیشہ دست بدعا رہتے تھے لیکن گھر میں مذہبی رسوم و رواج اور روزانہ کا پوجا پاٹ نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ہمارے خاندان کے لوگوں کی زندگیوں میں مذہب کا کوئی واضح اثر نظر آتا تھا۔ صرف تہواروں اور برت رکھنے کے موقعوں پر' شادیوں یا کسی کی وفات پر اور بچوں کے نام رکھتے وقت ہمیں مذہب کا ایک مشینی سا احساس ہوتا تھا۔ کبھی کبھار میری والدہ کوئی مخصوص رسم ادا کر لیتی تھیں جیسے خسرے سے میری

صحت یابی پر انہوں نے چیچک کی دیوی درگا کے حضور ایک سادہ سا نذرانہ پیش کیا تھا۔ بڑی بڑی تقریبات پر جن میں بڑی پیچ دار رسومات ہوتی ہیں' پجاریوں کو بلایا ضرور جاتا تھا لیکن مذہب کے بارے میں وہ بھی اتنے ہی لاعلم نظر آتے تھے جتنے کہ ہم خود تھے۔

ہمارے گھروں اور دیہاتوں میں کسی قسم کا کوئی روایتی مذہب نہیں تھا۔ بیرونی حملوں اور حملہ آوروں کا کٹڑپن مذہب کے بڑے حصے کو بہا لے گیا تھا۔ مزید براں میرے والد کی نسل پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے میں بڑی سرگرم تھی۔ چنانچہ ایک دیہاتی لڑکے سے میرے والد ایک انجنیئر بن گئے تھے۔ ٹرگنومیٹری کے پیچیدار حسابات کرنا ان کا پیشہ تھا اور اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سکول اور کالج کے زمانے میں اور پھر اپنی ملازمت کے دوران جنگلوں میں اپنی ملازمت کے ابتدائی سالوں میں وہ مذہب سے لاتعلق ہی رہے۔ لیکن جب ان کی تعیناتی شہر میں ہوئی تو وہ آریا سماج کے زیر اثر آ گئے۔ سوامی دیانند سرسوتی کی اس اصلاحی تحریک کی پذیرائی پنجاب میں اس کے بانی کے وطن مالوف کاٹھیاوا' پونا اور بمبئی جیسی ترقی پذیر جگہوں کے مقابلے میں زیادہ ہوئی۔ اس کے ذریعے ہماری نئی پیشہ ور کلاس کو مغربی تشریق کے ساتھ ساتھ سادہ ویدک رسومات سے بھی آشنائی حاصل ہوئی۔ کٹڑپن اور بت پرستی کی مخالفت اور مندر اور پجاری کے بغیر ویدک رسومات کی جدیدیت نے پنجاب کے پڑھے لکھے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ آریا سماج میں بھی دو پارٹیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ ایک پارٹی ویدک مذہب اور اس کی تعلیمات کی طرف لوٹ جانا چاہتی تھی۔ اس کا نام گرو کل پارٹی تھا۔ دوسری پارٹی ویدک اور جدیدیت کا الحاق چاہتی تھی۔ اس کا نام کالج پارٹی تھا۔ پہلی پارٹی نے کانگڑے کی پہاڑیوں میں قدیم راہبانہ قسم کے تعلیماتی ادارے قائم کئے۔ انہیں گروکل کانگڑی کہتے تھے۔ یہاں سنسکرت کی تعلیم پر اصرار کیا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اینگلو ویدک سکولوں اور کالجوں کی اپیل زیادہ تھی۔ لاہور میں دیانند اینگلو ورنیکولر ہائی سکول اور دیانند اینگلو ورنیکولر کالج اس کے مراکز تھے۔ انہیں عام طور پر ڈی اے وی سکول اور ڈی اے وی کالج کہتے تھے۔ ترقی پسند ہندوؤں کے لئے یہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ جدید تعلیم پر اصرار' بچپن کی شادیوں کی مخالفت' بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کی اجازت پر اصرار ایسے جدید تصورات تھے جن پر میرے والد کی تربیت ہوئی تھی۔ ہم نے اس نئے مسلک کو اپنانا شروع کیا۔ ہم ایسے مندروں میں جاتے تھے جو مندروں سے زیادہ لیکچر ہال لگتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کشادہ صحن اور باغیچہ ہوتا تھا۔ عبادت صحن یا کھلے ہال میں ہوتی تھی۔ پوجا میں کوئی پجاری نہیں ہوتا تھا صرف جدید

تعلیم یافتہ وزیٹنگ سوامی ہوتے تھے۔ سندھیا ویدک میں ہوتی تھی اور مناجاتیں بھی ویدک میں۔ مجمعے کے درمیان صندل کی لکڑیوں سے آگ روشن کی جاتی تھی اور جلانے والی خوشبوئیں استعمال کی جاتی تھیں۔ تمام عبادت سادہ اور خوبصورت ہوتی تھی۔ عورتیں بچے اور مرد سب اکٹھے عبادت کرتے تھے۔ گھر پر بھی ہم صبح شام دو وقت سندھیا کرتے تھے۔ مگر یہ شوق زیادہ دیر تک نہ چلا اور کچھ عرصہ بعد آریہ سماج کی اس نرم سی تنظیم میں میرے والد کی دلچسپی بتدریج کم ہونے لگی۔ ان کی سندھیا میں بھی ناغے ہونے لگے۔ مندر جانا بھی کم ہو گیا اگرچہ آریہ سماج کی یہ رسومات گھر میں جاری رہیں۔

میرے والد کی غیر روایتی فکر پر آریا سماج نے کسی حد تک ایک تطبیقی اثر ڈالا۔ اپنی کلاس میں بھی وہ اپنے وقت سے آگے تھے۔ انہوں نے کئی ضروری اور غیر ضروری رواجوں کی مخالفت کی اور ہمارے معاشرے کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ان باتوں کے لئے ان کو کبھی ہدف ملامت نہیں بنایا گیا۔ اس کے برعکس گو بادل نخواستہ ہی سہی ان کے کام کی تعریف ضرور ہوئی۔ مثلاً ہماری پھوپھی زاد بہن کی شادی انہوں نے بہاولپور میں طے کی۔ وہاں کے رسم رواج اور زبان سب مختلف تھے اور وہ لوگ بالکل غیر پنجابی معلوم ہوتے تھے۔ اس بات پر گھر میں کافی خوف و ہراس پھیل گیا لیکن شادی کے وقت سب نے محسوس کیا کہ یہ جوڑی بہت اچھی ہے اور بات بھی یہی اہم تھی۔ انہوں نے لڑکے کو ہمارے گھر آنے اور لڑکی سے ملنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ شادی بیاہ پر ان غیر پیداواری اخراجات کے بھی مخالف تھے جن کا ہمارا معاشرہ عادی ہو چکا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق وہ ایسے بے مقصد ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بجائے بخیل کہلانے کو ترجیح دیتے۔ ایسے موقعوں پر ہماری والدہ ان کا بڑا ساتھ دیتی تھیں مگر وہ یہ بھی سوچتی تھیں کہ کئی موقعوں پر میرے والد اپنے عقاید پر بے رحمی سے کاربند ہیں۔ ان کے خیال میں ان لوگوں سے جنہوں نے نہ ان جیسی تعلیم حاصل کی تھی اور نہ معاشرے میں ان کا مقام میرے والد جیسا تھا' یہ توقع رکھنا کہ وہ میرے والد کے قدم بقدم چلیں' میرے والد کی خود غرضی تھی۔ میرے والد کی طرح ان سے رسوم و رواج کو نظر انداز کرنے کی توقع کرنا بڑی زیادتی تھی۔

ان کی ایک بات جس کی بنا پر انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ اپنے رشتے داروں کو نوکریاں دلوانے سے انکار کرنا تھا۔ رشتے داروں کا اس مقصد سے میرے والد کی طرف رجوع کرنا ایک فطری عمل تھا اور ان کو مشکور نہ کر سکنا اس سے کہیں زیادہ غیر فطری عمل تھا۔ جب میرے والد اپنے رشتے داروں کو انکار کر دیتے تھے تو وہ دوسرے

افسروں کے پاس جانے کے قابل ہی نہ رہتے تھے کیونکہ ان افسروں کے بھی تو آخر ایسے ہی رشتے دار ہوتے تھے اور ان کی اپنی مجبوریاں بھی ہوتی تھیں۔ ذات پات اور خاندان کے خدمات کے روایتی پیٹرن میں راستبازی کی اس نئی تعریف کو فٹ کرنا ایک ایسی مشکل تھی جس کا میرے والد کی نسل کو سامنا تھا۔ میرے والد اپنے انگریز رفقائے کار پر رشک کرتے تھے کہ وطن سے دور ہونے کی بنا پر انہیں ان کے رشتے دار تنگ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنی ملازمت میں دیانتداری کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ دیانت داری میں پنجاب کی نئی انتظامیہ کا کم از کم افسروں کی حد تک بڑا نام تھا۔ انتظامیہ کی نچلی سطحوں پر تحفے تحائف کا سلسلہ جاری تو رہا لیکن بڑے مدھم طریقے سے مگر اعلیٰ افسروں میں کوئی بد دیانت نہ تھا۔ میرے والد کے خیال میں بددیانتی سے بچنا کوئی مشکل کام نہ تھا کیونکہ آپ کسی اجنبی کے ساتھ رعایت برتنے اور اس کے عوض پیسے وصول کرنے پر مجبور نہ تھے۔ پریشانی کی اصل وجہ رشتے داروں کے تقاضے تھے جیسے کہ آپ کی بیوہ چچی آپ کی دہلیز پکڑ لے اور اپنے بچے کو آپ کے حوالے کر دے۔ ایک دفعہ ہمارا چچا زاد بھائی ہمارے ہاں دو سال تک رہا اور آخر مفت رہنے سے بیزار ہو کر خود ہی چلا گیا۔

ہم بچے اپنے والد کی مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہمیں بے لچک اور بے رنگ شخصیت نظر آتے تھے۔ ان کی زندگی میں آرام اور تفریح نام کوئی چیز نہیں تھی جس میں ہم ان کے ساتھ شریک ہو سکتے۔ انہیں صرف اپنے کام اور ہمارے مستقبل سے دلچسپی تھی۔ وہ متواتر کام کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کھیل کود کو وہ ایسی ریاضت سمجھتے تھے جس کی ہمیں باقاعدہ وقفوں وقفوں سے ضرورت تھی تاکہ ہم اور زیادہ محنت سے کام کر سکیں۔ نیسفیلڈ کی انگریزی گرامر میں دیئے ہوئے محاوروں کی پوری فہرست کی انہوں نے اپنی حسب منشا تعبیر کر رکھی تھی۔ ایک محاورہ تو مجھے خاص طور پر یاد ہے کہ "شراب اندر' عقل باہر۔" اس کی ہمارے استاد نے بڑی اچھی تشریح کی تھی لیکن میرے والد کی تشریح کے مطابق شراب کے ایک قطرے کے اندر جاتے ہی عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ اس پر میں نے اعتراض کیا کہ نیسفیلڈ کی یہ مراد ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ انگریز لوگ تو خود شراب پینے کے لئے بد نام ہیں۔ اس بات نے انہیں زچ کر دیا۔ انگریزوں کی خوبیوں جیسے کہ ان کا بااصول ہونا' ان کی محنت اور ان کی راست بازی کے وہ اگرچہ بڑے معترف تھے لیکن اندرونی طور پر انہیں بڑا دکھ تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ اس بات نے میرے والد کو مایوس کیا۔ یہ بات انہوں نے کسی انگریز سے سنی ہو گی کہ وہ صحت کے لئے شراب پیتے ہیں

کیونکہ جلد ہی ہینیسی کی آدھی بوتل ہمارے گھر آ گئی۔ اسے دوائی کی خوراک کی طرح وہ گرم پانی میں ملا کر پیتے تھے مگر یہ ان کی عادت نہ بنی۔ کچھ عرصے کے بعد بد ذائقہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی چھوڑ دی۔

ان کی سرشت میں کوئی تضاد یا دوغلاپن نہیں تھا۔ وہ مستقل مزاج تھے۔ جو نصیحت وہ دوسروں کو کرتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔ ان کی نسل نے پنجاب میں درمیانے طبقے کی بنیاد رکھی اور پنجابی کیریکٹر میں نئی اقدار داخل کیں لیکن اس عمل سے میرے بڑے چچا کے زمانے کا رنگ جاتا رہا۔

میری والدہ ونایک کھتری تھیں۔ ان کا تعلق مشرقی پنجاب میں ریاست کپور تھلا کے ایک چھوٹے سے گاؤں ہادی آباد سے تھا۔ اس زمانے میں شاذ ہی کوئی دو سو میل دور شادی کرتا تھا۔ جب ہم اپنی والدہ سے اس غیر معمولی واقعہ کے بارے میں پوچھتے تو وہ شانے جھٹک کر پنجابی کی مثل دہراتیں "تم وہیں جاتے ہو جہاں تمہارا دانہ پانی تمہیں لے جائے۔" وہ پنجاب کے میدانی علاقے کی رہنے والی نہیں تھیں۔ وہ پہاڑی علاقے میں پیدا ہوئی تھیں اور وہیں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اپنی شادی تک وہ پہاڑی علاقے ہی میں رہیں۔ ان کے والد پوسٹ ماسٹر تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی کانگڑہ اور چمبہ کے پہاڑوں میں گزاری تھی۔ ہمارے لئے یہ بڑی حیرت کا باعث تھا کہ ہماری والدہ پہاڑوں' جنگلوں اور برفوں میں رہ چکی ہیں کیونکہ ہم نے یہ چیزیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ہمیں بتاتی تھیں کہ برف کیسے گرتی ہے لیکن ہمارے ذہنوں میں وہ منظر نہیں آتا تھا۔ میدانوں میں انہیں اپنی ابتدائی زندگی قدرے کٹھن لگتی ہو گی لیکن دریائے راوی پر مادھو پور کے ہیڈ ورکس پر قیام جہاں وہ شادی کے فوراً بعد آ کر رہی تھیں' کچھ تسکین کا باعث ضرور ہوا ہو گا کیونکہ وہ مقام پہاڑوں کے بہت قریب ہے اور وہ دور سے پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ مادھو پور میں برف تو کبھی نہیں پڑی لیکن پانی ٹھنڈا یخ تھا۔

میری والدہ کی جسمانی ساخت اور رنگ روپ پہاڑی تھا۔ ان کا قد چھوٹا تھا اور برسوں تک ان کا لب و لہجہ پہاڑی ہی رہا جس پر فارسی یا اردو کا کوئی سایہ نہیں تھا۔ ان کی بولی سنسکرت کے بہت قریب تھی۔ اس زمانے میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ ان کے والد کٹر گروکل آریا سماجی تھے۔ انہوں نے میری والدہ کے اکلوتے بھائی کو پڑھنے کے لئے کانگڑی میں گروکل درس گاہ میں بھیج دیا تھا۔ وہاں کی تعلیم بدلتے ہوئے زمانے سے بڑی مختلف تھی چنانچہ وہ ہمیشہ غیر دنیا دار ہی رہا۔ میری والدہ زندگی کے حقائق

سے زیادہ قریب' مستقل مزاج اور مصمم ارادے والی تھیں اور ہر حال میں اپنی دیکھ بھال کر سکتی تھیں۔

شادی کے ابتدائی زمانے میں شاید میری والدہ کو انگریزی طرز زندگی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی گئی ہو گی اور شاید میرے والد نے انہیں انگریزی کپڑے پہننے پر آمادہ کیا ہو گا۔ ہم نے ایک پرانی تصویر میں اپنی والدہ کو انگریزی بلاؤز' سکرٹ اور انگریزی جوتے پہنے ہوئے اور ننگے سر دیکھا ہے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ ممکن ہے یہ تجربہ زیادہ دیر نہ چلا ہو یا پھر یہ صرف اس تصویر تک ہی محدود ہو کیونکہ ہم نے ہمیشہ انہیں پنجابی لباس ہی میں دیکھا۔

میری ماں کی کھانے کی عادتوں کو بدلنے کی میرے والد کی تمام کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان کا تعلق کٹر سبزی خور طبقے سے تھا جو کھانے میں پیاز تک کو برداشت نہیں کرتے۔ ان کا کھانا باقی گھر والوں سے علیحدہ پکتا تھا۔ اگرچہ وہ باورچی خانے میں پیاز کو برداشت کر لیتی تھیں لیکن گوشت اور مچھلی باورچی خانے سے باہر ہی تیار کی جاتی تھی۔ سردیوں کی راتوں کو جس طرح ہم ان کے بستر میں گھس جاتے تھے اور ان سے لاڈ پیار کرتے تھے اسی طرح ہم ان کے کھانے میں بھی شریک ہو جاتے تھے اور انہوں نے ہمیں شریک کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن ہمیں احساس رہتا تھا کہ ہمارے پاس سے آنے والی گوشت کی بو انہیں پسند نہیں۔ جس طرح وہ ہمیں بوسہ دیتیں اس سے بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بو انہیں اچھی نہیں لگتی۔

میرے والد کے انگریز رفقائے کار کی بیگمات سے ملنا وہ پسند کرتی تھیں لیکن میرے والد کو یہ ضرور کہتی تھیں کہ وہ خواتین اتنی معقول نہیں جتنا کہ میرے والد کا خیال ہے۔ وہ بھی اتنی ہی قدامت پسند اور تضادات کا شکار ہیں جتنی کے ہمارے ہاں کی عورتیں۔ وہ اپنے شوہروں کی خاطر اپنی بچوں سے دور رہنے پر ان کی بڑی تعریف کرتی تھیں۔ تعلیم کے لئے بچوں کو انگلستان بھیجنا اور ان سے تین تین چار چار سال علیحدہ رہنا تاکہ وہ اپنے شوہروں کے قریب رہ سکیں' ان کے نزدیک ایک بڑا کارنامہ تھا کیونکہ اس طرح وہ بچوں اور شوہر دونوں کی خدمت بجا لا سکتی تھیں۔ پہلے جب میرا بڑا بھائی اور بعد میں مَیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو ان کی آنکھیں نم تک نہ ہوئیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جب سٹیشن سے وہ واپس گھر پہنچیں تو سیدھا اپنے بستر میں گھس گئیں اور گھنٹوں تک بے سدھ رہیں۔ ان کی ایک بڑی عجیب عادت تھی کہ وہ غصے میں نہیں آتی تھیں اور نہ ہی شکایت

کرتی تھیں مگر جب بات ان کی برداشت سے باہر ہو جائے تو کسی کو بتائے بغیر وہ چپکے سے اپنے بستر میں چلی جاتیں اور وہاں بعض اوقات گھنٹوں تک بے سدھ پڑی رہتیں۔ گھر کا کام کاج معمول کے مطابق چلتا رہتا تھا اور کئی گھنٹوں کے بعد وہ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولتیں اور بستر سے نکل کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں خطرے کو پہلے سے بھانپ لینے کی حس میری والدہ میں بڑی پریشان کن حد تک تھی۔ اس پر ہم سب لوگ ہمیشہ حیران ہوتے تھے۔ کئی دفعہ انہوں نے میرے والد کو بتایا کہ انہیں (میری والدہ کو) فوراً روانہ ہو جانا چاہئے کیونکہ خاندان میں کسی کی وفات ہونے والی ہے۔ والد تو خیر ان کا مذاق اڑاتے رہتے تھے لیکن میری والدہ چلی جاتیں اور ان کی بات صحیح ثابت ہوتی۔ عموماً وہ ایسی بدشگونی کا ذکر ہمارے سامنے تو نہ کرتیں لیکن ان کی بے چینی سے معلوم ہو جاتا کہ ضرور کوئی بری خبر آنے والی ہے۔ ایک صبح اٹھ کر انہوں نے بتایا کہ میرا چھوٹا چچا اس دنیا سے جانے والا ہے۔ وہ صرف تیس سال کا تھا۔ ابھی ابھی اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ تندرست و توانا تھا۔ ہمیں اس کی اچانک موت کی اطلاع اسی دن مل گئی۔

میری والدہ کو مغربیت کی طرف لانے کے مختصر تجربے کے بعد میرے والد نے میری والدہ کو انہی کے حال پر چھوڑ دیا لیکن وہ میرے والد کی ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ ایک حد تک چلتی رہیں مگر اپنی کسی چیتی قدر کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ تبدیلی کے اس مرحلے میں ہماری خواتین عام طور پر اپنی روایات سے اس حد تک وابستہ رہیں جس سے ہماری اپنی روایات ڈوبنے سے بچ گئیں۔ ہمارے والد جلدی جلدی بدلے لیکن ہماری مائیں آہستہ آہستہ اور میری نسل نے ماضی کو فراموش کئے بغیر جدیدیت کو اپنایا۔

تیسرا باب

ملازمت کے دوران صوبے کی مختلف نہروں پر میرے والد کے تبادلے ہوتے رہے۔ ہم چھوٹی چھوٹی کینال کالونیوں میں رہتے تھے۔ کبھی ہیڈورکس پر، کبھی کسی نئے منصوبے پر اور کبھی نہر کے ساتھ ساتھ کسی اوپریٹنگ مقام پر۔ میں بلوکی کے مقام پر ایسی ہی ایک کالونی میں پیدا ہوا تھا۔ یہاں دریائے راوی سے ایک نہر نکالی جا رہی تھی اور یہاں اس کا ہیڈ ورکس تعمیر ہو رہا تھا۔ اس زمانے کے لئے یہ ایک خاصا بڑا منصوبہ تھا۔ بڑے صبر و تحمل سے مشینوں کی مدد کے بغیر صرف اینٹوں اور مسالے سے اس کو مکمل کرنا تھا۔ تمام بیراج انسانی ہاتھوں سے بنا تھا۔ ہاتھ سے پسی ہوئی اینٹوں کے گیرو اور چونے کی ملاوٹ سے تیار کردہ مسالے کے ساتھ ایک ایک اینٹ کو جوڑ کر اس بیراج کی چنائی کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں نہ تو ٹرک تھے نہ یوکلڈ ڈمپر اور نہ ہی مٹی اٹھانے والی مشینیں۔ صرف انسان اور جانور کام کرتے تھے۔ جانوروں میں بھی صرف گدھے تھے جو غیر ہموار زمین پر چھکڑوں کی نسبت زیادہ آسانی سے حرکت کر سکتے تھے اپنی پیٹھ پر دونوں طرف لٹکتے ہوئے مٹی سے بھرے ہوئے تھیلوں کے ساتھ تعمیری ساز و سامان کے ڈھیروں میں سے گدھے ادھر ادھر ہو کر گزر جاتے تھے۔ اس وقت گو ڈیم بڑے چھوٹے ہوا کرتے تھے لیکن ان کی تعمیر میں برسوں لگ جاتے تھے۔ بلوکی ایسا ہی ایک چھوٹا ڈیم تھا جس پر میرے والد اپنی عمر کے تیسویں سال میں تعینات ہوئے۔ بلوکی کی یادوں میں ایک یاد خالص سونے کی اس خوبصورت گھڑی کی ہے جو ڈیم کے مکمل ہونے کی یادگار میں میرے والد کو انعام کے طور پر ملی تھی۔ میرے والد بتاتے ہیں کہ جب نہر میں پانی چھوڑنے کے لئے سلیوس ویلوز کے گیٹ اٹھائے گئے تو منصوبے کے چیف انجنیئر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ملازم تک ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تحفہ ملا۔ اس گھڑی کا ڈائل سفید انیمل کا تھا جس پر نیلی سیاہی سے رومن ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ اس کی خالص سونے کی سوئیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ پشت پر سنہری ڈھکنے کے اندر لکھا ہوا تھا: "بلوکی ہیڈ ورکس کی تعمیر میں خدمات کے لئے ہندوستان کے شہنشاہ کی طرف سے رام داس سب ڈویژنل آفیسر کو پیش کی گئی"۔ گھڑی بڑی قیمتی تھی اور روزمرہ

کے استعمال کے لئے اسے مناسب خیال نہیں کیا گیا تھا۔ اسے برسوں تک تالے میں بند رکھا گیا۔ آخر وہ چوری ہو گئی۔ والد نے اس کی برآمدگی کے لئے بڑی کوشش کی۔ پولیس کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ چوروں نے اسے سات روپے میں بیچ دیا تھا۔ ہم نے زیادہ قیمت دے کر بھی اسے خریدنے کی کوشش کی لیکن گھڑی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ہمیں صرف کچھ پرانے مسروقہ کپڑے ہی ملے۔

بلوکی کا منصوبہ مکمل ہونے پر میرے والد کا تبادلہ ہو گیا اور انہیں اسی نہر پر مانگٹاں والہ پر تعینات کر دیا گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی کینال کالونی میں ہماری رہائش تھی۔ ہمارا قریب ترین ریلوے سٹیشن ننکانہ صاحب تھا جہاں سکھوں کا ایک مشہور گردوارہ ہے۔ ہم کافی دیر یہاں رہے حتی کہ میری عمر سات سال ہو گئی۔ اس مقام کی یادیں میرے ذہن میں اس طرح محفوظ ہیں کہ وقت نہ تو ان کو مٹا سکا اور نہ ہی ان کو دھندلا سکا۔ یہ ایک غیر زرعی ہموار اور گرد آلود الگ تھلگ علاقہ تھا۔ اس ماحول میں میرا بچپن بڑا پر مسرت اور بڑا مطمئن تھا اس لئے ایسے کھلے علاقوں سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ میں ہمواریت اور گرد سے کبھی پریشان نہیں ہوا۔ مجھے بغیر درختوں کے مغربی پنجاب اور اس کے کشادہ آفاق سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کہ ان پہاڑوں سے جن سے گجرات کے قیام میں میری آشنائی ہوئی تھی۔ گجرات جیسے چھوٹے شہر مجھے پریشان نہیں کرتے اور بڑے شہروں کی زندگی مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ تاہم میری اس ناپسندیدگی کے باوجود پچھلے کئی سالوں میں مجھے بمبئی اور مانچسٹر جیسے شہروں میں رہنا پڑا لیکن یہاں میری پسند ناپسند کا دخل نہیں تھا۔ لگاؤ تو مجھے ان دونوں شہروں سے بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن محبت مجھے ہمیشہ مانگٹاں والہ جیسے قصبات سے ہی رہی۔

ہماری کالونی نہر سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑک اس مقام سے شروع ہوتی تھی جہاں زمین کی ڈھلوان کے پیش نظر ایک ٹھوکر بنائی گئی تھی اور اس کی صورت ایک آبشار کی ہو گئی تھی۔ شام کی خاموش فضا میں اس کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی۔ یہ ایک بڑی نہر تھی جو اڑھائی سو فٹ چوڑی تھی۔ ہمیں اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی مگر جب لاہور میں زیر تعلیم میرے چچا ہمارے ہاں چھٹیاں گزارنے آتے تھے تو وہ کئی لڑکوں کو نہر میں تیرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ اس کے دوست ہمیں نہر کے چکر کھاتے ہوئے بھورے پانی کی آبشار کے نیچے ایک آدھ ڈبکی لگوا دیتے تھے۔ پنسال نویس جو آبشار کے قریب ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا ایک مچھلی پکڑ کر ہمارے ہاں بھجوا دیتا تھا۔ یہ ایک غیر

معمولی واقعہ ہوتا جو ہمارے ہاں صرف میرے چچا کی آمد پر ہی پیش آتا۔ میرے چچا ہی مچھلی کو صاف کرتے تھے اور ہمارے شام کے کھانے کے لئے تلتے بھی وہی تھے۔ اس دن ہمیں دودھ پینے یا دودھ سے بنی ہوئی کوئی چیز کھانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ خیال یہ تھا کہ ایسا کرنے سے پھل بہری ہو جاتی ہے۔

ہماری کالونی مربع شکل کی تھی۔ اس کے سامنے کی طرف جہاں نہر سے آنے والی سڑک اس سے ملتی تھی، تین بنگلے تھے۔ پہلا بنگلا ریسٹ ہاؤس تھا۔ دوسرا بنگلا ایکس ای این کا اور تیسرا بنگلا ہمارا تھا۔ یہ باقی دونوں بنگلوں سے مختلف تھا۔ پہلے دونوں بنگلے انیسویں صدی کے آخر میں ڈاک بنگلوں کے لئے مروج طرز تعمیر پر بنائے گئے تھے۔ ان کی دیواریں سرخ پکی اینٹوں کی تھیں۔ برآمدے بڑے کشادہ تھے اور چھتیں ہموار تھیں۔ چھتوں میں ریل کے گارڈر استعمال کئے گئے تھے۔ چھت بنانے کے لئے ان کے درمیان اینٹوں کی محرابیں تھیں۔ ہمارا بنگلہ ان دونوں سے مختلف تھا۔ یہ شمالی ہند میں ابتدائی انگریزی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی اونچی دیواروں میں گارے اور بھوسے سے بنی ہوئی کچی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔ دیواروں پر قلعی تھی۔ گیبلوں پر گھاس کا موٹا چھپر تھا۔ انگلستان کے چھپروں والے گھر مجھے ہمیشہ اس گھر کی یاد دلاتے تھے۔

بنگلوں کے قطار کے پیچھے ڈسپنسری، سٹاف کی رہائش گاہیں، ورک شاپ اور تار گھر تھے اور دوسری طرف باغیچہ تھا جس میں پھل اور سبزیاں اگائی جاتی تھیں۔ کالونی میں کئی قسم کے درخت تھے۔ ان میں روز وڈ، آم، گل نشتر، کورل اور انڈین لیورم اور پیپل کے درخت تھے اور گزرگاہوں پر یوکلپٹس کی قطاریں تھیں۔ دوسری کالونیوں کی طرح خوش نما اور اس کی صاف ستھری حالت ان انگریز افسروں کی یاد دلاتی تھی جنہوں نے اسے پہلے پہل آباد کیا ہو گا۔ کالونی کا اپنا آبی نظام تھا۔ پانی نہر سے لیا جاتا تھا۔ کالونی سیراب اور سرسبز تھی۔ اپنے چاروں طرف خشک علاقے میں یہ نخلستان لگتی تھی۔ پینے کا پانی ہم اپنے کنویں سے لیتے تھے۔ کالونی میں کوئی دکان نہیں تھی اور چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے کے لئے بھی ہمیں مانگٹاں والہ جانا پڑتا تھا۔ دیگر ضروریات کے لئے ننکانہ صاحب یا لاہور قریب ترین مقامات تھے۔

نہری نظام کی ابتدا کور آف انڈین انجنیئرز نے کی تھی اور شروع میں انہوں نے ہی اس نظام کو چلایا تھا۔ چنانچہ اس کی تنظیم عسکری خطوط پر ہوئی تھی۔ ہماری کالونی ایک ڈویژن کا ہیڈکوارٹر تھی۔ نہر کے ساتھ ساتھ پچاس میل اوپر اور پچاس میل نیچے کا علاقہ

اس کی تحویل میں تھا۔ اس میں وہ چھوٹی نہریں بھی شامل تھیں جو نہر سے کھیتوں تک پانی پہنچاتی تھیں۔ سارے ڈویژن میں تار برقی کا اپنا انتظام تھا۔ بعد میں ٹیلیفون بھی آگیا جس کے ذریعے ہم اپنے ہمسایہ ڈوژنوں سے منسلک ہو گئے۔ ہمارے ڈوژنوں میں میرے والد کے علاوہ دو سب ڈوژنل آفیسر اور تھے۔ وہ بھی اپنے سب ڈوژنوں میں ہمارے جیسی کالونیوں میں رہتے تھے۔ یہ کالونیاں ہماری کالونیوں سے قدرے چھوٹی تھیں۔

اپنے ڈوژن میں نہر کو چلانے اور اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میرے والد کی تھی۔ جب نہر میں پانی کی خاص مقدار پہنچ جاتی تھی تو وہ اس کو کم سے کم ضائع کئے بغیر آگے بڑھانے کے ذمہ دار تھے۔ بڑی نہر سے چھوٹی نہریں اور پھر ان سے اور بھی چھوٹی نہریں نکلتی تھیں جن سے پانی کھیتوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ پانی کی تقسیم کے مقامات پر مقررہ وقفوں سے پانی چھوڑنے کے لئے عملہ مقرر تھا۔ کسانوں کو پانی ان کی باری پر ملتا تھا اور ہر کسان کی باری مقرر تھی۔ دن یا رات کو اپنی باری پر کسان اپنے کھیتوں میں پانی کے پہنچنے کا انتظار کرتے تھے۔ اس وقت یہ خیال رکھنا ہوتا تھا کہ ایک کسان کی باری کے دوران کوئی دوسرا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں نہ لے جائے۔ پانی کسان کی زندگی تھی اور پانی کے تنازعوں پر قتل بھی ہو جاتے تھے۔ پانی کے متعلق تنازعے اتنے ہی عام تھے جتنے کہ عورتوں کے متعلق۔ ایک پنجابی محاورے کے مطابق زندگی کے تمام تنازعوں کی جڑ زن' زر یا زمین ہے۔

نہر کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں یا چھوٹی نہروں کے نکلنے والی جگہیں اہم تھیں ان پر بھی عملہ مقرر تھا جو دن رات اپنا فرض انجام دیتا تھا۔ ہر چند گھنٹوں کے بعد پنسال نویس پانی کے بہاؤ کی پیائش کرتے تھے اور اعداد و شمار میرے والد کو بذریعہ تار بھجوا دیتے تھے۔ سارا دن اور رات گئے تک اور بعض اوقات تو آدھی رات کو بھی تاریں آتی رہتی تھیں۔ جس سکون سے انہیں پڑھ کر میرے والد ایک طرف رکھ دیتے تھے ہمارے لئے حیرانی کا باعث تھا۔ بعض اوقات وہ اپنا کھانا چھوڑ کر دفتر کا رخ کرتے تھے اور کسی کلرک یا اوورسیئر کو بلا کر مخصوص مقام پر تار کے ذریعے ہدایات بھجوا دیتے تھے۔ ہنگامی حالات میں وہ خود بھی موقعے پر چلے جاتے تھے۔ مراسلات کے مسلسل اور مستحکم نظام کی وجہ سے ہماری کالونی رات دن ڈیوٹی پر ہوتی تھی اور ہر وقت چوکس رہتی تھی۔

جب کبھی نہر کا بند ٹوٹتا تھا تو سنسنی پھیل جاتی تھی۔ اس وقت کالونی گویا حالت جنگ میں ہوتی۔ بند ٹوٹنے پر پانی کھیتوں کا رخ کرتا اور سیلاب کی صورت میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا۔ قریبی کسان بدحواس ہو جاتے اور اپنے مویشیوں کے ساتھ خشک جگہوں کی

طرف بھاگنا شروع کر دیتے۔ ان کی کھڑی فصلیں تباہ ہو جاتیں۔ نئی بوائی کے لئے تیار کی ہوئی زمین اور وہ زمین بھی جس میں تازہ بوائی ہوئی ہوتی سب سیلاب کی زد میں آ جاتی تھیں۔ ان کے مٹی کے بنے ہوئے گھر ڈھیر ہو جاتے تھے اور بہت زیادہ نقصان ہوتا تھا۔ اگر سیلاب زیادہ ہوتا تو زمین پر پانی کھڑا رہتا۔ زمین سیم زدہ ہو جاتی اور آئندہ موسم کی کاشت کے لئے بالکل بیکار۔ اس کے برعکس دور افتادہ کسان پانی کی اس غیر متوقع آمد سے بڑا فایدہ اٹھاتے تھے۔ اگر نہر کے ٹوٹنے کے واقعات کثرت سے ہوتے تو یہ مشتبہ بھی ہو جاتے تھے۔

ایس او ایس کے تار ڈویژن کے صدر مقام پر پہنچتے اور وہاں سے انہیں پورے حلقے یعنی سرکل میں سپرنٹنڈنگ انجنئر تک پہنچایا جاتا تھا۔ ہر طرف سے ہنگامی امداد بڑی تیزی سے پہنچنے لگتی تھی۔ قریبی کسانوں کو ہنگامی خدمت کے لئے طلب کر لیا جاتا تھا اور لوگوں کی بڑی تعداد شگاف کو پر کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ مٹی' ریت کی ہزاروں بوریاں اور جھاڑ جھنکار نہر کے شگاف میں ڈالے جاتے تھے۔ بعض اوقات اس کام میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اس دوران نہر کو بند کرنا پڑتا تھا۔ اگر شگاف نہر کے دھانے سے زیادہ فاصلے پر ہو تو نہر کو خالی ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا تھا۔

نہر کا اس طرح ٹوٹنا کالونی میں کافی عرصے تک موضوع گفتگو رہتا تھا۔ لیکن جب شگاف پر کیا جا رہا ہوتا تھا تو کالونی میں کافی سرگرمی ہوتی تھی۔ لوگوں کو اور ساز و سامان کو جلدی جلدی موقعے پر بھیجا جاتا تھا۔ سوائے تار بابو یا ایک آدھ کلرک کے کالونی بالکل خالی ہو جاتی تھی۔ نہر کو چلانے والا پورا سٹاف اوورسیئر' سب اوورسیئر' میٹ' ورکشاپ کا عملہ مزدور یعنی کام کرنے کے اہل تمام افراد موقعے کا رخ کرتے تھے۔ جائے وقوع سے ہیڈ کوارٹر تک پیغامات کے ساتھ پیغام رسان ہر وقت بھاگتے رہتے تھے تاکہ تمام کاروائی کی اطلاع جلد از جلد اوپر دی جا سکے اور جو ہدایات اوپر سے موصول ہوں ان کو فوری طور پر جائے وقوع پر پہنچایا جائے۔

جلد ہی اطلاعات آنے لگتیں کہ شگاف پر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت موقعے پر موجود مصروف لوگوں کو نہ کھانے کا ہوش رہتا تھا اور نہ نیند کا خیال آتا تھا۔ لوگ ہنگامی طور پر قایم کئے ہوئے باورچی خانے سے تقسیم کی جانے والی دال روٹی پر گزارا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کالونی کے مصروف کار لوگوں کے گھروں سے کھانا آ جاتا تھا اور اس دوران پہلی دفعہ انہیں ڈھنگ کا کھانا ملتا تھا۔ جب شگاف پر ہو جاتا تھا تو ہمارے والد تھکے ہوئے نیند کی

حالت میں بغیر شیو کئے کیچڑ میں لت پت گھوڑے کی زین میں ڈھیر گھر پہنچتے تھے۔ ان کی واپسی اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ ہنگامی حالت ختم ہو گئی ہے اگرچہ بہت سارا دفتری کام جیسے رپورٹیں مرتب کرنا اور نہر کو دوبارہ کھولنے کے انتظامات اب بھی باقی رہتے تھے۔

میرے والد گٹھے ہوئے جسم کے توانا آدمی تھے۔ وہ کافی تناؤ برداشت کر سکتے تھے۔ چالیس سال بعد جب وہ اسی سال کے ہو چکے تھے اور ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا' میں نے انہیں اپنے کمرے سے غسل خانے تک پاؤں گھسیٹ کر چلتے دیکھا۔ دس فٹ کا فاصلہ انہوں نے دس منٹ میں طے کیا۔ ہم نے آخر تک ان کو کبھی سہارا نہیں دیا کیونکہ سہارا نہ دینے سے ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء خواہ کتنے ہی ست کیوں نہ ہوں' حرکت میں رہتے تھے اور پھر ان کی خود داری بھی بحال رہتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقعے پر میرا ذہن ماضی کی طرف لوٹ گیا جب میں نے انہیں تھکن سے چور دیکھا تھا۔ میں نے انہیں یہ بات یاد دلائی۔ میں نے کہا "آپ کو دس قدم چلنے میں دس منٹ لگے ہیں۔ گھوڑے کی پیٹھ پر آپ نے زیادہ سے زیادہ کتنا سفر کیا ہو گا"؟ وہ بڑے دلیر آدمی تھے اور اس سوال پر بڑے خوش ہوئے اور بولے "ایک دفعہ میں نے پورے چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے تھے اور سو میل سے زیادہ ہی سفر کیا ہو گا" اور اپنی حالت پر افسوس کرنے کی بجائے انہوں نے بڑے شوق سے وہ واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

نہر کی دیکھ بھال کا کام ہروقت جاری رہتا تھا۔ پلوں' ٹھوکروں' بندوں' پشتوں اور راج گیری کے کام کی حفاظت ضروری امور تھے۔ نہروں کے بندوں کو صاف ستھرا رکھنا' ان کے برموں کو ٹھیک رکھنا اور نہر کی سڑک کو قابل استعمال رکھنا اور دوسرے بڑے کام نہر ہی کی دیکھ بھال میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تعمیری کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا۔ کبھی نہر کے نئے ماڈل اور ڈیزاین تیار کرنے ہوتے تھے اور سروے کا کام بھی کرنا ہوتا تھا۔ جب نہر خشک ہوتی تھی تو وہ کام ہاتھ میں لیا جاتا جو نہر کے چلنے کے دوران کرنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ اسے نہر کے دوبارہ چالو ہونے سے پہلے ختم بھی کرنا ہوتا تھا۔

کالونی خود کفیل تھی اور اپنی دیکھ بھال خود کرتی تھی۔ تمام سہولتیں کالونی خود ہی مہیا کرتی تھی۔ ہمارا اپنا ڈاکٹر تھا اور میرے والد نے ایک ٹیچر کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ تہواروں خصوصاً دیوالی پر جب سب لوگ دیئے جلاتے تھے تو خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ فصل کٹ جانے کے بعد بیساکھی پر بھی بڑی رونق ہوتی تھی۔ ہم سب نئے اور خوش رنگ کپڑے پہنتے تھے اور تہوار منانے کے لئے نہر کے کنارے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کالونی میں کوئی

شادی بھی ہوتی تھی۔ اس موقعے پر خوب خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ لڑکی کا والد شادی کے لئے اجازت طلب کرتا کیونکہ کالونی میں باہر کی نسبت شادی پر خرچ کم اٹھتا تھا۔ ایسے موقعے پر ہر شخص مدد کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ کوئی مہمانوں کے لئے بستر لاتا تھا تو دوسرا مہمانوں کی خدمت میں لگ جاتا تھا۔ ننکانہ صاحب کے ریلوے سٹیشن سے بارات تانگوں اور گھوڑوں پر اپنے بینڈ باجے کے ساتھ آتی تھی۔ رات کے وقت گیس لیمپ روشن کئے جاتے تھے۔ ان کی روشنی اتنی تیز ہوتی تھی جو عام طور ہم کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ پیدائش' بیماری اور کبھی کبھار موت پر کالونی کا ڈاکٹر معمول سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر ایک سادہ سا آدمی ہوتا تھا جو اپنی بتدریج کم ہوتی ہوئی مہارت سے وہ عمل کرتا تھا جو اس نے کبھی دور ماضی میں سیکھا تھا۔ کئی ڈاکٹر تو تجربات کرنے میں کافی دلیر ہوتے تھے لیکن اکثر ایسے تھے جو مکسچر کی دس بوتلوں پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ان بوتلوں پر نمبر لگے ہوئے ہوتے تھے اور تشخیص کے بعد ان ہی بوتلوں سے دوائی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی ان کو باری باری آزمایا بھی جاتا تھا۔

کالونی میں ہمارے لئے سب سے دلچسپ مقام تار گھر تھا۔ اس کا اپنا باغ تھا اور ان کے آلات بڑے دلچسپ تھے۔ ہماری حیرانی کا سب سے بڑا سبب مورس کوڈ تھا جو کئی میل دور پیغام بھیجتا تھا اور فوراً ہی جواب بھی لے آتا تھا۔ تار بابو کی ٹک ٹک ہمارے لئے ہیجان کا باعث ہوتی تھی۔ کچھ برسوں کے بعد جب ٹیلیفون آگیا تو میلوں دور سے ایک چیختی ہوئی آواز سن کر ہماری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ کالونی میں دوسری دلچسپ جگہ گارڈ ہاوس تھا۔ یہاں لوہے کا ایک ٹرنک رکھا رہتا تھا جسے خزانہ کہتے تھے۔ اس کے چوکیدار برق انداز کے ماتحت ہوتے تھے۔ اس زمانے میں فوجی توپچی کو برق انداز یعنی بجلی گرانے والے کہتے تھے۔ ہر چوکیدار کے پاس تلوار ہوتی تھی جو کبھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ برقنداز ایک نمایاں قسم کا بوڑھا آدمی تھا وہ ڈھاڑی میں خضاب لگاتا تھا۔ اپنی پگڑی جس میں ایک سفید پھندنا لٹکتا رہتا تھا وہ بڑی خوبصورتی سے باندھتا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ بڑا پروقار طریقے سے پیش آتا تھا۔ جب "حضور" "جناب" کہہ کر وہ ہمیں مخاطب کرتا تھا تو ہماری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔

گارڈ ہاؤس کے سامنے تین پایوں والے ایک سٹینڈ پر ایک چپٹی گول گھنٹی لٹکی رہتی تھی۔ اس پر چوکیدار ضرب لگا کر وقت کا اعلان کرتا تھا۔ رات کے وقت اس کی آواز سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ چوکیدار ہوشیار ہے۔ کالونی میں دو

چوکیدار اور بھی تھے جو رات کو کالونی میں گشت کرتے تھے۔ سونے والوں اور غیر آدمیوں کو
اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے وہ مہیب قسم کی آوازیں نکالتے تھے۔ اچھے چوکیدار
کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی آواز ایسی بلند ہو جو چوروں اور غیر آدمیوں کو خوف زدہ
کر سکے۔ اپنی موجودگی بتانے کے لئے ہر چوکیدار کا اپنا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ یو پی کا ایک
آنکھ والا چھوٹا سا بھیا ہمارا بہترین چوکیدار تھا۔ اگرچہ اس کی صورت اور جسم دلکش تو نہیں
تھے مگر رات کے وقت اس میں بڑی تبدیلی آ جاتی تھی۔ کوئی غیر آدمی خواہ وہ دن میں اسے
دیکھ ہی کیوں نہ چکا ہو رات کو اس کے خوف سے اس کے سامنے آنے کی جرات نہیں کر
سکتا تھا۔ رات کو اس کی آواز کا جادو اس کے اندر اتنی قوت بھر دیتا تھا جس کا اسے دن
کے وقت دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہر پندرہ منٹ بعد وہ اپنا گلا بڑی بلند آواز
سے صاف کرتا تھا اور بلغم کو جس کی ایک کثیر مقدار پیدا کرنے کا وہ اہل تھا' چند منٹ اپنے
منہ میں رکھ کر تھوک دیتا تھا اور سات ہی کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز لگاتا تھا جو
غیر آدمیوں اور اجنبیوں کو بھگا دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ "سونے والے سوتے رہیں باقی
خبردار" وہ اتنی بلند آواز سے کہتا تھا کہ وہ ایک میل دور بھی سنی جا سکتی تھی۔ یہ کہ کالونی
میں ہر شخص سو جاتا تھا اس امر کی شہادت تھی کہ وہ دن بھر مشقت کرتے رہے ہین۔ اس
کا آواز لگانا غیر آدمیوں کو تنبیہہ تھی کہ وہ جانتا ہے کہ وہ سو نہیں رہے۔ ایک مناسب
وقفے کے بعد لکشمن چوکیدار خون خشک کر دینے والی ایک لمبی ہا ہا ہا کی ایسی زور دار آواز
لگاتا تھا جیسے لگڑبگڑوں کے غول غرا رہے ہوں۔ اس آواز سے مانگناں والہ کے کتے بھی
ڈر کر بھونکنا شروع کر دیتے تھے اور قریبی گیدڑ بھاگ کھڑے ہوتے تھے مگر کالونی مزے سے
سوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ کالونی میں نقب زنی ہو گئی۔ صبح کے وقت معلوم ہوا کہ لکشمن کو
رسیوں سے باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ یہ ہتک برداشت نہ کر سکا
ور اس نے جلد ہی استعفے دے دیا۔

جب سپرنٹنڈنگ انجنیئر اپنے شاف' کلرکوں' اردلیوں' چوکیداروں' گھوڑوں اور اونٹوں
کے ساتھ کالونی میں آتا تو بڑی رونق ہوتی۔ اس کی آمد سے کئی دن پہلے کالونی کو بنانے
سنوارنے اور اس کی صفائی کا کام شروع ہو جاتا۔ وہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتا تھا اور اس کے
اتنے بڑے عملے کے لئے تنبو لگائے جاتے۔ اس کے محافظ اور اردلی بڑے شاندار نظر
آتے۔ یہ ہیجان اس لئے بھی زیادہ ہوتا تھا کہ ان دنوں سپرنٹنڈنگ انجنیئر انگریز ہوتے تھے۔
دور افتادہ جگہ میں جیسے کہ ہماری کالونی تھی' وہ واحد انگریز تھا جو دکھائی دیتا تھا۔ ماضی کی

طرف دیکھتے ہوئے جب اس ملک پر برطانوی راج تھا' ہماری کالونی جیسی بڑی ٹیکنیکل کالونی
میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے کسی انگریز کا کبھی کبھار نظر آنا عجیب سا لگتا ہے۔ ہمارے
ڈویژن کا سربراہ ایگزیکٹو انجنیئر اور اس کے تینوں ایس ڈی او سب ہندوستانی تھے۔

بچے کالونی میں بڑے خوش رہتے تھے۔ یہاں کوئی اور سکول نہ تھا۔ ہمارا اپنا ایک استاد
تھا جو موسم کے لحاظ سے کبھی درخت کے سائے میں اور کبھی دھوپ میں بیٹھ کر ہمیں
پڑھاتا تھا۔ اس پڑھائی میں سکولوں جیسی باقاعدہ تربیت کا ناخوشگوار عنصر نہیں تھا۔ ہمارے
کھیلنے کے لئے بڑی جگہ تھی اور وقت بھی بہت تھا۔ کھیلوں میں ہم اپنے بزرگوں کی نقل
کرتے تھے۔ ایک لڑکا گھوڑا بنتا تھا۔ اس کے کندھوں پر رسی ڈال کر اور اس کے دونوں
سرے بغلوں سے نکال کر لگام بنائی جاتی تھی۔ دوسرے لڑکوں میں سے ایک افسر بنتا تھا اور
کوئی اوورسیئر اور ہم سب معائنے کے لئے جاتے تھے۔ انگریز افسر کو ہندوستانی انگریزوں کی
طرح بولنی ہوتی تھی اور کھیل کے دوران دوسرے لڑکے اسے صاحب ہی کہہ کر مخاطب
کرتے تھے۔

ہمیں اپنے رشتے داروں خصوصاً ہمارے ان چچاؤں کا بڑا انتظار رہتا تھا جو میرے والد
کے زیر کفالت تھے اور جو لاہور میں اپنی سکول یا کالج کی چھٹیاں ہمارے ہاں گزارتے تھے۔
ان کے آنے پر زندگی بڑی دلچسپ ہو جاتی تھی۔ شام کے وقت وہ کھیل کود کا انتظام کرتے
تھے اور ہمیں لاہور شہر کی باتیں سناتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ لاہور بڑا حیرت انگیز شہر ہے۔
یہاں موٹر کاریں ہیں' دکانیں ہیں' کئی کئی منزلہ عمارتیں ہیں اور یہاں طرح طرح کی
مٹھائیاں اور نایاب قسم کے پھل ملتے ہیں۔

سال میں ایک آدھ دفعہ ہم والد کے ساتھ دوروں پر بھی جاتے تھے۔ ہماری چھوٹی
چھوٹی زندگیوں میں یہ بہت بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ دورے سے ایک رات پہلے ہی اونٹوں کی قطار
آ جاتی تھی اور اس پر سامان لادا جاتا تھا۔ یہ سامان گھر کے آدھے سامان کے برابر ہوتا تھا۔
پہلے دفتری میز کھولا جاتا تھا۔ اس کے دونوں طرف کی درازوں میں دفتر کی فائیلیں' لکھنے کا
سامان' سیاہ اور سرخ روشنائی کی دواتیں' ڈرائنگ کے آلات' قلم' پنسلیں' ڈائریاں اور پیپر
ویٹ' بڑی احتیاط سے رکھ دیئے جاتے تھے۔ یہ دونوں الماریاں ایک اونٹ کے دونوں طرف
لٹکا دی جاتی تھیں اور ان کے اوپر میز کا تختہ رکھ دیا جاتا تھا۔ دوسرے اونٹ پر ٹرنک بستر'
کھانا پکانے اور کھانے کے برتن' خشک راشن اور شاف کا سامان لاد دیا جاتا تھا۔ سامان
لادتے وقت اونٹ بڑا ہنگامہ کرتے تھے کیونکہ سامان لادنے کے لئے ان کو بٹھانا پڑتا تھا۔ گو

اونٹ بڑے صابر اور مستعد جانور ہیں مگر اٹھتے یا بیٹھتے وقت وہ غل بہت مچاتے ہیں اور یہ ہنگامہ کافی دیر جاری رہتا ہے۔ جب یہ کارواں تیار ہو جاتا تھا تو برق انداز اپنی تلوار میان میں ہی رکھے پہلے اونٹ کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس اونٹ کے گلے میں گھنٹی اور لالٹین لٹکائی جاتی تھیں۔ برق انداز کے اشارے پر اونٹوں کی یہ قطار چل پڑتی تھی۔ محافظ ساتھ ہوتے تھے اور ان کے پیچھے والد کا خادم اور ان کا سواری کا گھوڑا بھی ہوتا تھا۔ پہلا اونٹ فلیگ شپ ہوتا تھا۔ اس پر خزانہ لادا جاتا تھا۔ اس میں ملازموں کی تنخواہوں کی رقم ہوتی تھی۔ میرے والد اسے عملے میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک جھولتی ہوئی بتی اور گھنٹی کی آواز پر سفر کرتا ہوا یہ قافلہ صبح کو منزل مقصود پر پہنچتا تھا اور کیمپ قایم کرتے وقت سویا ہوا بنگلہ جاگ اٹھتا تھا۔

دوسری صبح دورے کی رونق میں شریک ہونے کے لئے ہم صبح سویرے ہی جاگ اٹھتے اور دعائیں مانگتے تھے کہ عین روانگی کے وقت کوئی ایسی تار نہ آجائے جس کی وجہ سے ہماری روانگی ملتوی ہو جائے۔ ہم اصطبل کی طرف رخ کرتے اور گھوڑے کو تانگے میں جتتا دیکھتے تھے۔ تانگہ دو پہیوں والی گاڑی ہوتی ہے جس پر دو سواریاں آگے اور دو پیچھے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ جوڑ کر بیٹھتی ہیں۔ ہمارے والد' سائیس' ایک خادم اور ہم سب بھائی تانگے میں سوار ہو جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ جاپان کی بنی ہوئی ایک صندوقچی بھی ہوا کرتی تھی۔ اس طرح دس بارہ میل کے فاصلے پر واقعہ پہلے ڈاک بنگلے کے لئے ہم روانہ ہو جاتے تھے۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی سڑک پر سفر کرتے تھے۔ نہر کی طرف ایک حفاظتی برم ہوتا تھا۔ اس کی ڈھلوان باہر کی طرف ہوتی تھی اور اس پر شیشم کے درخت سیدھی قطار میں لگے ہوئے ہوتے تھے۔ سڑک کچی لیکن بڑی ہموار ہوتی تھی اور اس پر تانگہ بڑی آسانی سے چل سکتا تھا۔ راستے میں کچھ رکاوٹیں بھی ہوتی تھیں کیونکہ والد کو جاری کاموں کا معائنہ بھی کرنا ہوتا تھا۔ کام کے متعلق ہدایات کےلئے راستے میں اوورسیئر بھی ملتے تھے۔ نہر کی چوکیوں پر ریکارڈ کا معائنہ بھی کرنا ہوتا تھا۔ ہمارے لئے ایسے التوا دلچپی سے خالی ہوتے تھے لیکن سفر کے دوران پیش کی جانے والی درخواستیں زیادہ دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ کسانوں کو جب پتہ چلتا کہ صاحب ادھر سے گزرنے والا ہے تو اکیلے یا مجمعے اور بعض اوقات بڑے بڑے وفدوں کی صورت میں والد کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ ان کی درخواستوں میں صرف دو باتیں ہوا کرتی تھیں: فصل خراب ہو گئی ہے اس لئے مالیہ معاف کر دیا جائے یا موگے کا منہ بڑا کر دیا جائے تاکہ انہیں زیادہ پانی مل سکے۔ بعض اوقات وہ

کوئی اپنا گھریلو معاملہ بھی پیش کر دیتے تھے کیونکہ ان کی نظر میں کوئی بھی سرکاری افسران کا مداوا کر سکتا تھا۔

ان وفدوں کے انداز بھی بڑے دلچسپ ہوتے تھے۔ قوی الجثہ داڑھیوں والے مسلمان یا سکھ کسانوں کا ایک گروہ بڑی بڑی اور ڈھلی ڈھالی پگڑیاں سروں پر باندھے' گھر کے کتے ہوئے سوت کے لمبے کرتے پہنے' رنگ دار تہمد باندھے اور اوپر اٹھی ہوئی نوک والی مضبوط پنجابی جوتی پہنے' آگے بڑھتے' جھک کر سلام کرتے اور بڑے مئودبانہ طریقے سے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے کچھ دیر بعد ان کا ترجمان ٹھیٹھ پنجابی میں شکایت یا درخواست پیش کرتا جس میں دعاؤں اور خوشامدانہ الفاظ کی میناکاری بھی ہوتی تھی۔ وہ بات یوں شروع کرتا "جناب یا حضور ہم سخت تکلیف میں ہیں۔ آپ غریب پرور ہیں اور آپ ہی ہم غریبوں کی مدد فرما سکتے ہیں"۔ ایسی گفتگو جاری رہتی اور حرف مدعا بیان کرنے سے وہ برابر گریز کرتے رہتے تھے کیونکہ اپنا مدعا جلد بیان کرنا شاید ان کی نظر میں بدتمیزی ہو چنانچہ وہ اس سے مسلسل گریز کرتے رہتے تھے۔ کچھ دیر بعد اسی مجمعے سے ایک اور شخص ترجمان سے بڑے اخلاق سے اختلافات کرتے ہوئے اور کسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے دخل اندازی کرتا اور کہتا "نہیں' حضور خوب سمجھتے ہیں۔ وہ خود اتنے سیانے ہیں کہ ہماری مشکلات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ وہ اس ڈیوڑھے موگے کو جس کے لئے ہم جاہل ان پڑھ جاٹ درخواست کر رہے ہیں' خود ہی دگنا کر دیں گے۔"

یہ کسان معزز' پرکشش اور ساتھ ہی ساتھ چالاک اور زیرک لوگ ہوا کرتے تھے۔ صدیوں کے جور و ستم نے انہیں منکسر المزاج بنا دیا تھا۔ وہ اپنا مطلب بیان کرنے سے پہلے ایک لمبی تمہید میں اپنی تکالیف بیان کرتے تھے۔ اس سے متعلقہ افسر کا کام اور مشکل ہو جاتا تھا۔ افسر کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ایسے بیان کو کتنا قبول کرے اور کتنا مسترد کر دے۔ دوسروں کے ساتھ ناانصافی سے بچنے کے لئے ایسے بیانات میں کٹوتی ضروری ہوتی تھی۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کا بے جا فخر تھا جس میں کچھ شیخی کا عنصر بھی تھا۔ میرے ایک چچیرے بھائی نے ایک واقعہ سنایا جو ان کے افتخار کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ وہ ایک نوجوان مجسٹریٹ تھا جو ایک گاؤں کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے بھینس سے متعلق تنازعے پر دو شخص پیش ہوئے۔ ان میں سے ایک کا بیان تھا کہ گاؤں سے باہر جاتے وقت وہ اپنی بھینس دوسرے فریق کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو فریق ثانی نے بھینس واپس دینے سے انکار کر دیا۔ میرا یہ چچیرا بھائی دفتری کاروائی کی بجائے فریقین میں مصالحت

کرانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں سے پوچھا کیا وہ مصالحت پسند کریں گے یا مقدمے بازی۔ مقدمے کے لئے انہیں کئی پیشیاں بھگتنی پڑیں گی جن کے لئے انہیں شہر بھی جانا پڑے گا۔
پیشیوں کے لئے بار بار شہر جانے اور وکیلوں کے اخراجات برداشت کرنے کے خیال نے ان پر بڑا اثر ڈالا اور دوسرے فریق نے یہ قبول کر لیا کہ بھینس واقعی فریق اول یعنی مدعی نے اس کے پاس چھوڑی تھی۔ اس وقت بھینس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے بھینس کی خوب دیکھ بھال کی اور اب اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اگر وہ اپنے مالک کے پاس رہتی تو کب کی مر چکی ہوتی۔ اب وہ بھینس واپس نہ کرنے پر حق بجانب تھا۔ اور وہ بھینس صرف اس وقت واپس کرے گا جب وہ بھینس کی دیکھ بھال پر خرچ کی ہوئی رقم اسے ادا نہ کر دے۔ اس کے مقابلے میں یہ زیادہ معقول بات ہو گی کہ اصل مالک بھینس اس قیمت پر اسے بیچ دے جو بھینس کو اسے حوالے کرتے وقت تھی۔ چنانچہ اب معاملہ بھینس کی مناسب قیمت طے کرنے پر پہنچ گیا۔
اصل مالک نے بھینس کی وہ قیمت طلب کی جو موجودہ مالک کی نظر میں بہت زیادہ ہو اور دوسرا اسے ادا نہ کر سکے۔ بھینس کی قیمت سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ اصلی مالک یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا کہ دوسرے کے پاس دو سو روپے نہیں ہیں۔ اس نے میرے چچیرے بھائی کو بتایا کہ دوسرے فریق نے اپنی مونگ پھلی کی فصل دو سو روپے میں بیچی ہے۔ وہ پہلا کسان تھا جس نے مونگ پھلی کاشت کی تھی اور اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے اور وہ محکمہ زراعت کے توقع سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس کو یہ بات کھا گئی کہ مجسٹریٹ کے سامنے اس کی فصل کو برا کہا جائے اور سارا گاؤں سنے کہ اس کی اتنی اچھی فصل کی قیمت اسے صرف تین سو روپے ملی جب کہ اصل میں اس نے یہ فصل چھ سو روپے میں بیچی تھی۔ یہ ہتک تھی اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا "حضور یہ شخص جھوٹا ہے۔ میری فصل اتنی کمزور نہیں تھی جتنی یہ شخص سمجھتا ہے۔ میں نے چنے نہیں مونگ پھلی کاشت کی تھی۔ مجھے اس سے دوگنی رقم ملی ہے جتنی کہ یہ جھوٹا بتا رہا ہے۔ یہ لیجئے اس کی بھینس کے دو سو روپے۔ میں اپنی فصل کی برائی نہیں سن سکتا"۔ یوں مونگ پھلی بونے والے کسان نے اصرار کر کے بھینس کی پوری قیمت ادا کر دی کیونکہ وہ اپنے زراعتی افتخار کو کم ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔
مغربی پنجاب کے کسان کبھی کبھی تشدد پر بھی اتر آتے تھے اور محکمہ انہار کے افسروں

کو ان سے معاملہ کرتے وقت بڑا محتاط رویہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ پانی ہی ان کی زندگی تھا۔ ایسے بنجر اور خشک علاقے کو جہاں بارش بہت کم ہوتی تھی نہروں نے سرسبز بنا دیا تھا۔ بارش تو خدا کی مرضی سے ہوتی تھی اور وہ بھی کبھی بہت زیادہ اور کبھی بہت کم اور کوئی بھی خدا کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی مرضی کے مطابق بارش طلب نہیں کر سکتا تھا لیکن پانی مانگنے کے لئے وہ نہر کے افسر کے پاس ضرور جا سکتا تھا۔ یوں پانی کی ابدی ضرورت ہر وقت موجود رہتی تھی۔
تین چار گھنٹوں میں صرف دس میل فاصلہ طے کر کے ہم ڈاک بنگلے پہنچ جاتے تھے۔ پچھلے دور کے بعد سے ویران بنگلے میں بڑی سرگرمی نظر آنے لگتی تھی۔ اونٹوں کا قافلہ ہم سے کئی گھنٹے پہلے پہنچ چکا ہوتا تھا اور کیمپ میں معمول کی زندگی شروع ہو چکی ہوتی تھی۔ میرے والد کا دفتر ویسے ہی نظر آتا جیسا کہ وہ کالونی میں ہوتا تھا۔ سونے کے کمرے تیار ہو چکے ہوتے اور کھانے کے کمرے میں کھانا ہمارا منتظر ہوتا تھا۔ کنویں کے ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے جگ اور ٹب غسل خانے میں تیار ملتے تھے۔ ہر کمرے میں پھول ہوتے تھے اور مالی اپنی مہارت کے ثبوت میں پھلوں اور سبزیوں کی ٹوکریاں بھی رکھ دیتے تھے۔ چوکیدار، کلرک، چپڑاسی وغیرہ اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے۔ اس طرح پورے کیمپ میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ ہمارے لئے یہ فخر کا باعث تھا کہ کیمپ کی پوری زندگی ہمارے والد کے گرد گھوم رہی ہے۔
گرمیوں کے دنوں میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد نیند آنے لگتی تھی اور ہم سو جاتے تھے۔ کھانا تو وہی شخص پکاتا تھا جو گھر میں پکاتا تھا اور گو وہ اتنا اچھا تو نہیں ہوتا تھا مگر گھر والے کھانے سے زیادہ لذیذ لگتا تھا۔ دوپہر کے بعد جب ہمارے والد اپنے کام میں مصروف ہوتے تھے اور بے شمار لوگوں سے باری باری ملاقات کر رہے ہوتے تھے تو ہم کیمپ میں ادھر ادھر جھانکتے پھرتے تھے یا پاس کی چھوٹی نہر میں تیرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ نہر کی گہرائی ہمارے لئے مناسب ہوتی تھی۔ ہم کم گدلے پانی میں غوطے لگاتے تھے اور گاؤں کے لڑکے ہمیں تعجب سے دیکھتے تھے۔ جلد ہی وہ اپنے کپڑے اتار کر اور اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پکڑ کر ہوا میں اچھل کر پانی میں کود پڑتے تھے۔ وہ پیدائشی غوطہ خور اور تیراک ہوتے تھے۔
دوسرے دن ہمارے والد جلد ہی اپنا کام شروع کر دیتے تھے۔ گرمیوں کے دنوں میں تو وہ صبح پانچ بجے ہی اٹھ جاتے تھے اور چھ بجے معائنے کے لئے نکل جاتے تھے۔ وہ تانگے یا گھوڑے پر جاتے تھے اور ان جگہوں اور موقعوں کو دیکھتے تھے جن کے بارے میں کسانوں کو

شکایت ہوتی تھی۔ وہ آٹھ یا نو بجے واپس آ جاتے اور ایک بجے تک دفتر میں کام کرتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے اور آرام کے بعد وہ چار سے سات بجے تک کام کرتے تھے اور اس کے بعد سیر کے لئے یا پھر کوئی اور موقعہ دیکھنے نکل جاتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ گھنٹہ بر کام کرتے۔ جب گھڑیال دس بجاتا اور بتیاں بجھ جاتیں تو کیمپ نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ گرمیوں کی راتوں کو ہم چھت پر سوتے تھے۔ اس وقت ہماری دنیا ہماری ہوتی تھی اور ہمارے اوپر صرف آسمان ہوتا تھا۔ نہ درخت نظر آتے تھے اور نہ عمارتیں صرف آسمان ہی آسمان سامنے ہوتا تھا جس کا چاند کے بغیر راتوں میں رنگ سیاہ ہوتا تھا اور اس میں بیشمار تارے لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہمارے چاروں اطراف پورا علاقہ ایک سیاہ رنگ کی طشتری کی طرح پھیلا ہوا ہوتا تھا ——— سپاٹ اور لامحدود۔ صرف قریبی دیہاتوں سے آنے والی آوازیں یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دیتی تھی۔ جھینگروں کی لگاتار آوازیں اور قریب ٹھوکر سے پانی کے گرنے کی اور پیاسے کھیتوں کے طرف اس کے دوڑنے کی آواز اس خاموشی میں جذب ہو جاتی۔ خشک اور چٹیل علاقے میں آبشار کی طرح بہتے ہوئے پانی کی آواز وہ موسیقی تھی جسے نہروں نے پیدا کیا تھا۔

چوتھا باب

جن کسان بچوں میں پل کر میں بڑا ہوا وہ غیر معمولی بچے تھے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے ہوتے تھے اور ان میں بڑی خود اعتمادی تھی۔ وہ نڈر تھے اور درختوں سے ہی چھلانگیں نہیں لگایا کرتے تھے بلکہ درختوں کی ٹہنیوں کو پکڑ کر وہ نہر میں کود جاتے۔ بڑوں کی طرح گالیاں دیتے ہوئے بھینسوں کے ریوڑ کو ہانک لے جاتے اور اپنے سروں پر پگڑیاں باندھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی خوراک بڑی سادہ تھی جو دودھ' دہی' مکھن' مکی یا گندم کی روٹی' پکی ہوئی سبزیاں' گڑ اور گنے پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس میں تبدیلی تو کبھی کبھار ہوتی تھی مگر یہ بڑی صحت مند غذا تھی۔ خشک موسم میں جب سبزیاں نہیں ہوتی تھیں تو کسان دن کے وقت لسی' مکھن' روٹی اور نمک پر گزارہ کرتے تھے تو رات کا کھانے دال اور روٹی ہوتی تھی۔ رات کی باسی روٹی' مکھن اور لسی ان کا ناشتہ تھا۔

بڑے ہو کر کچھ بچے تو فوج میں چلے جاتے باقی کاشت کاری کرتے۔ بہت کم لوگ شہر کا رخ کرتے تھے۔ ان کا بچپن ایک طرح سے مختصر ہوتا تھا کہ تین یا چار سال کی عمر میں وہ کام پر لگ جاتے تھے خواہ یہ گھوڑے کو پانی پلانا یا مویشی چرانا ہی کیوں نہ ہو۔ شام کو وہ گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے تھے۔ کبڈی میں لڑکے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ میدان میں ایک سیدھی لائن لگا کر دونوں ٹیمیں اس کے دونوں طرف کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ایک ٹیم میں سے ایک لڑکا لائن عبور کر کے کبڈی کبڈی کہتا ہوا دوسری ٹیم کی طرف بھاگ کر جاتا تھا اور ان میں سے کسی ایک لڑکے کو چھو کر کبڈی کبڈی کہتا ہوا واپس اپنی ٹیم میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔ دوسری ٹیم اسے روکنے کی کوشش کرتی تھی۔ اگر لائن واپس عبور کرنے سے پہلے اس کی سانس ٹوٹ جائے تو وہ ٹیم سے باہر ہو جاتا تھا اور اگر وہ سانس ٹوٹنے سے پہلے لائن عبور کر جائے تو دوسری ٹیم کا وہ لڑکا جسے اس نے چھوا تھا ٹیم سے باہر ہو جاتا تھا۔ مالش کے بعد کشتی دوسری ورزش تھی۔

چھوٹی عمر میں تو لڑکے لڑکیاں سب مل کر کھیلتے تھے جو اچھلنا کودنا ہی ہوتا تھا۔ لڑکوں کو جلد ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ لڑکے ہیں اور وہ لڑکیوں سے ملنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور اگر کوئی

زم کاٹھ کا لڑکا لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے پر ضد کرتا تو لڑکیاں باتیں سنا کر یا تھپڑوں سے تواضع کر کے اسے بھگا دیتیں تھیں۔ لڑکے بڑی خود اعتمادی سے جوان مردوں میں بدل جاتے تھے اور لڑکیاں بھی بڑے بانک پن سے خود اعتماد پنجابی عورتوں میں بدل جاتی تھیں۔ دیہاتوں میں پردے کا رواج نہیں تھا اور دیہات کی عورتیں آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں۔ اگر کنویں پر کسی لڑکی کی اپنے ساتھ کھیلنے والے کسی لڑکے سے اتفاقیہ ملاقات ہو جاتی تو دونوں شرما جاتے تھے۔ دونوں کو اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوتا تھا کہ وہ لڑکی جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتا اور اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچتا تھا اب بڑی ہو گئی ہے اور اس کے جسم میں گداز گولایاں ابھر آئی ہیں۔ پہلے وہ نظریں ملا کر بات کرتی تھی اب بات کرتے وقت زمین کی طرف دیکھتی رہتی ہے یا منہ دوسری طرف کر کے دوسری لڑکیوں کو دیکھتی ہے جس پر وہ لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس دیتیں تھیں۔ ادھر' وہ لڑکا جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھی اور اس کا منہ نوچا کرتی تھی اب بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے جسم کے کونے نکل آئے ہیں اور اس کی آواز بھی بھاری ہو گئی ہے۔ لڑکی کے لئے کنویں سے پانی کھینچنے کے لئے لڑکا بے چین ہوتا تھا جب کہ دونوں ہی کنویں سے ڈول کھینچ سکتے تھے۔ کبھی لڑکوں اور لڑکیوں میں دل لگی بھی ہو جاتی تھی اور اگر اس میں لڑکے لڑکیاں شامل ہوں تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر لڑکے اور لڑکی کی آنکھیں چار ہو جاتیں اور کوئی انفرادی دلچسپی پیدا ہوتی نظر آ جاتی تو کوئی نہ کوئی ان کے والدین کو اطلاع کر دیتا تھا۔ والدین اسے اشارہ سمجھتے کہ اب لڑکی کی شادی کر دینی چاہئے۔ کوئی پڑوسن لڑکی کی ماں کو کہتی "تمہاری لڑکی اب جوان ہو گئی ہے۔ کسی اچھے گھر میں اس کا رشتہ کر دو"۔ نسبت کے لئے بڑا اچھا لفظ منگنی (مانگنے سے) ہے۔ خریف کی فصل کٹنے کے بعد سال کے اندر ہی آنے والی سردیوں میں عموماً اس لڑکی کی شادی ہو جاتی تھی۔

جب لڑکی کی منگنی ہو جاتی تھی تو لڑکے اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیتے تھے۔ اپنے گھر میں اور اس کی سہیلیوں میں اس کی حیثیت بدل جاتی تھی۔ پانی بھرنے کے لئے جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ نکلتی تھی تو اس کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ وہ سب کچھ سنتی تھی لیکن منہ سے کچھ نہ بولتی تھی کیونکہ بولنا بے حیائی تصور کیا جاتا تھا۔ اگر لڑکا اسی گاؤں کا ہوتا تو سب نے اسے دیکھ لیا ہوتا تھا۔ اگر وہ کسی دوسرے گاؤں کا ہوتا تو لڑکی نے اسے دیکھا بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کی سہیلیاں لڑکے کو کبھی بھوت اور کبھی شہزادہ کہہ کر تنگ کرتیں۔ لڑکی خود اتنی سادہ ہوتی کہ بھوت کے نام سے ڈر

جاتی اور شہزادے کا نام سن کر وہ کھل اٹھتی تھی۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے جدا ہو کر دوسرے گاؤں میں رہنے کے خیال سے وہ رو پڑتی تھی تو اس کی سہیلیاں اسے تسلی دیتیں۔ تم فکر نہ کرو وہ مضبوط اور لمبا ہے اور خوبصورت ہے۔ اپنی پگڑی پر کلغی لگا کر آئے گا اور تمہیں اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لے گا اور جب تم اس کو پکڑ کر بیٹھ جاؤ گی تو وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر تمہیں بھگا لے جائے گا۔ ہمیں پتہ ہے کہ تم روؤ گی لیکن جلد ہی تم اپنا رونا اور ہمیں بھی بھول جاؤ گی۔ کچھ دنوں بعد وہ تمہیں واپس لائے گا لیکن تم بہت کچھ بھول چکی ہو گی۔ وہ اس لڑکی کو واپس نہیں لا سکے گا جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر تم ہمارے ساتھ نہ تو کھیلو گی اور نہ ہی یہ بتاؤ گی کہ تم دونوں کے درمیان کیا ہوا۔ پھر تم کبھی کبھار آیا کرو گی۔ ایک دن تم پھولی ہوئی اور بھاری بھاری آؤ گی اور انتظار کرو گی کہ تمہاری قمیض کا دامن بھی بھر جائے۔ "بند کرو یہ بکواس ــــ تمہیں تو شرم بھی نہیں آتی" شرم کے مارے سرخ ہوتی ہوئی لیکن جذبات سے مغلوب لڑکی کہتی جس کی منگنی ہو چکی ہوتی تھی۔ احتجاجاً وہ یہ بھی پوچھتی "تم سب کو یہ کیسے معلوم ہے۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں۔ تم سب جھوٹی ہو"۔ اس قسم کی دل لگی میں اس کی سہیلیوں کے اپنے خواب بھی شامل ہوتے تھے۔ ان کی سہیلی کی منگنی ہو چکی ہے اور ان کی بھی باری آنے والی ہے۔ ماؤں کے بہت قریب رہنے کی وجہ سے لڑکیوں کو پتہ ہوتا ہے کہ گھر والوں سے ان کی جدائی ناگزیر ہے۔ مائیں غصے میں یا تنبیہہ کے طور پر یا پیار سے اس بات کی طرف اشارے کرتی تھیں۔ اگر لڑکی سے ہنڈیا جل جائے یا سلائی کرتے وقت کوئی ٹانکا چھوٹ جائے تو ماں کہتی "وہ لوگ کیا کہیں گے؟ کیا یہی کچھ میں نے تمہیں سکھایا ہے"؟ ماں اور باپ دونوں "وہ لوگ" ہی کہتے۔ یعنی وہ لوگ جو ایک دن آ کر تمہیں لے جائیں گے۔ وہ لوگ جن کی تم ملکیت ہو' وہ لوگ جن کو پال پوس کے تمہیں سونپ دیا جائے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے اور ہم نے ہاں کہہ دی ہے۔ اب سے یہ ان کی ہے۔ اس طرح ابھی سے وہ دوسرے خاندان کا حصہ بن جاتی ہے۔ اگر کوئی اس لڑکی کی توہین کرتا تو وہ لوگ خود ہی بھالے اور لاٹھیاں لے کر آتے اور انتقام لیتے۔ اگر خاندان بڑا ہو اور توہین بھی کچھ زیادہ ہو تو اس بات پر قتل بھی ہو جاتے تھے۔ اور اگر اس کے اپنے لوگوں نے بدلہ نہ لیا ہو تو وہ بھی ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ اگر لڑکے والوں کو شک پڑتا کہ لڑکی کے والدین نے لڑکی کی پرورش ٹھیک سے نہیں کی اور اس کا پورا پورا خیال نہیں رکھا یا یہ کہ لڑکی کا اپنا چال چلن ٹھیک نہیں تو منگنی ٹوٹ بھی جاتی

تھی۔ ایسی لڑکیاں ننگ خاندان سمجھی جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں بہتر خیال کیا جاتا تھا کہ
شگن یعنی منگنی کے وقت لئے گئے تحفے تحائف لوٹا دیئے جائیں۔

غیر شادی شدہ جوڑوں میں ناجائز تعلقات بہت کم ہوا کرتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تھا تو
دونوں کے لئے ایک ہی راستہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں بھاگ جائیں لیکن اس میں بڑا خطرہ تھا۔
جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ دونوں غائب ہیں تو لوگ گھوڑوں پر چڑھ کر ان کا پیچھا کریں
گے۔ اس چٹیل زمین پر چھپنے کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ بالوں سے پکڑ کر لڑکی کو گھسیٹتے
ہوئے گھر واپس لایا جاتا تھا تاکہ اسے سبق سکھایا جائے۔ پرانے زمانے میں اس کے بال
کاٹ دیئے جاتے تھے یا منہ کالا کیا جاتا تھا۔ غصے میں بھرا ہوا اس کا بھائی یا باپ اسے قتل
بھی کر سکتا تھا۔ بچپن کی شادیوں کی وجہ سے شادی سے پہلے کی محبت کے امکانات بھی شاذ
ہی تھے۔ دوشیزگی کو مقدس خیال کیا جاتا تھا اور اس کے ضائع ہونے سے پیشتر ہی شادی کر
دی جاتی تھی۔ شادی شدہ عورت اور شادی شدہ مرد کے درمیان ناجائز تعلقات نسبتاً زیادہ
ہوتے تھے اور ملاقاتیں گنے یا باجرے کے کھیت میں ہوتی تھیں۔ ایسے واقعات بہت کم تھے
لیکن ناممکن نہیں تھے اور اکثر جرائم کا سبب بنتے تھے۔ برافروختہ شوہر کلہاڑا یا کسی لے کر
مجرم کی تلاش میں نکل جاتا تھا اور اکثر موقعے پر ہی اس کے ٹکڑے کر دیتا تھا اور بیوی کو
بھی جرم کا اقبال کرنے پر یا اس کی ڈھٹائی پر قتل کر دیتا تھا۔

کبھی کبھی زنا بالجبر اور اغوا کے واقعات بھی ہو جاتے تھے لیکن ایسے واقعات میں بعض
اوقات عورت کی مرضی شامل ہوتی تھی۔ پکڑے جانے پر اسے زنا بالجبر کی شکل دے دی
جاتی تھی۔ بھاگ جانے پر اگر عورت اپنا ارادہ بدل دے تو معاملہ اغوا کی شکل اختیار کر لیتا
تھا۔ عشق میں مبتلا ہو کر شوہر کو زہر دے دینا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ علاقے میں زہر
خورانی کی باتیں عام تھیں۔ شادی شدہ عورت آزادی حاصل کرنے کے لئے کسی بوڑھی
عورت کی مدد سے اپنے شوہر کو زہر دے دیتی تھی تاکہ اپنے آشنا سے شادی کر سکے۔ بعض
اوقات آشنا ہی شوہر کو قتل کر دیتا تھا۔ اس زرخیز زمین پر جو ویسے تو بڑی پر امن تھی، قوی
الباہ کسان نسل کی جذباتی فطرت کا رخ عشق بازی کی سازشوں، زہر خورانی اور جادو اور
ٹونے ٹوٹکوں کی طرف ہو جاتا تھا۔

اس علاقے کے موسموں کی طرح یہاں کے لوگوں کا مزاج بھی بدلتا رہتا تھا۔ گرمیوں
کے جھلسا دینے والے سورج کے نیچے جب درجہ حرارت ایک سو بیس ڈگری فارن ہائٹ پر

پہنچتا تھا تو پورا علاقہ گرمی سے ہانپتا تھا۔ سردیوں کی راتوں میں جب سفید دھند چھا جاتی تھی
تو درجہ حرارت بیس درجے تک گر جاتا تھا۔ درجہ حرارت میں سو درجے کے فرق نے
زراعت کے پیشے اور اس سے وابستہ لوگوں کو بڑا سخت جان بنا دیا تھا۔ سردیوں کی راتوں
میں شدید سردی اور پھر کئی دنوں تک بارش اور ہمالیہ سے آنے والی جسم کو چیرتی ہوئی
ہوائیں، ان کے بعد نرم اور سکون افزا بہار آ جاتی تھی جس میں گرمی کا تھوڑا سا عنصر ہوتا
تھا جو گرمیوں کے موسم میں اپنے عروج پر پہنچ جاتا تھا جس کی شدت سے انسان اور حیوان
ہانپنا شروع کر دیتے تھے۔ بارشوں کے بعد کچھ سکون ملتا تھا۔ بارشوں کے بعد خزاں کا دور
شروع ہوتا تھا جس میں سردیوں کے آثار نظر آتے تھے۔ اس کی صبحیں تازہ ہوتی تھیں اور
شامیں خوشگوار اور خنک۔ اس طرح ہمارے پنجاب میں پانچ موسم تھے: سردی، بہار، گرمی،
بارش اور خزاں۔

ایک کسان کی امیدوں اور محنت کا نقطہ عروج خریف کی فصل ہوتی ہے۔ پورے
پورے خاندان فصلوں کی کٹائی، گاہنے اور بھوسے سے اناج کو علیحدہ کرنے میں کئی کئی دنوں
تک جتے رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر پتلی لمبی عورتیں تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس
وقت ان کی چھاتیاں اوپر کو اٹھی ہوتی ہیں کیونکہ چھاجوں کو پکڑے ہوئے ان کے بازو سر
سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں۔ رقص کی ابتدائی حرکت کی طرح جو پیروں سے شروع ہو کر اوپر
کی طرف پورے جسم سے گزرتی ہوئی ان کی انگلیوں کی پوروں پر جا کر رکتی ہے، یہ عورتیں
ایسی ہی حرکت کے ساتھ چھاجوں کو ذرا سا سامنے جھکا کر اسے ہوا میں گھنٹی بجانے کے
انداز میں آہستہ آہستہ لہراتی تھیں۔ بھوسے کو ہوا اڑا کر دور لے جاتی تھی اور اناج زمین پر
گرتا رہتا تھا۔ جب سامنے سے ہوا کا زور پڑتا تھا تو ان کے کپڑے پیچھے کی طرف اڑتے
ہوئے بدن سے چپک جاتے تھے اور ان کے لچکیلے بدن کے سارے خطوط واضح ہو جاتے
تھے۔ کئی دوسرے مناظر کے مقابلے میں یہ منظر کہیں زیادہ دلچسپ اور حسین ہوتا ہے سوائے
اس منظر کے جب یہ عورتیں کنویں سے پانی بھر کر گھڑا سر پر اٹھائے بل کھاتی ہوئی
پگڈنڈیوں پر چلتی تھیں اور آپس میں باتیں بھی کرتی جاتی تھیں، ہنستی بھی تھیں اور ننگے
پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اسے نکالنے کے لئے رکتی بھی تھیں۔ ان کے جسم کسی تال پر
جھولتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بازو آگے پیچھے حرکت کرتے تھے لیکن مجال ہے
کہ پانی کی ایک بوند بھی گرنے پائے۔ ایک اور بھی منظر تھا جو مردوں کے لئے بڑا دلچسپ
تھا۔ یہ مردوں کے لئے عورتوں کا بھتہ یعنی دوپہر کا کھانا لے کر جانا تھا۔ اپنے شوہروں کے

لئے سرکنڈوں کی چوڑی ٹوکری میں دسترخوان میں لپٹی ہوئی تندور کی موٹی موٹی فطیری روٹیاں' پکی ہوئی سبزی اور ٹوکری کے عین اوپر چھوٹی سی مٹکی میں لسی لے کر کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ بھوکے اور تھکے ہوئے مرد عورتوں کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ دور ہی سے ان کو پہچان لیتے تھے اور گردن موڑ موڑ کر انہیں دیکھتے تھے۔ جب وہ نزدیک آتی تھیں تو مرد اپنا کام روک دیتا تھا اور اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے درخت کے نیچے کنویں کی طرف چل دیتا تھا۔ وہ بیلوں کو پانی پلاتا اور ان کے آگے چارہ ڈال کر خود ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھ جاتا۔ اس کی بیوی اس کے سامنے بیٹھ کر اسے کھانا کھلاتی تھی لیکن خود کھانے میں شریک نہ ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ گھر جا کر اکیلی ہی کھانا کھاتی تھی۔ مرد خاموشی سے کھانا کھاتا رہتا تھا اور اس دوران اس کی بیوی اس دن پیش آنے والے گاؤں کے واقعات سناتی رہتی تھی۔ جب مرد پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا تھا تو اس کی بیوی بچا ہوا کھانا اور برتن لے کر گھر کی طرف چل دیتی تھی۔ نہ خدا حافظ اور نہ الوداع۔ فقط مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ وہ کہتی "اچھا میں چل دی آں۔" کسان کا درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھانا' اس کی بیوی کا اس کے پاس بیٹھنا اور بچے کا زمین پر لیٹے رہنا ہماری اردو کی کتاب میں پہلی کہانی ہوتی تھی۔

کٹائی کے بعد جب اناج گھر میں آ جاتا تھا تو پھر فرصت ہی فرصت ہوتی تھی۔ نہری زمینوں میں فصلیں عموماً اچھی ہوتی تھیں کیونکہ بارشوں کی طرح نہر کے پانی میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اب چھوٹے موٹے کاموں کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔ یہ نالے کھودنے' ان کے کنارے ٹھیک کرنے' کنویں یا گھر کی مرمت کرنے' گھوڑا یا بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے یا بیٹی کی شادی کرنے کا وقت ہوتا تھا۔

بیساکھی ایک غیر مذہبی تہوار تھا۔ اسے ہندو' مسلمان اور سکھ سب مناتے تھے۔ اگرچہ یہ صرف کسانوں ہی کا میلہ تھا مگر عرصے سے شہروں میں بھی بیساکھی منائے جانے لگی تھی۔ یہ اگرچہ شکرانے کے طور پر منایا جاتا تھا لیکن اس میں قدرے بدمستی کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ ربیع کی فصل کے بعد کئی مہینوں کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے یہ ایک رنگ رلیاں منانے والی ضیافت تھی۔ یہ میلہ اکثر نہر یا دریا کے کنارے منعقد ہوتا تھا۔ پورے کے پورے خاندان پیدل' گھوڑوں' تانگوں یا بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر پہنچتے تھے۔ مرد نئے کپڑے پہنتے تھے اور سروں پر چمکدار رنگین پگڑیاں باندھتے تھے۔ عورتیں شلوار قمیض پہنتیں تھیں اور ان کے دوپٹے بھی مردوں کی پگڑیوں کی طرح رنگین ہوتے تھے۔ لڑکے اپنے باپ جیسے کپڑے پہنتے اور لڑکیاں اپنے ماؤں جیسے۔ چھوٹے بچوں کے کپڑے خاص قسم

کے ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بیساکھی پر میں نے کس قسم کے کپڑے پہنے تھے۔ میرے سر پر سرخ مخمل کی سنہری کام والی گول ٹوپی اور گلے میں چمکدار دھاریوں والی قمیض تھی۔ میرا پاجامہ سفید تھا جس کے سامنے اور پیچھے بڑے بڑے سوراخ تھے تاکہ میری ماں کو اور پاجامہ اٹھانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ میرے جوتے سرخ رنگ کے کپڑے کے بنے ہوئے تھے اور ان پر سنہری طلائی کام تھا۔ نئے ہونے کی وجہ سے جوتے مجھے تکلیف بھی دیتے تھے۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ میری ماں کی کیا کیفیت تھی لیکن میں یقیناً بہت خوش تھا۔

میلے میں کسان گروہ در گروہ گھومتے پھرتے تھے۔ کئی تو شراب پئے ہوتے تھے اور کئی خواہ انہوں نے صرف اپنے مونچھیں ہی گیلی کی ہوں' ظاہر کرتے کہ انہیں چڑھی ہوئی ہے۔ یہ لوگ چوہے کی تال اور الغوزے کی دھن پر بھنگڑا ڈالتے تھے۔ چوہا لکڑی کا ہوتا تھا جو ایک ڈنڈے پر رسی کے ذریعے اوپر نیچے حرکت کرتا تھا اور ٹخ ٹخ کی آواز پیدا کرتا تھا۔ ساز صرف یہ چوہا' ڈھول اور الغوزہ ہوتے تھے۔ جب وہ گول دائرے میں ناچتے تھے تو سازوں کی اس کمی کو جاٹ اپنی طاقت اور مردانگی سے پورا کر دیتے تھے۔ الغوزی کی دھن ایک لمبی اور وہی ہوتی تھی۔ اس کے اختتام پر سب ایک نعرہ لگاتے تھے اور وہ پھر اور وہی دوہرائی جاتی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ ان مردوں کی ابتدائی حرکات زنانہ بلکہ زنخوں جیسی ہوتی تھیں۔ وہ عورتوں کے اناج سے بھوسا الگ کرنے کے انداز میں اپنے بازو اوپر اٹھا کر رقص شروع کرتے تھے۔ پھر کبھی دایاں پاؤں آگے بڑھاتے تھے اور کبھی بایاں۔ یوں وہ تال پر آگے پیچھے ہوتے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بائیں ہاتھ سے اپنے اپنے ڈھیلے ڈھالے تہمدوں کو پکڑ لیتے تھے جبکہ دایاں بازو اوپر اٹھا رہتا تھا اور وہ صرف ہاتھ کو بڑے خوبصورت طریقے سے نیچے کی طرف جھکا دیتے تھے۔ الغوزے کی نرم سی دھن پر وہ لچکدار اور بل کھاتے ہوئے بدن کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے ناچتے تھے۔ لیکن جب جنتری اچانک اونچے سر پر پہنچتی تھی تو وہ ایک زور دار نعرہ لگاتے تھے اور اس کے ساتھ ان کے بدنوں سے طاقتور مردانہ اور گھومتا ہوا رقص پھوٹ پڑتا تھا۔ داڑھیوں اور مضبوط جسموں والے سکھ اور مسلمان جب ناچتے تھے تو پہلے تو بڑا مضحکہ خیز لگتا تھا لیکن جلد ہی یہ ایک خوبصورت رقص میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ مضحکے کا یہ عنصر دانستہ ہوتا ہے۔ لفظ بھنگڑے سے مراد ہی ایسی خوشی ہے جس میں شور اور ہنگامہ ہو۔

بہت برسوں بعد اس رقص کو بھی ریپبلک ڈے پر عوامی رقصوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ پٹیالے کی ایک ٹیم نے پورے ملک کا دورہ کیا اور دیکھا کہ اگرچہ کئی دوسرے رقصوں

میں فن کاری بہت زیادہ تھی لیکن پھر بھی بھنگڑا بڑا مقبول ہوا۔ بمبئی کے ایک ڈرائنگ روم میں میں نے بھنگڑا دیکھا تھا۔ ناچنے والے لمبے اور خوبصورت لوگ تھے۔ ان کی داڑھیاں مضبوطی سے بندھی ہوئی تھیں اور کپڑے بڑے بھڑکیلے تھے۔ زنانہ قسم کی حرکات سے ان کے رقص کا آغاز کرنا بڑا عجیب لگتا تھا۔ رد عمل معلوم کرنے کے لئے میں لوگوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خواتین جلد ہی رقص کے طلسم کی لپیٹ میں آ گئیں جبکہ مردوں پر اس کا اثر کم ہوا۔

دھیما آغاز اور اس کے بعد فاتحانہ اور معنی خیز طاقتور نعرے بڑے دلکش تھے۔ یہ خیال کہ یہ لہراتے ہوئے مرد ایک لمحے تو اتنے نرم اور دوسرے لمحے اتنے توانا اور طاقتور ہو سکتے ہیں، خواتین میں انگیخت پیدا کرتا تھا اور یہی اس رقص کا مقصد تھا۔

میلہ دریا کے ریتلے کناروں پر لگتا تھا۔ بانس اور بوریوں سے بنی ہوئی سینکڑوں دوکانیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ان میں مختلف قسم کی چیزیں ہوتی تھیں۔ رنگ برنگی مٹھائیوں کی دکانیں زیادہ ہوتی تھیں۔ دریا میں ایک رسمی غوطے کے بعد ہم پکنک کی قسم کا کھانا کھاتے تھے اور پھر میلہ دیکھنے اور پیسے خرچ کرنے کے لئے چل پڑتے تھے۔ رنگین چوڑیوں، منکوں کی مالاؤں، منہ دیکھنے والے آئینوں اور خوشبودار تیل اور تعیش کے سامان کی دکانوں سے عورتوں کو ہٹانے یا علیحدہ کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ پرندے، جانور اور گاڑیوں کے کھلونوں کو دیکھ کر بچے بڑے خوش ہوتے تھے۔ چابی والے جاپانی کھلونے ابھی ہمارے ہاں نہیں پہنچے تھے۔ دکانوں کی شہری سلیقہ مندی کو دیکھنے کے لئے مرد ادھر ادھر گھومتے تھے۔ دوکاندار انہیں عیار نظروں سے دیکھتے تھے اور انہیں دکانوں کے اندر کھینچ لینے کی کوششیں کرتے تھے۔

میلے میں اور بھی بڑی پرکشش چیزیں ہوتی تھیں۔ بڑے چکروں والے آسمانی جھولے، بازی گر، ہنڈولے، شعبدہ باز، جانوروں جیسے ریچھ، بندر، سانپ، نیولے وغیرہ کو سدھانے والے لوگ، دوائیاں بیچنے والے لوگ۔ یہ سب بڑی دل جمعی سے اپنی مہارتیں دکھاتے تھے۔ ایک دندان ساز اپنی گفتگو سے اپنے سننے والوں کو مسحور کر لیتا تھا اور صحت مند دانت بھی بغیر درد کے نکال دیتا تھا۔ دانت نکالنے کی ضرورت تھی یا نہیں اس سے بحث نہیں ہوتی تھی البتہ دانت نکالنے کی مہارت کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا۔ کوئی عینک ساز کسی بوڑھے شخص کو عینک بنا دیتا تھا۔ ایسا کرنے میں صرف دو یا تین شیشوں کو آزمانے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ عینک ساز پوچھتا کہ صاف نظر آ رہا ہے کہ نہیں۔ اس کے ہاں کتنے

پر پرانے شیشوں سے وہ اسے ایک عینک بنا کر دے دیتا تھا۔ کوئی جادوگر دوائی کے چند قطروں سے آنکھ کی تمام بیماریوں کے علاج کرنے کا دعویٰ کرتا تھا۔ ان قطروں کا لازمی نتیجہ آنکھوں میں چبھتا ہوا شدید درد ہوتا تھا۔ مریض کافی دیر تک درد سے تڑپتا تھا لیکن اردگرد کھڑے ہوئے لوگ دوا کا اثر دیکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ درد کم ہونے پر جب مریض آنکھیں کھولتا تو روشنی دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوتا تھا اور اعلان کرتا تھا کہ اس کی نظر پہلے کبھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ گولی یا پڑیا سے علاج کرنے والا کوئی نیم حکیم اپنے سننے والوں کو یہ باور کراتا تھا کہ ان میں ہر شخص بیمار ہے۔ اس پر ایک کسان یہ کہتا کہ پانی کا نالا کھودتے وقت جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے تو اسے چکر آتے ہیں یا اس کی کمر دکھتی ہے۔ دوسرا بولتا کہ جب وہ پاخانہ کرتا ہے تو اس کا پیشاب بھی ساتھ ہی نکل جاتا ہے۔ اس پر یہ نیم حکیم سب کو للکارتا کہ ان چہروں سے پتہ لگتا ہے کہ ان میں ہر شخص اسی مرض کا شکار ہے اور سب سامعین اس تکلیف کا اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک اور اتائی ڈاکٹر عورتوں کے امراض کا ماہر ہونے کا دعوے کرتا تھا اور اس بات سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوتا تھا کہ اُس کی باتیں سننے والے سب مرد ہیں۔ وہ ان کو زیادہ آسانی سے باور کرا سکتا تھا کہ ان سب کی بیویاں کسی مرض میں مبتلا ہیں اور وہ بڑی خاموشی سے اس مرض کو برداشت کر رہی ہیں۔

تعویذ گنڈوں اور نجومیوں کی بھی اپنی مارکیٹ تھی لیکن ان میں سب سے زیادہ عجیب و غریب وہ شخص تھا جو سانڈوں، مگرمچھ کے بچوں، سانپوں اور جانوروں کی کھوپڑیوں کی نمائش کرتا تھا۔ تیل سے بھری ہوئی ایک بڑی سی طشتری میں وہ ان سب چیزوں کو رکھتا تھا اور تیل سے چھوٹی چھوٹی بوتلیں بھر کر وہ اپنے گاہکوں کو دیتا تھا۔

مردوں کی مرغوب ترین جگہ اکھاڑا تھی جہاں ہر شخص کشتی لڑ سکتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ کشتی پیشہ ور پہلوانوں کی ہوتی تھی۔ کبڈی، بازو پکڑنا اور گتکا کھیلنا دوسرے کھیل تھے۔ گتکے میں ایک شخص صرف ایک چھوٹے سے ڈنڈے سے کئی مردوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ پھر گھڑ دوڑ ہوتی تھی جس میں یہ سارے جاٹ گھوڑوں اور ٹٹوؤں کو دوڑاتے تھے اور رفتار سے نہیں بلکہ جوش اور جذبے میں آ کر نعرے لگاتے تھے۔ بھاٹ اور عشقیہ شاعری کرنے والے نظمیں سناتے تھے۔ تفریح مہیا کرنے والے پیشہ ور سوانگ بھرتے تھے، نقلیں کرتے تھے اور مزاحیہ ناٹک کرتے تھے۔ گھنگروؤں کی آواز کے ساتھ کسی شعر یا خاص ادا پر لوگ ناچنے والیوں پر پیسوں کی بارش کر دیتے تھے۔ جب یہ ناچنے والیاں محبت بھری نظروں سے مردوں کو دیکھتیں یا دلربائی سے اپنے رومال ہلاتیں تھیں تو اکثر کسانوں کو محسوس ہوتا

تھا کہ اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ لا کر انہوں نے بڑی غلطی کی ہے جو ابھی تو خریداری میں
مصروف ہوں گی لیکن جلد ہی ان کے سروں پر سوار ہو جائیں گی۔

جب موسم بہار کی یہ دوپہر ڈھلنے لگتی تو تھکے ماندے کسان اپنے اپنے گاؤں کو لوٹنا
شروع کرتے۔ دریا کے ریتیلے پاٹ میں چوں چوں کرتی بیل گاڑیوں کو ہانپتے اور پھنکارتے
ہوئے بیل کھینچتے تھے۔ فصل کے پکنے کے دوران اور کٹائی تک سبزیوں کو پانی دینے یا نہانے
اور کپڑے دھونے کے لئے حوض بھرنے کے علاوہ ان بیلوں کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ فصل
کی گوڈی کرتے وقت بھی تو ان بیلوں کو کھلیاں میں صرف آرام سے چکر ہی لگانے ہوتے
تھے۔ چونکہ مردوں کو بھی فرصت ہوتی تھی اس لئے بیل بھی خوب آرام کرتے تھے۔ کٹائی
اور بھس کے بڑے بڑے گٹھے منڈی میں پہنچانے کے بعد شادیوں کا موسم شروع ہو جاتا تھا۔
اس کے بعد ان کا کام صرف اگلی فصل کے لئے ہل چلانا تھا۔

شادیوں کا موسم آتے ہی پورا علاقہ ڈھول کی آواز سے گونجنے لگتا تھا۔ رنگ برنگے
کپڑے پہنے عورتیں اور بچے بیل گاڑیوں میں ٹھنسے ہوئے جلوس کی شکلوں میں چلتے تھے
اور ان کے ساتھ' پیدل یا گھوڑوں پر سوار' آپس مین دل لگیاں کرتے' اونچی اونچی آوازوں
میں باتیں کرتے اور دیہات کی سڑکوں پر دھول اڑاتے ہوئے مرد ہر جگہ یہ عام نظارہ تھا۔
بری طرح بھوکے مہمان شادی والے گھر پہنچ جاتے تھے۔ اگر وہ بہت زیادہ کھا لیتے تو لوگ
مذاق کرتے ان کے گھروں پر انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ لیکن ایسی بارات جو پیٹ بھر کر
کھانا نہیں کھاتی تھی' انہیں لوگ تنگ مزاج کہتے تھے۔ میزبان ان باتوں کو مذاق میں ٹال
دیتے تھے۔ مہمان کھانا نگلنے میں آپس میں مقابلے کرتے تھے۔ کھانا ہضم کرنے کے لئے
دونوں کھانوں کے درمیان وہ اکثر ورزش کرتے تھے یا کھیل کھیلتے تھے تاکہ اگلے کھانے کے
ساتھ وہ پورا انصاف کر سکیں۔ آنے والوں میں سے طاقتور نوجوان میزبانوں کو کشتی یا مختلف
زور آزمائی والے کھیلوں میں مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ ہر پارٹی اپنے اپنے گاؤں کی
عزت و وقار کی حفاظت کرتی تھی۔ شام کو شراب کا دور چلتا تھا اور ناچنے گانے والیاں بھی
پہنچ جاتی تھیں۔ داستانیں بیان کی جاتی تھیں اور اپنے اپنے گھروں' کھیتوں اور مویشیوں کے
بارے میں بڑیں ہانکی جاتی تھیں۔ میزبان جواب نہیں دے سکتا تھا اور اپنے آپ پر پورا
ضبط رکھتا تھا۔ ان کی طرف داری گاؤں کے میراثی یعنی پیشہ ور مسخرے کرتے تھے۔ روایت
کے لحاظ سے انہیں کھلی چھٹی تھی کہ وہ مہمانوں پر اپنی زبان سے چرکے لگائیں۔

شادی کے تیسرے دن دلہن کا جہیز بند کیا جاتا تھا اور دلہن کو ڈولی میں ڈال کر بیل
گاڑیوں اور گھوڑوں کا جلوس واپس چل پڑتا تھا۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس پندرہ سال کی دلہن
اپنا گھر بار چھوڑنے پر روتی اور آہیں بھرتی۔ انجانے کھیتوں اور راستوں پر دولتی ہوئی پالکی
میں جب تنہائی اسے آن دبوچتی تو وہ سہیلیوں اور والدین کے دیئے ہوئے دلاسے بھول
جاتی۔ جب بارات واپس اپنے گاؤں پہنچتی تو عورتوں کا ایک جلوس دلہن کے استقبال کے
لئے اور اسے دعائیں دینے کے لئے منتظر ہوتا۔ وہ عورتیں پالکی کا پردہ اٹھا دیتیں اور دلہن کا
گھونگھٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتیں۔ اگر دلہن خوبصورت ہوتی تو اس کی خوب تعریفیں کی
جاتیں اور اسے چاند سے تشبیہ دی جاتی اور اگر وہ سادی سی لڑکی ہوتی تو تعریف تو کی جاتی
مگر دل سے نہیں اور اس سے ان کی رائے کا بھی پتہ چل جاتا۔ اسی اثنا میں دلہن بھی آنکھ
چرا کر دیکھ لیتی کہ اس کا دولہا کیسا ہے۔

جب استقبال کا عمل ختم ہو جاتا تو خوب پیٹ بھر کر کھانے والے مہمان اپنی نیند کی
کمی پوری کرنے کے لئے بستروں پر لیٹ جاتے تھے تو یہ چھوٹی سی دھڑکتی ہوئی سرخ گٹھڑی
اندرونی کمرے میں پہنچا دی جاتی جہاں اس کا دولہا بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا
ہوتا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے دولہا کی ماں کہتی "بیٹا اس کا خیال رکھنا۔"

شادیوں کے ہنگاموں کے بعد لوگ اپنا غلہ بیچنے منڈیوں کو جانا شروع کرتے۔ بہت سارا
کام تو پہلے ہی ہو چکا ہوتا تھا۔ ساہوکار سے معاملات پہلے ہی طے ہو جاتے تھے اور شادیوں
کے لئے رقمیں پہلے ہی اکٹھی کی جا چکی ہوتیں تھیں۔ سال کا کام ختم ہو جانے پر فرصت کی
فضا ہوتی تھی۔ بہار ختم ہو جاتی تھی۔ سورج ہر روز جلدی نکلنے لگتا تھا اور دیر سے غروب
ہونے لگتا تھا۔ دن گرم ہونے لگتے تھے گو راتیں ابھی بھی خوشگوار ہوتیں۔ گرمیوں کے
عنوانات کے ساتھ لوگ سونے کے لئے پہلے برآمدوں میں آ جاتے' پھر کھلے صحن میں اور
آخر میں اپنی چارپائیاں چھتوں پر لے جاتے تھے۔ چاندنی راتوں میں پورا علاقہ طلسماتی اور
موہوم سا لگتا تھا۔ اگر کبھی چاندنی رات کو آنکھ کھلتی تو چاند آپ کو بڑے قریب سے جھانکتا
ہوا نظر آتا۔ چھتوں پر سوئے ہوئے لوگوں کو چاند ساری رات دیکھتا تھا۔ چاند کی بے جا
مداخلت پر اپنے شوہر کے بازوؤں میں دلہن اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتی کہ وہ بھی اس کے
جسم کو دیکھ رہا ہے جس کے متعلق اس نے ابھی ابھی نیا شعور حاصل کرنا شروع کیا ہے۔
شاعری مین چاند ہمیشہ مذکر ہی رہا ہے۔ روایت کے مطابق چاند نے اپنی ماں کو نہاتے ہوئے
دیکھ لیا تھا اس لئے اسے شراپ ملا کہ وہ ابد تک جاگتا رہے۔ اس کا بھائی سورج زیادہ حیا

والا تھا۔ اسے ماں نے دعا دی تھی کہ وہ ہر رات کو سو جایا کرے۔ تاہم لوگوں کے لئے چاند زیادہ منظور نظر تھا شاید اپنی دلبری کے لئے۔ مائیں اب بھی اپنے بچوں کو چاند سے چہرے والا کہتی ہیں۔ شاعر اپنی محبوبہ کو بادلوں میں گھرے ہوئے چاند سے تشبیہ دیتا ہے جس کی سیاہ زلفیں بادلوں کے تکیے پر پریشان ہوں۔

جب راتیں گرم اور خاموش ہو جاتیں اور گرمیوں کا موسم عین اپنے عروج پر ہوتا تو آندھیاں شروع ہو جاتیں تھیں اور کبھی کبھی ان کے ساتھ ہلکی سی بونداباندی بھی ہو جاتی تھی۔ اس وقت ہر شخص چونک اٹھتا' گاؤں کے سب گھروں کی چھتوں پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور نیند میں مدہوش لوگ اپنے اپنے بستر لے کر لڑکھڑاتے ہوئے اپنے گھروں کے برآمدوں میں آ جاتے تھے۔

دھندلے آسمان کے نیچے پورا علاقہ گرمی سے جھلس جاتا تھا۔ اونچے اونچے گرد اڑاتے ہوئے بگولے زمین پر بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ پتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے۔ مویشی کسی سائے میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور کسان کنویں کے قریب پیپل کی چھاؤں میں پناہ لے لیتے تھے۔ یہ کڑی آزمائش کے دن ہوا کرتے تھے۔ صحت مند اور توانا لوگ بھی گرمی کی شدت سے نڈھال ہو جاتے تھے۔ مویشی بظاہر کسی بیماری کے بغیر مر جاتے تھے۔ دن گرم سے گرم تر ہونے لگتے اور لوگ محسوس کرنے لگتے کہ اب یہ گرمی ان کی برداشت سے باہر ہے۔ مختلف رنگوں کی آندھیاں اچانک ہی چلنا شروع کر دیتیں۔ ان کا رنگ عموماً بھورا ہوتا لیکن کبھی یہ سیاہ اور سرخ رنگ کی بھی ہوتی تھیں۔ سیاہ آندھیوں سے لوگ ڈر جاتے تھے۔ دوپہر کی سفید روشنی اندھیرے میں بدل جاتی تھی اور آدمی صرف چند قدم دور تک ہی دیکھ سکتا تھا۔ سرخ آندھیاں خونیں نظر آتی تھیں اور لوگوں کو وہ بڑا خوف زدہ کرتی تھیں۔ پیلی آندھیوں میں ایک خوفناک عنبر رنگ نظر آتا تھا۔

جب زمین مزید گرمی برداشت نہ کر سکتی' پیاس سے مٹی تڑخ جاتی' جب ہوا اتنی خشک ہو جاتی کہ پانی کا پورا گھڑا پینے کے بعد بھی پیشانی پر پسینے کے صرف چند قطرے نمودار ہوتے تو ان دنوں کسی روز افق پر گہرے بادل چھا جاتے تھے اور گرد آلود ہواؤں کی جگہ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی تھیں جن میں مٹی کی سوندھی خوشبو ہوا کرتی تھی۔ آسمان پر سفید حاشیوں والے سیاہ بادل چھا جاتے تھے اور ایسے لگتا تھا جیسے کوئی فوج حملہ آور ہو رہی ہے۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی چمک دار دھاریوں سے آسمان پھٹتا دکھائی دیتا تھا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے پہلے آہستہ آہستہ اکا دکا اور پھر یک دم تیزی سے گرنا شروع کر

دیتے تھے۔ پھر موسلا دھار بارش کا سماں بندھ جاتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ شیشے کی لمبی لمبی سوئیاں زمین کو چھید رہی ہوں۔ بارش پھٹی ہوئی زمین پر اتنا شور مچاتی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسے لگتا کہ بارش کا یہ طوفان زمین پر کوڑے برسا رہا ہے اور زمین بھی اس سے محظوظ ہو رہی ہو۔ برسوں پرانے بڑے بڑے درخت گر جاتے تھے اور بعض اوقات گرتے وقت ان مویشیوں اور آدمیوں کو بھی اپنی زد میں لے لیتے تھے جنہوں نے ان کے نیچے پناہ لی ہوتی تھی۔ سرخی مائل بھورے رنگ کی ندیاں شور مچاتی ہوئی ہر جگہ چل نکلتی تھیں۔ آہستہ آہستہ طوفان کا زور کم ہونے لگتا تھا اور بارش آہستہ ہو جاتی تھی۔ جیسے جیسے طوفان کا زور کم ہوتا اور اس کی گھن گرج دور مغرب سے آنے لگتی تو لوگ خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ شام ہوتے ہی مینڈک شور مچانا شروع کر دیتے تھے اور پانی کی نالیوں کے کناروں پر سبزہ دکھائی دینے لگتا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں تھیں۔ کسان کہتے "زمین کو وتر آگیا ہے۔" یعنی مٹی کو مناسب مقدار میں نمی میسر آگئی ہے اور تھوڑی سی دھوپ کے بعد اس میں ہل چلایا جا سکے گا۔ یہ بھیگا بھیگا موسم تین چار دن رہتا تھا۔ ان دنوں ایک صبح جب نیلے آسمان میں سورج جگمگا رہا ہوتا اور اس کے اردگرد بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر اڑ رہے ہوتے تو کسان اپنے اپنے ہل اٹھا کر بیلوں کو ہانکتے ہوئے' سادہ دیہاتی گیت گنگناتے ہوئے اپنے اپنے کھیتوں کی طرف چل دیتے تھے۔ اب زمین میں آسانی سے ہل چل سکتے تھے اور بڑے ڈھیلے بڑی آسانی سے ٹوٹ جاتے تھے۔ یوں نمود کا اگلا چکر شروع ہو جاتا تھا۔

ساون بارشوں کا شاعرانہ مہینہ ہوتا ہے۔ یہ نہروں اور دریاؤں کے کنارے پکنک منانے کا موسم ہوتا ہے۔ بڑی پارٹیاں تیرنے کے لئے چل پڑتیں اور اپنا کھانا باہر ہی پکاتی ہیں۔ ساون کے بادل دوستوں کی طرح پیش آتے تھے اور ان میں نمو آور نمی ہوتی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ دریاؤں میں سیلاب بھی آیا کرتے تھے جو کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے لیکن ساتھ ہی سیلابی زرخیز مٹی کی ایک تہ بھی چھوڑ جاتے تھے۔ خشک سالی' سیلاب اور ٹڈی دل کے خلاف پنجاب کے کسان ایک نرم سی شکایت کرتے تھے۔ اگر خدا دیتا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہے اور اگر نہیں دیتا تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اسے وقتی طور پر روک رکھا ہے۔ یہ کسان' کیا ہندو اور کیا مسلمان' کوئی خاص مذہبی لوگ تو نہیں تھے مگر یہ خدا سے ڈرتے ضرور تھے۔ نہروں نے ان کی زندگی سے بے یقینی کی کیفیت ختم کر دی تھی اور اسے ایک تیقن فراہم کر دیا تھا۔ نہریں افراط کا باعث بھی بنیں' ایسی افراط جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تاہم بروقت بارش کے لئے وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ وہ

بڑے قانع تھے۔

بارش کے ختم ہو جانے پر بھی سورج خوب چمکتا تھا لیکن اتنا غضبناک نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ طلوع ہوتے وقت نیچے نیچے جاتا تھا دن چھوٹے ہونے لگتے تھے۔ صبحیں زیادہ خنک ہو جاتی تھیں اور لگتا تھا کہ ان کی یہ ہلکی خنکی سردی میں بدلنے والی ہے۔ بارش آنے پر چھتوں کو چھوڑ کر برآمدے میں پناہ لینے والوں کو برآمدے بھی ٹھنڈے لگتے تھے۔ بڑے بڑے صندوقوں سے پہلے کمبل اور پھر لحاف باہر نکلنا شروع کرتے تھے۔ بیماریوں کا بھی یہی موسم تھا۔ کھڑے پانی میں پیدا ہونے والے مچھر ملیریے کا سبب بنتے تھے۔ ملیریا میں مبتلا لوگ سردی سے کپکپاتے تھے۔ ان کا جسم دکھتا تھا اور پھر گرم ہو جاتا تھا اور پھر پسینہ آنے لگتا تھا۔ بعض دفعہ روزانہ بخار آتا تھا اور بعض دفعہ ایک دن چھوڑ کر۔ ملیریا جوانوں اور بوڑھوں سے اپنا سالانہ خراج وصول کرتا تھا۔

خزاں میں ٹھنڈک تو بڑھ جاتی تھی لیکن درختوں سے پتے نہیں گرتے تھے۔ پتے سرما کے آخر میں گرتے تھے۔ خزاں دراصل گرمیوں کا سردیوں میں تبدیل ہونے کے درمیان کا موسم تھا۔ کسی دن شمال سے اچانک سرد ہوائیں چلنے لگتی تھیں۔ یہ اس وقت شروع ہوتیں جب ہمالیہ پر برف گرنے لگتی تھی۔ پنجاب کا بہترین موسم سردی کا موسم ہی ہے۔ گرمی سے بے حال جسم میں سردی زندگی کی لہر دوبارہ دوڑا دیتی تھی۔ صبحیں ٹھنڈی اور دھندلی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی صبح کے وقت کہرا بھی چھا جاتا تھا۔ برتنوں میں پانی جم جاتا تھا۔ دھند میں نکلتے وقت سورج ایک بہت بڑا سنگترہ سا لگتا تھا۔ سورج جب ذرا اونچا ہوتا اور گرمی بڑھ جاتی تو دھند چھٹنا شروع کرتی تھی۔ دن بلور کی طرح شفاف ہوتے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کو نرم دھوپ کے حوالے کر دیتا تھا۔ کھیتوں میں بڑا کام باقی رہتا کیوں کہ ان دنوں کئی فصلیں بوئی جاتی تھیں۔ گنا تو نومبر کے شروع ہوتے ہی تیار ہو جاتا تھا لیکن گندم، جو، سرسوں، چنے، مٹر سردیوں میں پکتے تھے۔ یہی فصلیں منڈیوں میں لائی جاتی تھیں۔ اس موسم میں پورا پنجاب حسین دکھائی دیتا تھا۔ ہر طرف سرسبز لہلہاتے کھیت نظر آتے تھے۔ کنویں سے سیراب ہونے والے ایک کھیت میں چار چار فصلیں اکٹھی اگائی جاتی تھیں۔

جب مرد کھیتوں میں نشہ آور ہواؤں میں کام کر رہے ہوتے تھے تو عورتیں ان کے لئے کھانا تیار کرنے سے پہلے تھوڑی دیر چرخہ کاتتے اور کشیدہ کاری میں مصروف رہتیں اور ساتھ گیت بھی گاتیں تھیں۔ وہ پھلکاریوں پر کشیدہ کاری کرتی تھیں۔ پھلکاری کا مطلب ہے پھول کا کام۔ کھڈیوں پر بنے ہوئے کپاس کے سرخ کپڑوں سے پھلکاریاں بنتی تھیں۔ ان پر

ریشمی سرخ، سبز اور نیلے رنگوں کے ریشمی تاگوں سے کشیدہ کاری کی جاتی تھی۔ ان میں لمبے آڑے تاگوں سے اقلیدسی ڈیزائن بنائے جاتے تھے۔ باغ نام کی پھلکاری واقعی بڑی خوبصورت ہوتی تھی۔ اس پر سنہری کا کام ہوتا تھا اور دونوں پلوؤں پر سرخ رنگ کا بارڈر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک پھلکاری بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے۔ پھلکاریاں بیچی نہیں جاتی تھیں بلکہ ماں سے بیٹی کو منتقل ہوتی تھیں۔ شادی کے مبارک دنوں میں انہیں شال کی طرح اوڑھا جاتا تھا۔

اس موسم میں بھوک خوب لگتی تھی۔ یہ مرغن غذاؤں کا زمانہ ہوتا تھا۔ دہی، لسی، تندور کی روٹی اور سرسوں کا ساگ پنجابیوں کی مرغوب غذا تھی ساگ میں عورتیں خوب گھی ڈالتی تھیں اور مکی کی روٹی پر تازہ مکھن کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھ دیتی تھیں۔ یہ مردوں کو خوب کھلانے پلانے کا موسم تھا۔ تازہ گڑ جس میں پستہ بادام وغیرہ ملائے جاتے تھے لوگوں کو بڑا مرغوب تھا۔ گھی، چینی اور چنے کا آٹا برابر مقدار میں ڈال کر بنائی ہوئی پنیاں سردیوں کے لئے ضروری خیال کی جاتی تھیں۔ یہ پنجاب کی خاص مٹھائی تھی۔ بوڑھی عورتیں جوان عورتوں سے کہتیں "انہیں خوب کھلاؤ اور طاقتور بناؤ"۔ اور جب مردوں کے پاس رضائی میں جوان عورتیں گھس جاتیں تو وہ محسوس کرتیں کہ خوراک نے ان کے مرد کو نئی جوانی اور رجولیت دے دی ہے۔ مویشیوں کی اور گھوڑوں کی نسل کشی کا بھی یہی موسم ہوتا تھا۔

سردیوں میں بحیرہ عرب سے کچھ دنوں کے لئے تھوڑی سی مانسون ہوائیں چلتی تھیں جو سردی کو ذرا کم کرنے میں بڑی سازگار ہوتی تھیں۔ کئی دنوں تک آسمان پر بڑے نیچے بادل چھائے رہتے تھے۔ ہوا مرطوب ٹھٹھرا دینے والی ہو جاتی تھی لیکن کسان بڑے خوش ہوتے تھے کیونکہ یہ ہوائیں فصلوں کو نمی پہنچاتی تھیں۔ جب سورج دوبارہ چمکنا شروع کرتا تو گندم اور سرسوں کھیتوں میں کھڑی لہلاتی تھیں۔ لہلہاتی ہوئی سبز گندم سرسوں کے پیلے پھولوں سے عجب تقابل پیدا کرتی تھیں۔ خواہ ایک ہی دن کا ہو یہ نظارہ ایسا ہے جس کو دیکھنے کے لئے میں ہمیشہ ترستا ہوں۔ ان لوگوں کی طرح جو پہاڑوں، وادیوں یا سمندر کے کنارے سے اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں میں بھی پنجاب کو لوٹ جانا چاہتا ہوں تاکہ میں نمو کے کثیر رنگوں میں رنگے ہوئے ہموار کھیتوں کو دیکھ سکوں جن میں کئی قسم کے سبز رنگ تھے۔ مرچوں کے کھیت کا سبز رنگ، گندم کے کھیت کا سبز رنگ، دھان، چنے، سرسوں، کپاس اور سن یعنی سنگوڑے کا سبز رنگ۔

جب گندم پیلی ہونے لگتی اور سرسوں کے پھول سفید ہو کر پھلیوں میں تبدیل ہو کر بیج

بنے لگتے تو سردیوں کا زور ٹوٹ جاتا تھا۔ سورج گرم ہونا شروع کرتا اور ہر روز طلوع کے وقت اونچے سے اونچا ہونا شروع کر دیتا تھا۔ بسنت کے تہوار سے موسم بہار کا استقبال کیا جاتا تھا۔ پکی گندم' سرسوں کے پیلے پھول' چنوں اور مٹروں کی پکی پھلیاں' کپاس کے پیلے پھول اور قدرت کی وہ تمام عنایات جو پیلاہٹ میں شمار ہوتی تھیں' ان سب کی خوشی میں عورتیں اپنی اوڑھنیاں اور مرد اپنی پگڑیاں پیلے رنگ میں رنگ لیتے تھے۔ مٹھایاں بھی جیسے پیلا حلوہ اس پیلے رنگ میں ہوتی تھیں۔ سردیاں چلی گئیں۔ اب فصلوں کو کوئی خطرہ نہیں اور یہ آرام سے پک جائیں گی۔ جب کٹائی ختم ہو گی اور فصل گھر میں آ جائے گی تو پھر بیساکھی کا ہنگامہ خیز تہوار آئے گا۔

درخت بھی بہار کے رنگوں میں رنگ ملا دیتے تھے۔ وہ اپنے پتے گرا دیتے تھے۔ کورل کی ننگی شاخوں سے پھولوں کے زرد گچھے پھوٹ پڑتے تھے۔ ڈھاک کی جسے جنگل کا شعلہ بھی کہتے ہیں' شاخیں مخملیں گلابی پھولوں سے لد جاتیں تھیں' ہندوستان کا لیبرنیم جسے املتاس کہتے ہیں' پیلے پھولوں سے زر فشاں ہوتا تھا اور اس کے پھول جھرنوں کی طرح نیچے کی طرف بہتے ہوئے نظر آتے تھے' سرس کے اونچے اونچے درخت اپنے برش جیسے چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ساتھ یہ سب پیشتر اس کے کہ موسم گرما اپنی مرجھا دینے والی انگلیاں پھیلائے' اپنے رنگ پھیلانے کی آخری دلیرانہ کوشش کرتے تھے۔

مذہبی ادب کے علاوہ ہماری پنجابی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ کئی صدیوں تک مسلمان عہد میں فارسی ہی مروج تھی۔ سکھوں کے ہاں بھی فارسی ہی رائج تھی۔ سنسکرت حروف میں ترمیم کر کے سکھوں نے پنجاب رسم الخط ایجاد کیا اور یوں گرو گرنتھ صاحب فارسی رسم الخط میں لکھے جانے کی بے حرمتی سے بچ گیا۔ فارسی رسم الخط مسلمانوں کا تھا جن کے خلاف سکھوں نے بغاوت کی تھی۔ اس چیز کے باوجود ثقافت اور ابلاغ کے لئے فارسی مستعمل رہی۔ پڑھے لکھے پنجابیوں کی دو زبانیں تھیں۔ بولتے وہ پنجابی تھے لیکن لکھنے پڑھنے کا کام وہ فارسی میں کرتے تھے۔

یو پی اور دھلی سے انگریز اپنے ساتھ اردو لائے اور اسے فارسی کی جگہ دے دی گئی۔ ان کی آمد پر انگریزی زبان کا رواج بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں ذریعہ تعلیم انگریزی اور اردو بن گئیں۔ عربی اور سنسکرت کی طرح فارسی بھی کلاسیکی زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ ہمیں ان تینوں زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ میں دس سال کی عمر تک

انگریزی اور فارسی سیکھ رہا تھا۔ میرا نصاب تعلیم اردو میں تھا اور میں بولتا پنجابی تھا۔ سرکاری کام کاج دونوں زبانوں میں ہوتا تھا ـــــــــ بالائی سطح پر انگریزی میں اور اس سے نیچے اردو میں۔ ضلعی سطح حد فاصل تھی۔ میرے والد جب ضلعی سطح پر تھے تو ان کے پاس انگریزی کے لئے سٹینوگرافر اور اردو کے لئے منشی تھا۔

دیو ناگری رسم الخط میں ہندی لکھنے کا رواج بعد میں پڑا۔ ہندی صرف براہمنوں اور ہماری خواتین تک محدود تھی۔ خواتین میں ہندی کا رواج آریا سماج کے زیر اثر شروع ہوا۔ ہماری خواتین میں تعلیم کی ابتدا ہندی سے ہی ہوتی تھی۔ اس بنا پر بڑی دلچسپ صورت احوال پیدا ہو جاتی تھی۔ میری ماں کی نسل میں ایسی خواتین بھی تھیں جو صرف ہندی جانتی تھی اور جب وہ اپنے شوہروں سے دور ہوتی تھیں تو وہ انہیں ہندی میں خط لکھتی تھیں۔ شوہر صرف اردو یا انگریزی میں خط لکھ سکتے تھے۔ ہماری نسل کے درمیانہ طبقے کی لڑکیوں نے یہ مسئلہ انگریزی پڑھ کر حل کر لیا۔ اپنے والدین کی طرح گھر میں شوہر کے ساتھ پنجابی بولتی تھیں لیکن ان کی خط و کتابت انگریزی میں ہوتی تھی۔ اس طرح ہماری لڑکیاں سہ زبانی ہو گئیں۔ وہ بولتی پنجابی تھی' اپنی ماؤں کو خط ہندی میں لکھتی تھیں اور شوہروں کو انگریزی میں۔

ابتدائی برسوں میں انگریز بھی سہ زبانی ہوتے تھے۔ مغرب زدہ پنجابیوں سے وہ انگریزی میں بات کرتے تھے' کم تعلیم یافتہ سے اردو میں اور رعایا سے پنجابی میں۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی انگریزی ایک تعلیم یافتہ پنجابی جانتا تھا اس سے کہیں زیادہ اردو اور بالعموم پنجابی انگریز افسر جانتا تھا۔ اس سے انگریزوں لیکن بالخصوص پنجابیوں کو بڑا فائدہ ہوا۔ پنجابیوں کا اردو یا پنجابی بولنا انہیں ایک توازن فراہم تھا جسے اس وقت شدید نقصان پہنچا جب مغربیت کا اولین دور آیا۔ اس سے صرف وہی لوگ عہدا برا ہو سکتے تھے جنہیں انگریزی ثقافت اور زبان پر عبور حاصل ہو۔ پہلے اردو اور پھر انگریزی جاننا غلط قسم کی ذہنی برتری بن گیا تھا۔ پنجابی گھروں' خواتین اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس سے پنجابی کی سلاست کو بہت نقصان پہنچا۔ میرے زمانے تک پنجابی میں اردو اس حد تک داخل ہو چکی تھی کہ سوائے حروف جار اور افعال کے اختتام کے پنجابی زبان اردو بن چکی تھی۔ قدرے زیادہ پڑھے لکھے ایک قدم اور آگے چلے گئے ان کی زبان تھوڑی پنجابی' تھوڑی اردو اور کچھ انگریزی کا ملغوبہ بن گئی۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ اپنی زبان کے نہ ہونے اور بغیر رسم الخط کے ایک قصباتی قسم کی زبان نے جس میں اتنی کثیر ملاوٹ ہو' پنجابی کیریکٹر پر کیا اثرات

مرتب کیے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس امر سے پنجابی وہ کچھ بن گئے جو وہ آج ہیں یا نظر آتے ہیں وہ ضرورت سے زیادہ متمدن نہ ہو سکے مگر انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہوں پر منتقل ہونے میں سہولت رہی۔

پنجابی دلچسپ زبان ہے غیر ترقی یافتہ' بیباک اور توانا۔ جب یو پی کے بابو پنجاب آئے اور اپنی شستہ زبان اور شائستہ اطوار اپنے ساتھ لائے تو ہم پنجابیوں نے اپنے آپ کو گنوار محسوس کیا ایک پنجابی اپنے آپ کو بیل' جاٹ یا گنوار کہے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے ایک بڑ میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ بغیر کسی جھجک کے اور ہمیشہ بڑی صاف گوئی اور پوری استقامت سے وہ اپنے آپ کو کمتر شمار کرے گا۔ بغیر سوچے سمجھے وہ بڑ بھی اسی طرح ہانکے گا جسے یہ عیاں بالذات بیان ہو۔

پنجابی زبان کو مغلظات اور محبت کے اظہار میں سبقت حاصل ہے۔ ان مغلظات کا خاندانی نسب ناموں پر انحصار ہے۔ وہ افشا کن اور ترویج محرمات سے ملوث اصطلاحوں میں پورے خاندان کی تاریخ بیان کر دیتی ہیں۔ میرے والد اپنے ایک رفیق کار کا قصہ سناتے تھے جو پنجابی زبان کے محکمانہ امتحان کے لئے پیش ہوا۔ ممتحن نے اس سے پوچھا کیا وہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ پنجابی گنوار اور اجڈے ہوتے ہیں؟ جواب میں اس امیدوار نے ایسا کہنے والوں کی پنجابی زبان میں وہ ایسی تیسی کہ کہ ممتحن کو اسے روکنا پڑا۔ اس نے کہا کہ اس امیدوار کی کلاسیکی پنجابی میں مہارت محکمانہ ضروریات کے لئے کافی ہے۔

پنجابی زبان اس وقت سننے کے قابل ہوتی ہے جب ایک کسان ہل چلاتے وقت ایک اڑیل بیل کو ہانکتا ہے یا جب ایک ضدی بھینس کو جوہڑ سے نکالتے وقت وہ استعمال کرتا ہے۔ جانور بڑے حوصلے سے اس کے اجداد کے ماضی کے متعلق مغلظات صرف چابک سے دور رہنے کی حد تک سنتا رہتا ہے۔

جب ہمسائی سے لڑائی ہوتی ہے تو بلیغ کلاسیکی پنجابی استعمال ہوتی ہے۔ یہ لڑائیاں ایسا ادارہ ہے جو روزمرہ کی روٹین زندگی سے کچھ راحت کا باعث بنتا ہے۔ ایسی لڑائی صبح کے کام کاج سے فرصت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ فریقین میں سے ایک خواہ وہ زیادتی کا شکار ہو یا خود جرم کی مرتکب ہو' گھر کے سامنے اپنے تھڑے پر آ کر کھڑی ہو جائے گی اور لڑائی کی تیاری کے لئے خود ہی دوسری پارٹی کو آہستہ آہستہ اس وقت تک گالیاں دیتی رہے گی جب تک کہ دوسری پارٹی مقابلے پر نہ اتر آئے۔ ہمسائیاں بھی کام کاج چھوڑ کر اپنے اپنے گھر کی دہلیزوں پر لڑائی دیکھنے کے لئے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ اب لڑائی پوری سنجیدگی سے

شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدائی تو تو میں میں ختم ہو جانے پر جب سامعین دوپہر کے بعد کا تماشہ دیکھنے کے لئے آرام سے بیٹھ جاتی ہیں تو پسپا ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے ماضی سے چھوٹی چھوٹی تفصیلات انتہائی ناخوشگوار رنگوں میں پیش کی جاتی ہیں جیسے ڈاین' اپنے ہی بچے کھانے والی' شوہر کھانے والی' بے حیا' ڈوب مرنے والی اور دوسری ایسی صفات بڑی فراخدلی سے استعمال کی جاتی ہیں۔ سخت ترین الزام کمینے پن کا ہوتا ہے۔ پنجابی زبان میں کمینہ پن گناہ کبیرہ ہے۔ چنانچہ کمینے پن کی سچی یا خیالی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جیسے بچے کی پیدائش' شادی یا موت پر کمینہ پن' ہمسائیوں کے بچوں اور رشتے داروں سے کمینہ پن۔ چنانچہ ہر قسم کے کمینے پن کو ایک خزانے کی طرح سنبھال کر حفاظت سے رکھا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔

دوپہر ڈھلتے ہی لڑائی میں تیزی آ جاتی ہے۔ ہمسائیاں بڑی دلچسپی سے ہمہ تن گوش ہو کر سنتی رہتی ہیں۔ دو ہم عمر عورتوں میں مقابلہ ہمیشہ دلچسپ ہوتا ہے لیکن ایک معمر عورت اور ایک جوان عورت کے درمیان لڑائی بذات خود ایک نادر تجربہ ہوتا ہے جہاں پختہ کاری ناتجربہ کاری سے اور زیرکی پرجوش تند خوئی سے ٹکراتی ہے۔ معمر عورت کے ہر وار سے سامعین آگاہ ہوتی ہیں لیکن دلچسپی اس بات میں ہوتی ہے کہ ایک ناپختہ کار اس کا مقابلہ کیسے کرتی ہے۔ جب جوانی گرفت میں آ جاتی ہے تو بڑھاپے کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ کمزوری معمر عورت کی بد شکلی یا اس کے شوہر کی دوسری عورتوں میں دلچسپی ہے۔

لڑائی مسلسل چلتی رہتی ہے۔ پنجابی زبان اور اس کے روزمرہ کی فصاحت و بلاغت اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے جسے لوگ دنوں تک یاد رکھتے ہیں تاکہ اگلی لڑائی میں وہ پھر کام آ سکے۔ اس لڑائی میں ایک اتفاقیہ وار ایسی جگہ پر بھی لگتا ہے جو مضروب کے یا وار کرنے والی کے سان و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس پر چوٹ کھائی ہوئی عورت پہلے چلاتی ہے اور پھر رونے لگتی ہے۔ کوئی پرانا گھاؤ کھل جاتا ہے اور جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ شکست خوردہ کو دلاسہ دینے کے لئے ہمسائیاں دوڑ پڑتی ہیں اور جنگ جیتنے والی عورت بڑی بے شرمی سے اپنی کھوکھلی فتح کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے۔ جنگ ایسے ڈرامائی انداز میں کبھی کبھار ہی ختم ہوتی ہے۔

جوں جوں دوپہر ڈھلتی ہے اور مردوں کی گھر واپسی کا وقت قریب آتا جاتا ہے لڑائی کا زور کم ہونے لگتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں فریقین میں سے ایک بھاگ کر اندر سے ایک ٹوکری لے آتی ہے اور دروازے پر الٹی رکھ دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ لڑائی

اگلے دن بھی جاری رہے گی۔ اس صورت میں پسپائی ممکن نہیں جب تک کہ فریق ثانی یہ نہ سوچ لے کہ بس کافی ہو گیا ہے۔ اس صورت میں وہ منظر سے ہٹ جاتی ہے۔ گھر میں عورت کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ شوہر کو اس معاملے کی اطلاع دی جائے یا نہ۔ مردوں کو اکثر ایسے معاملوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔

اور اگر عورت مرد کو لڑائی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر ہی لے تو وہ گھر میں افسردگی کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ بسورتی ہوئی وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے۔ گھر میں نہ چراغ جلتا ہے نہ چولہا' نہ کھانا پکتا ہے اور نہ بچے کھاتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ شوہر گھر میں ویرانی دیکھے اور اسے فوراً معلوم ہو جائے کہ گھر میں کچھ ہوا ہے۔ یکدم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ تھوڑی تھوڑی کر کے پوری کہانی سنائی جاتی ہے۔ اکثر مرد لاتعلق رہتے ہیں اور سارے معاملے کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ دوسری عورت کے شوہر سے بات کرتے ہیں۔ دونوں مرد عورتوں کے بارے میں کوئی دانشمندانہ یا ترش قسم کی رائے کا اظہار کرنے کے بعد بات کو ختم کر دیتے ہیں۔

لڑائی جھگڑے کی طرح عشق کے معاملے میں بھی پنجابی زبان بڑی فصیح و بلیغ ہے۔ ہیر رانجھا' سسی پنوں اور سوہنی میہوال اور دوسرے عوامی گیتوں میں عشق کو سادہ لیکن زور دار شاعری میں بیان کیا گیا ہے۔ عوامی گیت ہوں یا کھیت میں ہل چلاتے وقت کسان کی زبان کی برجستگی یا محلے میں لڑتی ہوئی عورتوں کے مغلظات' پنجابی کے جذبات میں ڈوبے ہوئے مقامات وہی ہیں جن کا تعلق زندگی کے حقائق سے ہو۔ وہ فطری اور واضح ہوتے ہیں۔ پنجاب میں محبت اور موت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اپنے قیمتی بیل کو کسان' شریر بچے کو محبت سے اس کی ماں اور عاشق اپنی محبوبہ کو "مرجانیاں" کہتے ہیں۔ ہر بوسے پر محبوبہ بے خودی میں کہتی ہے "ہائے میں مرجاواں۔" فرائیڈ کی خواہش مرگ یعنی موت کی خواہش پنجابی میں بڑی عام ہے۔ محبت میں' نا امیدی میں' ناکامی میں' نقطہ عروج پر' فتح اور شکست میں یعنی زندگی کے ہر مرحلے پر موجود ہے۔

اگرچہ پچھلی صدی میں اردو زبان کی آمد تک پنجابی لکھنے کا رواج نہیں تھا لیکن اس میں زمانوں سے اکٹھی کی ہوئی عوامی کہانیاں' عوامی نظمیں' پریوں کی کہانیاں اور بہادری کے قصے اور پرانی کہانیاں موجود ہیں۔ اگر یہ نظم میں ہوں تو پیشہ وروں کے ذریعے اور اگر نثر میں ہوں تو یہ گھروں میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں۔ پنجاب میں کئی قسم کے بھاٹ ہیں جو اکتارے پر یہ منظوم قصے اپنی اپنی مخصوص طرزوں میں گاتے تھے۔ رات کو والدین یا

بزرگ گھروں میں یا کسی چوک پر اتنی دفعہ یہ کہانیاں سناتے تھے کہ ہمیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ سردی کی راتوں میں ہم رضائیوں میں دبک کر اور صرف اپنا چہرہ باہر نکال کر بیٹھ جاتے تھے لیکن گرمیوں میں چھت پر چارپائیوں پر بیٹھ کر کہانیاں سنتے تھے اور ان کو سنانے والا اپنی مہارت سے ان میں جان ڈال دیتا تھا۔ رواج یہ تھا کہ سامعین ایک دائرہ بنا کر کہانی سننے والے کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے سامعین میں سے ایک لڑکے کو "ہنگورا بھرنے والا" مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ کہانی سنانے والے کا ساتھ دے اور مناسب موقعوں پر وقفے وقفے سے کہے "ہاں" "پھر کیا ہوا" اور اچھا تو شہزادے نے کہا"۔ ہم بچوں میں ہنگورا بھرنے کے لئے مقابلہ ہوا کرتا تھا۔

کہانیاں کئی طرح کی ہوتی تھیں: پریوں کی کہانیاں' مہموں کی کہانیاں۔ ایک کہانی پانی کے اندر جادو کے اثر سے سونے والی شہزادی کی تھی۔ اس محل کی حفاظت سانپ اور چڑیلیں کرتی تھیں۔ ایک کہانی گل بکاولی کی تھی جو ایک طلسماتی پھول کی تلاش پر مبنی تھی۔ پھر بہادری کے کارناموں کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ مزاحیہ کہانیاں بھی ہوتی تھیں۔ بیماری کی ایسی کہانیاں بھی تھیں جس میں بیمار آدمی صرف خاص اور نایاب دوائی سے ہی ٹھیک ہو سکتا تھا۔ سوتیلی ماؤں کی کہانیاں تھیں جو اگر بوڑھی ہوں تو بڑی ظالم اور اگر جوان ہوں تو کسی دوسرے شخص کے عشق میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ پھر چڑیلوں' جنوں اور دیوؤں کی کہانیاں تھیں۔ پرندوں' جانوروں اور شہزادوں کے ساتھیوں کی کہانیاں تھیں۔ کئی کہانیوں میں سوتیلا بھائی ایک غیر معمولی کردار ہوتا تھا جو اپنے بھائیوں کے ساتھ مہم پر جانے کے لئے اصرار کرتا تھا۔ وہ صرف رشتے میں آدھا بھائی نہیں تھا بلکہ وہ واقعی نصف آدمی ہوتا تھا۔ اس کی صرف ایک آنکھ' ایک بازو' ایک ٹانگ یعنی ہر چیز ایک ہی ہوتی تھی اور یہ سب ناتمامیاں اسے مہم پر جانے سے باز نہیں رکھ سکتیں تھیں۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے وہ ان تمام خامیوں کو بڑے مزاحیہ طریقے سے پوری کرتا تھا۔

کہانیاں صرف رات کو ہی سنائی جاتی تھیں۔ یہ کہا جاتا تھا کہ اگر کہانی دن کو سنائی جائے تو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ کہانی نہ سنانے کے لئے یہ حیلہ سازی ہے مگر ہمارے بزرگوں کو اس پر پورا یقین تھا اور وہ صرف رات کو ہی کہانیاں سناتے تھے۔ رات کو سب لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر بخیریت گھروں کو آ جاتے تھے تو بزرگ کہانیاں سناتے تھے۔

ہماری ایک اور تفریح پہیلیاں بوجھنا تھا۔ یہ پہیلیاں یا بجھارتیں خوبصورت شعروں میں

ہوتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کا مقصد ہمیں پیچیدہ رشتے سمجھانا ہوتا تھا۔ رشتے بڑے پیچ دار ہوتے ہیں۔ پنجابی میں ہر رشتے کا نام ہوتا ہے یہاں تک کہ بیوی کے والد کی بہن کے شوہر کے رشتے کا بھی ایک مخصوص نام ہے۔ ہمیں یہ سب سیکھنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات ان بجھارتوں کے حل بڑے سادہ ہوتے تھے جیسے ماں یا والد مگر ان تک پہنچنا بڑا پیچیدہ عمل ہوتا تھا۔ ان کی سادگی ہی ان کی دلکشی کا باعث تھی۔

پانچواں باب

ٹنڈن کشتریوں کی ایک ذیلی ذات ہے۔ کشتریوں کو شمالی ہند میں کھتری کہتے ہیں۔ ہم ٹنڈن کشتریوں کی ان ذیلی شاخوں سے منسلک ہیں جنہیں باہری کہتے ہیں۔ آگے چل کر ان کی پھر باون شاخیں ہو جاتی ہیں۔ انہیں بنجاہی کہتے ہیں۔ اس کے بعد سارن کھتری آتے ہیں۔ پہلے پہلے تو یہ ذیلی ذاتیں قبیلے یا کنبے ہوں گے اور انہوں نے ایک قبائلی ربط کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہو گی۔ ہماری اکثر شادیاں باہریوں میں ہوتی تھیں اور دوسری ذاتوں کی شادیاں ذاتوں کے اندر ہی ہوتی تھیں گو نیچی ذات والی لڑکی کو بیاہ کر لایا جا سکتا تھا لیکن اونچی ذات کی لڑکی کی شادی نچلی ذات میں نہیں ہوتی تھی۔ لڑکے اپنے سے نیچی ذات کی لڑکی سے شادی کر سکتے تھے لیکن لڑکیوں کے لئے ایسا ممکن نہیں تھا۔ چونکہ شادیاں طے کی جاتی تھیں اس لئے ان اصولوں سے انحراف نہیں کیا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ بھی شادیوں پر پابندیاں تھیں۔ ہم کسی دوسرے ٹنڈن خاندان میں شادی نہیں کر سکتے تھے خواہ ان سے ہماری رشتے داری نہ بھی ہو۔ خونی تعلق پر شدید قدغن تھی اس لئے کوئی دور کے ہم جد بھی شادی نہیں کر سکتے تھے۔ تمام ہم جد خواہ ان کا رشتہ کتنا ہی دور کا کیوں نہ ہو آپس میں بہن بھائی تھے۔ دو نسلوں کے اختلاط سے پیدا ہونے والے اثرات سے نسل کو محفوظ رکھنے کے لئے خون کے متعلق یہ احتیاطیں بڑی موثر تھیں۔ اب یہ پابندیاں صرف اس وقت تک ہی موثر ثابت ہوں گی جب تک طے شدہ شادیوں کا رواج ہے۔

ہمارے ہاں ذات پر ناز کرنے کا مطلب مراعات حاصل کرنا یا دوسروں پر حکم چلانا نہیں تھا۔ یہ اصل میں شادیوں اور مہمان داری کے لئے ایک ضابطہ اخلاق تھا۔ کھتریوں کے لئے بیٹی ایک قرض ہوتی ہے جس کا باعزت طریقے سے ادا کرنا لازمی ہے۔ اس کی شادی برابر والی یا اونچی ذات میں کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے جہیز بھی ایک لازمی شرط ہے۔ لڑکی کی شادی کے بعد یہ بھی لازم ہو جاتا تھا کہ اس کے سسرال والوں سے کوئی چیز ہرگز قبول نہ کی جائے۔ والدین، بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کا شادی شدہ بیٹی کے ہاں ٹھہرنا

ممنوع تھا مگر چھوٹے بہن بھائی شادی شدہ بہن کے گھر ٹھہر سکتے تھے۔ جب لڑکی کے میکے والے رشتے دار شادی شدہ لڑکی کو ملنے جاتے تھے تو ان کا لڑکی کے گھر سے کھانا پینا ممنوع تھا اور اگر اس کی ضرورت پڑ ہی جائے تو اس کے لئے کھلے دل سے محتاط ادائیگی ضروری تھی۔ ایک دفعہ ہماری ایک معمر رشتے دار عورت نے بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا اور وہ پورے خاندان میں مذاق بن گیا۔ اپنی شادی شدہ بیٹی کے گھر صرف آدھا دن ٹھہرنے کے بعد وہ ہر اس چیز کی ادائیگی پر مصر تھی جو اس کے استعمال میں آئی تھی جیسے پانی کے گلاس کے لئے ایک آنہ' بیٹھنے کے لئے دری کا کرایہ دو آنے' وغیرہ وغیرہ۔ ہم مذاق کرتے تھے کہ غسل خانہ استعمال کرنے کے لئے اس نے کچھ ادا نہیں کیا۔

بیٹی کی شادی کو کنیا دان کہتے ہیں یعنی بیٹی کو تحفے میں دے دینا۔ یہ ایک مقدس فریضہ ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی کے بعد کوئی چیز واپس لینا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ عملی طور پر ان احتیاطوں کا مقصد یہ ہے کہ لڑکی کے رشتے دار خصوصاً اس کی ماں لڑکی پر مسلط نہ ہو جائے۔ لیکن اصلاح نسل کی دوسری اصلاحوں کی طرح یہ بھی اپنی انتہا کو پہنچ کر بے معنی ہو گئی۔ لڑکیوں کا زیادہ ہونا ایک واضح بدنصیبی سمجھی جاتی ہے۔ ان کی شادیاں ہو جانے کے بعد بھی والدین اور بھائیوں کی طرف سے ان کی حیثیت سے بڑھ کر نقد روپے اور تحفے تحائف کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور اگر لڑکی کا سسرال کائیاں ہو تو لڑکیاں مستقبل بوجھ بن جاتی تھیں۔

ہمارے ہاں مہمان نوازی ایک معاشرتی ذمہ داری ہے اور قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔ اس کے ضابطوں سے ہمیں بچپن سے ہی روشناس کرا دیا جاتا تھا۔ اگر آپ کے گاؤں سے کوئی شخص یا رشتے دار شہر میں وارد ہوتا تھا اور کسی اور کے ہاں ٹھہر جاتا تھا تو یہ آپ کا رسمی فرض بنتا تھا کہ اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کریں۔ آداب کا تقاضا تھا وہ انکار کرے اور کہے وہ جہاں بھی ہیں آپ ہی کا کھاتے ہیں اس لئے آپ کو تکلیف نہیں کرنی چاہئے۔ آپ اصرار کرتے تھے اور وہ انکار۔ لیکن رسمی انکار و اصرار کے بعد بالآخر بڑے شرمیلے طریقے سے وہ مان جاتے تھے۔ جب ان کے دو وقت کے کھانے پر اصرار کیا جاتا تو وہ پھر احتجاج کرتے اور کہتے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہو گی۔ آپ جواب میں کہتے ہم کھتری ہیں سنار نہیں کہ صرف ایک وقت کے کھانے پر آپ کو ٹرخا دیں۔

ان تکلفات کے بعد خواہ انہیں آپ کے گھر کا راستہ معلوم بھی ہو' گھر سے کوئی فرد بالعموم بچوں میں سے کوئی مہمانوں کو لانے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اگر وہ بہت قریبی رشتے

دار ہوں تو عین کھانے کے وقت پہنچتے تھے۔ کھانا کسی میٹھی چیز سے شروع کیا جاتا تھا۔ اس وقت نمک سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ اسے منہ میٹھا کرانا کہتے تھے۔ مہمان اور میزبان کے درمیان تکلفات کی ایک جنگ ہوتی تھی جس میں بظاہر بڑے تکلفات کے بعد آخر مہمان ہی کو شکست قبول کرنی پڑتی تھی۔ عورتیں اور مرد علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے تھے۔ ہماری والدہ اکیلے کھانا کھاتی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم میں سے کوئی مہمانوں کو واپس چھوڑنے کے لئے بھی جاتا تھا۔

جب لڑکے کسی رشتے دار کے ہاں ٹھہرتے تو شہر میں باقی رشتے دار انہیں مدعو کرتے تھے۔ جب ہم واپس آتے تو ہماری والدہ بڑی متجسس ہوتیں اور ایسے سوال کرتی تھیں: کس کس نے ہمیں مدعو کیا؟ اور یہ تسلی کر لیتی تھیں ہر اس شخص نے ہمیں مدعو کیا جسے کرنا چاہئے تھا۔ وہ یہ بھی پوچھتی تھیں کہ ہم نے پورے تکلفات پیش نظر رکھے کہ نہیں۔ کیا ہم نے کھتری اور سنار والی بات کے بعد دعوت قبول کی تھی؟ کیا کھاتے وقت ہم نے کہا تھا کہ ہمیں بھوک نہیں ہے؟ کیا کھانے سے پہلے ہمارا منہ میٹھا کرایا گیا تھا؟ جب میزبان خاتون ہماری پلیٹ میں اور کھانا ڈالنے لگی تھی تو کیا ہم نے اپنے پوری انگلیاں کھول کر اپنی پلیٹ پر ہاتھ رکھ کر انہیں روکا تھا۔ دراصل وہ ان سوالوں سے یہ اطمینان کرنا چاہتی تھیں کہ ہم نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اور ہم بھوکے بھیڑیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ تو نہیں پڑے تھے۔

کھتریوں کے بعد اروڑوں کی ذات آتی تھی۔ یہ لوگ دکاندار اور تجارت پیشہ تھے۔ ان کی اپنی ذیلی ذاتیں تھیں۔ لیکن ان میں اتنی شدید درجہ بندی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی ذات کے اندر رہ کر کسی بھی ذیلی ذات میں شادی کر سکتے تھے لیکن دوسرے ہندوؤں کی طرح ان پر بھی ہم جدی کے اصولوں کا شدید اطلاق ہوتا تھا۔ ان کے ہاں بھی لڑکیوں کی شادی کے متعلق چند کے سوا وہی ضابطے تھے جو ہمارے ہاں تھے لیکن وہ شادیوں میں ادلا بدلا کر لیتے تھے۔ یعنی اپنی لڑکی کے بدلے میں دولہا کی بہن سے اپنے بیٹے کی شادی کر دیتے تھے۔ کھتری اس رواج کو برا سمجھتے تھے۔ اس کی دو وجہیں تھیں: اس میں بیٹی کے جہیز میں سودے بازی کا عنصر داخل ہو سکتا تھا۔ جہاں آپ جہیز دیتے تھے وہاں آپ جہیز وصول بھی کرتے تھے۔ یہ کھتری افتخار کے خلاف تھا۔ عملی وجہ یہ تھی کہ ایک گھر میں ساس اور بہو میں ہر قسم کی غلط فہمی دوسرے گھر پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

کھتری اور اروڑے ہمارے ہندو معاشرے کے دو ستون تھے۔ ان کی خدمات بجا لانے

والے ہندو اور مسلمان خاندان ہوتے تھے۔ خدمت گزار خاندان موروثی تھے۔ ان میں سے کچھ ججمانی سسٹم کے تابع تھے جس کے مطابق یہ خدمت گزار خاندان موروثی طور پر اپنے ججمانوں سے وابستہ تھے۔ ججمان وہ لوگ تھے جن کے لئے یہ لوگ خدمات فراہم کرتے تھے۔ ہمارا ایک حجام تھا۔ اس کا باپ بھی ہمارا خاندانی حجام تھا۔ یوں اس حجام کا اور ہمارے خاندان کا ایک اٹوٹ رشتہ تھا۔ وہ اچھے ہوں یا برے ہم ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے اور ہم ان کو اپنی خدمت کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے جب تک کہ ہم کسی اور شہر میں منتقل نہ ہو جائیں اور وہاں نئے حجام کی خدمت حاصل نہ کر لیں۔ لیکن جب ہم اپنے آبائی گاؤں واپس آ جائیں تو پھر وہی پرانا حجام موجود ہوتا تھا۔ اسے تبدیل کرنا ممکن نہ تھا۔

براہمن ججمان تنظیم میں اہم جزو تھے۔ جب میں پنجاب سے باہر نکلا تو مجھے معلوم ہوا کہ براہمنوں کا ان کے امکانی لیڈر ہونے کے پیش نظر معاشرے میں ایک خاص مقام ہے۔ ہمارے ہاں براہمن ایک غیر مراعات یافتہ طبقہ تھا اور معاشرے میں ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ شاید مسلمانوں نے مندر بنانے اور کھلی جگہ میں پوجا کرنے کی اتنی حوصلہ شکنی کی ہو گی کہ معاشرے میں براہمنوں کے پاس کوئی ایسا مقام نہ بچ سکا جہاں سے وہ اپنے اقتدار کو نافذ کر سکتے۔ گجرات کی طرح کے شہروں میں اور دریائے جہلم کے مغربی طرف بہت کم مندر تھے لاہور شہر میں صرف ہندو محلوں کے عین اندر گھسے ہوئے کچھ بڑے مندر نظر آتے تھے ورنہ ہمارے اکثر مندر دیواروں کے طاقچوں یا پیپل کے درخت کے نیچے چھوٹی چھوٹی عبادت گاہوں کی صورت میں نظر آتے تھے۔

عام طور پر براہمن ٹیچر بھی نہیں تھے کیونکہ انگریزوں کے قایم کردہ سکولوں سے پہلے مسلمانوں کو مسجدوں میں مولوی اور سکھوں کو گردواروں میں گرنتھی پڑھاتے تھے۔ ہمارے براہمن عالم فاضل بھی نہیں تھے۔ وہ بالکل ان پڑھ تھے۔ ان کو رسومات کا تھوڑا سا سطحی علم ہوتا تھا اور چند ضروری منتر زبانی یاد ہوتے تھے۔ چونکہ ان کے لئے ایسے مواقع بہت کم تھے جہاں ان کی مدد اور علم کی ضرورت ہو اس لئے انہوں نے ایک خیراتی نظام قایم کر رکھا تھا۔ برہمن خاندان کے لوگ ہر صبح اپنے ججمانوں کے گھروں پر جاتے تھے جہاں سے ان کو پکا پکایا کھانا مل جاتا تھا جس میں ایک آدھ چپاتی' دال یا سبزی اور لسی ہوتے تھے۔ ایک براہمن کے خاندان کے دو وقتوں کے لئے یہ کافی ہوتا تھا۔ بعض اوقات کچھ چپاتیاں بچ بھی جاتی تھیں۔ انہیں وہ سکھا لیتے تھے اور بعد میں گرم دودھ میں ڈبو کر کھاتے تھے۔ براہمنوں کو دئے جانے والے کھانے کو ہنڈا کہتے تھے اور یہ ہمیشہ پکا ہوا ہوتا تھا۔ ہنڈا خشک راشن کی

صورت میں کبھی نہیں ملتا تھا کیونکہ ہماری عورتیں اسے گھٹیا سمجھتی تھیں۔ ماں ہمارے گھر کے کھانے سے ہنڈے کا انتظام کر لیتی تھیں لیکن خشک یا کچا کھانا طلب کرنے کا مطلب تھا کہ ایسا کھانا طلب کرنے والا ہماری ماں کے مودی خانے میں نقب لگا رہا ہے۔ ہنڈا ان کی روزمرہ کی خوراک کی ضروریات پوری کر دیتا تھا اور کپڑا اور تھوڑے سے پیسے انہیں تہواروں پر مل جاتے تھے۔ اس سے ان کی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ براہمنوں کا یہ طرز زندگی بڑا سادہ تھا۔ خوشحال براہمن ہمارے ہاں کبھی نظر نہیں آیا۔

روز روز کی محتاجی اور علم کے فقدان کی وجہ سے ہمارے ہاں براہمنوں کے ساتھ قدرے حقارت کا سلوک ہوتا تھا۔ انہیں "اوئے پنڈتا" یا "اوئے باہمنا" کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ انہیں مخاطب کرنے میں ایک ہلکی سی تضحیک بھی تھی۔ انہیں بزرگوں کا مقام معاشرے میں کبھی نہیں ملا۔ دنیاوی معاملات میں بھی ان سے مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر جوتش کے ماہر پنڈتوں کی تھوڑی بہت عزت ضرور تھی۔ یہ براہمنوں کا برتر طبقہ تھا۔ تعلیم یافتہ اور مذہبی گفتگو کرنے والے اور پڑھے لکھے پنڈتوں کا بھی کچھ احترام تھا مگر ایسے پنڈت بہت کم تھے۔ منگنی' شادی' سفر یا کاروبار کے آغاز کے لئے شبھ گھڑی معلوم کرنے کے لئے ہم جوتشیوں کے پاس ہی جاتے تھے۔ وہ جنتریاں دیکھ کر ان کی تاویلیں کرتے تھے اور لوگوں پر ستاروں کے اثرات کے بارے میں بتاتے تھے۔ یہ جنتریاں ہردوار اور بنارس کے پنڈت تیار کرتے تھے اور یہ تمام ہندو گھروں میں ملتی تھیں۔ بعض اوقات تو گھر میں صرف یہی ایک کتاب ہوتی تھی۔ جنتریاں ایک طرح کے کیلنڈر تھے جن میں مختلف اوقات میں چاند سورج' ستاروں اور سیاروں کے مقامات کے بارے میں معلومات درج ہوتی تھیں اور ان کی تاویل کرنا جوتشی کا کام تھا۔ یہ مانا جاتا تھا کہ ہر انسان کی زندگی سماوی اثرات کے تحت ہے اس لئے ہر شخص کی زندگی کا دار و مدار اس کے زائچے پر ہے۔ چنانچہ زائچہ بچے کی پیدائش پر ہی تیار کر لیا جاتا تھا۔ زندگی کے ہر اہم کام کرنے سے پیشتر زائچہ دیکھنا لازم تھا۔ جوتش پنڈتوں کا خصوصی شعبہ تھا۔

ہندوؤں میں دوسری کمیں ذاتیں سنار' بڑھئی' جھیور یا مہرے' باورچی' ماشکی اور کلال تھے۔ کلال شراب فروش تھے اور معاشرتی طبقات میں سب سے آخر میں آتے تھے۔ ان میں سے صرف جھیور ہی ججمانی نظام کا حصہ تھے اور ان سے ہمارا روز کا واسطہ تھا۔ جھیوروں کی کوئی لڑکی صبح سویرے آ کر صفائی کرتی تھی اور برتن دھوتی تھی۔ ان کے مرد نچلی منزل پر واقع کنویں میں سے اور بعد میں ہاتھ سے چلنے والے نلکے سے پانی بھر جاتے

تھے۔ شادیوں کے موقعوں پر جب گھر مہمانوں سے بھر جاتے تھے تو یہ لوگ کھانا بھی پکاتے تھے۔

سنار اور بڑھئی آزاد ذاتیں تھیں اور ہر ضرورت مند ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ انگریزوں کے شراب متعارف کرنے سے پہلے کلال افیون' بھنگ اور دوسری نشہ آور چیزیں فروخت کرتے تھے۔ ہمیں شراب کا پتہ بھی نہ تھا۔ نشہ آور چیز صرف افیون تھی لیکن افیون کا استعمال عام نہ تھا۔

مغربی پنجاب میں اچھوت لوگ نہیں تھے۔ جھاڑو اور چمڑے کا کام صرف مسلمان کرتے تھے۔ شاید یہی اچھوت ہندو تھے جو اپنے نصیب سے بچنے کے لئے مسلمان ہو گئے تھے لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد بھی انہیں ان کاموں سے چھٹکارا نہ ملا گو انہیں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک نظریاتی قسم کی برابری ضرور مل گئی۔ عبادت کے لئے وہ مسجدوں میں جا سکتے تھے۔ ایک فاصلے سے ان کا مسلمانوں کے ساتھ ملنا جلنا بھی تھا لیکن وہ ناپسندیدہ پیشوں کو جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

جب میں لڑکا تھا اور میری ماں کسی مسلمان کے گھر جاتی تھیں اور پیاس لگنے پر ان کے لئے ان کو بتا کر گلاس اور پانی کسی ہندو کے گھر سے منگوایا جاتا تھا تو اس وقت مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی تھی۔ لیکن میں سست رفتار تبدیلی کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ میرے والد اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے یا انہیں اپنے گھر پر بھی بلا لیتے تھے۔ جب چینی کے برتن استعمال میں آنے لگے تو ہمارے اور دوسروں گھروں میں بھی یہ مسئلہ بڑی خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔ ہماری خواتین جو ہمارے برتنوں میں کسی مسلمان کے کھانے پر اعتراض کرتی تھیں' اب ایسے موقعوں پر چینی کے برتن بڑی خوشی سے استعمال کرنے لگیں۔ ان برتنوں کے بارے میں خیال یہ تھا کہ یہ جوٹھے نہیں ہوتے۔ ان کی چمکدار سفید سطح سے چکنائی آسانی سے دور ہو سکتی ہے اور وہ انہیں جوٹھا ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ میری والدہ اپنے لئے تو چینی کے برتن استعمال نہیں کرتی تھیں اور ان کا استعمال صرف مردوں' مسلمانوں' عیسائیوں اور انگریزوں تک محدود تھا لیکن ان کی ضد بھی جلد ہی کمزور پڑنے لگی۔ ضد کی اس کمزوری کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جب انہوں نے غیر ہندو گھر میں بغیر چھیلے ہوئے پھل قبول کرنا شروع کر دیا۔

اس سے بھی اگلا مرحلہ چائے' بنے بنائے بسکٹ اور بوتلوں میں بند انگریزی لائم کارڈیل کو قبول کرنا تھا لیکن میری والدہ مسلمان یا میرے والد کے انگریز رفقائے کار کے

ساتھ پکا ہوا کھانا کھانے کے مرحلے تک نہ پہنچیں۔ میرے لئے یہ بھی ناقابل فہم تھا۔ میں مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کے روائتی ٹیبو کو تو سمجھ سکتا تھا لیکن اس کا انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے کیا تعلق؟ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مسلمانوں کی طرح وہ بھی گائے کا گوشت کھاتے تھے اور ان کا کھانا بھی صرف مسلمان ہی پکاتے تھے۔ بچپن میں میں یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ مسلمان اور انگریز ہمارے ہاتھوں اس قسم کا توہین آمیز سلوک کس طرح برداشت کر لیتے ہیں اور وہ اس کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ چالیس کی دھائی میں پاکستان کے تصور اور اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کے مطالبے سے پنجابی مسلمان ذہن نے کبھی کبھار یہ مطالبہ کیا کہ وہ بھی ہندوؤں سے کھانا پانی قبول نہ کریں۔ اور شاید انگریزوں نے اسے ہندو کی سنک سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔

کئی اور مسلمان خدمت گزار ذاتیں تھیں جو اپنے اپنے آبائی پیشوں سے منسلک تھیں۔ ان میں سے دو ججمان سسٹم میں شامل تھیں۔ حجاموں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ بال کاٹنے' داڑھیاں بنانے اور کسی حد تک جراحی کرنے کے علاوہ حجام کے ذمے منگنیاں کرانے کا ایک اہم فریضہ تھا۔ حجام کو عکلفاً "راجا" کہا جاتا تھا اور شادیوں کے موقعوں پر اس کی اہمیت صرف پنڈت سے ہی کم تھی۔ ہمارے بچپن میں حجام سے ہماری کبھی دوستی نہیں ہوئی کیونکہ وہ کہتا تھا کہ ہم سے وہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارے بال کس فیشن کے کاٹے جائیں۔ اس زمانے میں انگریزی سٹائل جسے بنگالی بابو فیشن کہا جاتا تھا' بڑا مقبول ہو رہا تھا لیکن ہمارا راجا ہماری ٹنڈ کرنے پر اصرار کرتا تھا ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے وہ یہ بھی کہتا تھا ہمارے لئے ٹنڈ کرانا ہی مفید ہے۔ اس سے بالوں میں کنگھی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور یوں بہت وقت بچ جاتا ہے جو ہمیں اپنی پڑھائی پر صرف کرنا چاہئے۔ ہم اس سے نفرت کرتے تھے لیکن بول کچھ نہیں سکتے تھے۔ اور کام کرنے والی دلیل ہمارے والد کو بھی پسند تھی۔ منگنیاں طے کرانے کی وجہ سے راجا بڑا باوقار تھا کیونکہ اس وقت دو خاندانوں کی عزت اسی کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔

ججمانی سسٹم میں میراثی ایک اور مسلمان ذات تھی۔ شادیوں پر یہ ڈھول اور شہنائی بجاتے تھے لیکن مزاح اور حاضر جوابی میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ معاشرے میں بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شخص ان کا نشانہ بن سکتا تھا اور اس ضمن میں انہیں روائتی تحفظ بھی حاصل تھا۔ ان کی بذلہ سنجی کا شکار ان پر خفا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بلانے پر یا بن بلائے ہی شادیوں یا دوسرے ایسے موقعوں پر چلے آتے تھے اور مہمانوں اور میزبانوں

کا مذاق اڑاتے تھے۔ ظرافت انہیں ورثے میں ملتی تھی اور بچپن سے ہی وہ اپنا یہ کام شروع کر دیتے تھے۔ ظرافت' بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بعض اوقات بڑی ذہانت پر مبنی ہوتی تھی۔ اس شخص کی شامت آ جاتی تھی جو ان کو جواب دے یا ان پر ظرافت میں سبقت لے جانے کی کوشش کرے کیونکہ سب کے سامنے میراثی ان کے پرخچے اڑا دیتے تھے۔ میراثیوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان کو کس طرح مطمئن کر کے روانہ کیا جائے۔ ان کی توقع سے کم پیسے ملنے پر میزبان کے خلاف خصوصی محفل گرم ہو جاتی تھی اور یہ بڑی قدیم روایت تھی کہ میراثیوں کو وہ کچھ کہنے دیا جائے جو وہ کہنا چاہتے ہیں حاضر جوابی بعض اوقات بڑی ذہانت پر مبنی ہوتی تھی۔ ان پر غصے یا ناراض ہوئے بغیر ان کو جواب دینے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جواب دینے والے شخص میں حس مزاح کی کمی ہے۔ میراثیوں کے پاس تو کھونے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ میراثنیں بھی کام کرتی تھیں۔ وہ ڈھولک بجاتی اور گاتی تھیں۔ ظرافت میں انہیں کبھی سبقت حاصل نہیں ہوئی لیکن لچرپن میں وہ سب سے آگے تھیں۔ شادیوں پر میراثی اور میراثنیں گھر والوں کے گن گایا کرتی تھے۔ وہ پرانی داستانیں گا کر سنایا کرتی تھیں اور گیت گانے میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ پنجابی زبان میں اب میراثی سے مراد سوقیانہ قسم کی مزاح اور ظرافت کی زیادتی ہو گیا ہے۔ میراثی ایک الگ تھلگ جماعت تھی اور وہ علیحدہ محلوں میں رہتے تھے۔ اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن دوسرے مسلمانوں نے ان سے کبھی شادیاں نہیں کیں۔ ان کی عورتیں دبلی پتلی اور بے حیا اور پرکشش اور بے راہ رو ہوتی تھیں۔

میراثی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے اور انہوں نے براس بینڈ کو اپنا لیا۔ یہ اثر فوج کی طرف سے آیا۔ شادیوں پر طبلے اور شہنائی کی جگہ اب براس بینڈ نے لے لی۔ عجیب و غریب قسم کی وردی میں ملبوس جو رجمنٹل بینڈ اور درباری لباس کا ملغوبہ تھی' وہ بارات کے آگے آگے چلتا تھا اور اپنے گاہک سے ملی ہوئی مزدوری کا پورا حق ادا کرتا تھا۔ وہ اتنا شور مچاتا تھا کہ بارات کا ہنگامہ یہاں تک کہ آتش بازی کا شور بھی اس میں دب جاتا تھا۔

میراثیوں سے کنجر کچھ زیادہ دور نہیں تھے۔ رنڈیاں' ناچنے اور گانے والیاں کنجروں کی ذات سے ہی ہوتی تھیں لیکن یہ ذات ججمان سسٹم میں شامل نہیں تھی۔ کنجر ذات کے مرد حرامی ہونے کی بنا پر کسی اور پیشے میں نہیں جا سکتے تھے اس لئے وہ مفت خوروں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی مسلمان تھے اگرچہ دوسری ذاتوں کی اخلاقی اعتبار سے تباہ شدہ اور بے عصمت عورتیں بھی ان میں شامل ہو جاتی تھیں۔ ان عورتوں سے بھی مسلمان

شادیاں نہیں کرتے تھے۔ اس پیشے کی درجہ بندی میں پہلے گانے والیاں پھر ناچنے والیاں اور آخر میں رنڈیاں آتی تھیں۔ یہ درجہ بندی ان عورتوں کی اہلیت اور مہارت پر مبنی تھی۔ رنڈی کے لئے صرف قبول صورت ہونا ہی کافی تھا۔ رقص اور ناچ کے لئے ان کی گراوٹ کے باوجود کئی سالوں کی تربیت درکار تھی۔ سب سے بلند درجہ گانے والیوں کا تھا۔ وہ عام قسم کی رنڈیاں نہیں تھیں۔ وہ صرف اپنے پسندیدہ شخص کو ہی نوازتی تھیں۔ میراثی ان گانے والیوں کے ساتھ ساز بجاتے تھے۔

دوسری دلچسپ ذاتیں بھانڈ' بازیگر' سپیرے' اور بہروپئے تھے۔ بھانڈ اور راس دھاری مسخروں کی جماعت تھی جو بہروپ بدلنے اور بھونڈ قسم کے ناٹک کھیلنے میں ماہر تھے۔ شادیوں پر یہ اپنے روایتی کھیل کھیلتے تھے اور محفل میں موجود لوگوں کے خاکے اڑاتے تھے۔ وہ ظرافت اور خوش طبعی میں بڑے چالاک تھے۔ کوئی سنجیدہ یا کلاسیکی چیز انہوں نے کبھی پیش نہیں کی۔ پنجاب میں لفظ بھانڈ سے مراد ہی مسخرہ ہے۔

بازیگروں اور مداریوں کے پیشے بھی موروثی تھے۔ یہ لوگ بھی جگہ جگہ گھومتے پھرتے تھے' بازیگر ٹولیوں کی صورت میں اور مداری اکیلے اکیلے۔ سپیروں کی اپنی ذات تھی لیکن کسی کو پتہ نہیں کہ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

بہروپئے ہر قسم کا بھیس بدلنے میں بڑے ماہر تھے اور مختلف کردار اس حقیقت پسندی سے ادا کرتے تھے کہ لوگوں کو بہروپئے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ کوئی بہروپیہ ایک پوپلی بڑھی عورت کے روپ میں پہنچ جاتا تھا اور آخر تک کسی کو اس کے اوپر شک تک نہ پڑتا تھا۔ آخر میں وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آ کر بتاتا تھا کہ وہ بہروپیہ ہے تو لوگ ششدر رہ جاتے تھے اور اسے مناسب انعام دیتے تھے۔ وہ بڑے منجھے ہوئے فن کار ہوتے تھے۔ پنجابی میں لفظ بہروپیہ سے مراد ایسا شخص ہے جو بظاہر فریبی ہو۔ راس دھاری ٹولیوں کی صورت میں پھرتے تھے اور ناٹک اور ڈرامے کرتے تھے۔ رنگ برنگے کپڑے پہن کر وہ شہر میں آ جاتے تھے اور پرانی داستانوں کو شادیوں پر اور گلیوں میں ناٹک کی صورت میں پیش کرتے تھے۔

جولاہے' درزی' دھوبی' لوہار' کمہار تیلی اور سبزیاں اگانے والوں کے پیشے بھی مسلمانوں ہی کے تھے۔ کئی پیشوں میں تو ذات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ جب انگریز اپنے ساتھ رجمنٹل درزی اور حجام لائے تو کئی پنجابی ہندوؤں نے بھی یہ پیشے اختیار کر لئے۔ لوہاروں اور جولاہوں کے علاوہ بھی مشینوں کی آمد کے ساتھ کئی پیشوں میں داخلے کے خلاف

ہندو لوگوں کی مدافعت ختم ہو گئی۔ لیکن دوسرے پیشوں میں مثلاً تیلی، کمہار اور سبزیاں اگانے والوں کے پیشوں میں ہندو کبھی داخل نہیں ہوئے یہاں تک کہ زراعت پیشہ ہندوؤں نے بھی منڈیوں کے لئے سبزیاں کبھی نہیں اگائیں۔ اس کام کے لئے مسلمانوں کی ایک خاص ذات آرائیں تھی جو صرف سبزیاں اگاتے تھے۔ عام ہندو کسان اپنے لئے تو سبزیاں کاشت کر لیتا تھا لیکن فروخت کے لئے ہرگز نہیں۔

ان تمام ذاتوں سے ہمارا معاشرہ ایک کثیر الطبقاتی معاشرہ تو نہ بنا لیکن اسے کثیر الاکائی معاشرہ کہنا زیادہ مناسب ہے جس میں ہر اکائی کا اپنا اپنا کردار تھا اور اونچی ذاتوں کا کوئی جبر نہیں تھا۔ مختلف ذاتیں برادریاں بن جاتی تھیں۔ ایک مجموعی ہندو برادری تھی، اس میں کھتری اور اروڑہ برادریاں تھیں۔ ہندو یا مسلمان کیوں یعنی پیشہ وروں کی برادریاں بھی تھیں۔ یہ برادریاں ڈھیلی ڈھالی تھیں اور ان کی حدود کا کوئی واضح تعین نہیں تھا مگر ضرورت پڑنے پر سب متحد ہو جاتے تھے۔ وہ دوسروں کو کچھ حقوق دیتے تھے اور ان کے بدلے وہ آپ سے کچھ فرائض کے طلب گار تھے۔ برادریوں کے لیڈر برادریوں کے معمر لوگ ہوتے تھے۔ ان کا باضابطہ چناؤ نہیں ہوتا تھا۔ صرف سب سے زیادہ محترم اور معمر شخص کو منتخب کر لیا جاتا تھا۔ آپ کے حقوق ہی آپ کے فرائض بھی تھے۔ شادیوں اور جنازوں پر برادری کا ہر فرد متاثرہ خاندان کی کھلے دل سے مدد کرتا تھا۔ لڑکیوں کی شادیوں کے موقعوں پر برادری کا ہر فرد مہمانوں کی خدمت کرتا تھا اور مختلف کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ وفات پر جب قریبی رشتے داروں پر سکتے کا عالم ہوتا ہے تو برادری والے ان کو حوصلہ اور دلاسہ دیتے تھے۔

برادری قانون سازی بھی کرتی تھی۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ کچھ پرانے رواج تکلیف کا باعث بنتے تھے۔ برادری کو انہیں بدلنے کا اختیار تھا۔ ایک زمانے میں ہماری کھتری برادری میں دلہن کے گھر میں بارات سات دن ٹھہرتی تھی۔ قیمتوں میں اضافے اور دیہاتوں سے لوگوں کے شہر میں آ کر بسنے کے رجحان سے بارات کا اتنی دیر ٹھہرنا مشکل ہو گیا لیکن کوئی شخص مہمانوں کو تھوڑا قیام کرنے کے لئے کہہ کر اپنی ناک نہیں کٹوانا چاہتا تھا۔ آخرکار کھتریوں نے اس قیام کی مدت سات سے کم کر تین دن کر دی۔ چنانچہ اجازت ملنے پر یہ ایک رواج بن گیا۔ بعد میں یہ تعداد تین سے کم ہو کر دو رہ گئی۔ اگر کسی معاملے کا تصفیہ نہ ہو سکے تو اسے برادری میں پیش کیا جاتا تھا۔ برادری بر سر عام شکایت سنتی تھی یا کوئی ثالث مقرر کر دیتی تھی۔ برادری کے حکم کے نفاذ کو خواہ وہ قدیم رواجوں کے متعلق ہو

یا کسی تنازعے کے متعلق، ترغیب کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ بعض اوقات برادری صرف تنقید کرتی تھی یا تنبیہہ پر اکتفا کرتی تھی۔ سنگین بداخلاقی یا برادری کے حکم سے دانستہ انحراف کی صورت میں متعلقہ شخص کو برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ برادری سے خارج ہونے کا مطلب تھا کہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا گیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ نہ تو کوئی حقہ پیے گا اور نہ پانی، نہ ہی کوئی اس سے شادی کرے گا اور نہ ہی کسی قسم کی رسم و راہ رکھے گا۔ لیکن ایسے موقعے بہت کم تھے۔ ایک دفعہ برادری سے خارج ہو جانے پر کوئی دوسری برادری خواہ وہ کمتر ہی کیوں نہ ہو اس شخص کو قبول نہیں کرتی تھی۔ اور پھر آپ اس برادری میں کیسے داخل ہو سکتے تھے جس سے آپ کا کوئی فطری رشتہ نہیں۔ بدترین نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ متعلقہ شخص کے بچوں کو بھی کوئی قبول نہیں کرتا تھا اور نہ ہی ان سے کوئی شادی بیاہ کرتا تھا۔ لڑکے تو پھر کسی دوسرے شہر میں جا کر رہ سکتے تھے لیکن لڑکیوں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس بنا پر بڑے سے بڑے منحرف شخص کو جھکنا پڑتا تھا۔

حقہ پانی بند کرنا بڑی سخت سزا تھی اور یہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی تھی بشرطیکہ کہ متعلقہ شخص اپنی غلطی کا ازالہ نہ کر لے۔ اس صورت میں متعلقہ شخص برادری کے بزرگوں کے پاس جا کر معافی مانگتا اور درخواست کرتا تھا کہ برادری اکٹھی ہو کر اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے۔ برادری کا اکٹھا ہونا ایک دلچسپ واقعہ ہوتا تھا اور برادری کے سارے لوگوں کے لئے ایک تفریح کا باعث بھی بنتا تھا۔ ایسے اجلاس شام کے کھانے کے بعد چوک میں ہوتے تھے اور برادری کے تمام افراد اس میں حصہ لیتے تھے۔ مدعا علیہ اور مدعی کو اگر وہ موجود ہو تو، برادری کی پنچایت کے سامنے طلب کیا جاتا تھا۔ پنچایت پانچ ارکان پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس وقت یہی لوگ میر محفل ہوتے تھے۔ اگر پنچایت کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو ایسے اجلاس ایک سے زیادہ دن بھی چل سکتے تھے۔ اس دوران معاملے پر نجی بحثیں بھی ہوتی تھیں اور پنچوں کو متاثر کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ گواہوں کو طلب کیا جاتا تھا۔ ہر شخص کسی پر الزام لگا سکتا تھا اور ہر شخص ملزم کی صفائی پیش کر سکتا تھا۔ سب کچھ کھلے عام ہوتا تھا اور فیصلہ پوری برادری کرتی تھی۔ برادری کی رہنمائی پنچ کرتے تھے۔ کھلے عام برادری میں شکایت پیش کر دینا اور اس کی ہمدردی حاصل کر لینا، ملزم پر کھلے عام لعن طعن کرنا، اکثر یہ اقدام مدعی کی تشفی کے لئے کافی ہوتے تھے اور ملزم کی طرف سے تاسف کے خفیف سے اظہار کے بعد معاملہ رفع دفع ہو جاتا تھا۔ سنگین موقعوں پر جب حقہ پانی بند کرنے کی سزا سنائی جاتی تھی یا ایسی سزا پر نظرثانی کی درخواست کی جاتی تھی تو ملزم اکثر اپنی

پگڑی جو اس کی عزت کی علامت ہوتی تھی' اتار کر پنچوں کے پیروں پر رکھ دیتا تھا۔ تاسف اور خاکساری کا یہ انتہائی عمیق اظہار تھا۔ اس پر روایتاً برادری کو نرم ہونا پڑتا تھا۔ خواتین اگرچہ اجلاس میں شریک نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی وہ پنچایت کی رکن ہوتی تھیں لیکن پس پردہ وہ معاملات پر اثر انداز ہوتی تھیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد ہے جب پہلی جنگ عظیم کے بعد حقہ پانی بند کیا گیا تھا۔ ایک کھتری نے جنگ کے دنوں میں بڑی دولت کمائی۔ اس کی بیوی صحت مند تھی اور زندہ تھی۔ اس سے اس کھتری کے تین بیٹے بھی تھے۔ نئی دولت ہاتھ آنے سے اس نے دوسری شادی کا ارادہ کر لیا۔ اس کی برادری اور یہاں تک کہ نچی ذات والوں نے بھی اسے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن ایک غریب بوڑھا آدمی جو برے حالوں تھا اپنی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کی اس نو دولتے سے شادی پر رضامند ہو گیا۔ یہ نو دولتیا لڑکی کے مقابلے میں دگنی عمر کا تھا۔ غریب بوڑھے کو یہ رشتہ اس لئے بھی پسند آیا کہ لڑکی کا ہونے والا شوہر اس کی توقع سے بھی کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اس کے خیال میں اس کی غریب لڑکی یک دم رانی بن جائے گی۔ سونا چاندی' نوکر چاکر اور سارا سامان عشرت جو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا' اس کی لڑکی کو مل جائے گا۔

جب لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ یہ اس کی پہلی بیوی سے جو اسی شہر کی رہنے والی تھی' سراسر زیادتی تھی۔ وہ جوان تھی اور ابھی بچے پیدا کر سکتی تھی اور اس شخص کے لئے یہ بیوی کافی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے نو دولتے شوہر سے بہتر تھی کیونکہ اس عورت نے اس وقت اس شخص سے شادی کی تھی جب وہ کچھ بھی نہ تھا۔ اگر اس نے اتنی دولت اکٹھی کر لی تھی تو کیا ہوا۔ اگر وہ مرجاتی' پاگل ہو جاتی یا بانجھ ہوتی یا اس سے صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتیں تو اس شخص کا دوبارہ شادی کرنا سمجھ میں آ سکتا تھا۔ لیکن یہاں تو دوسری شادی کا ایسا کوئی جواز نہ تھا۔ تمام عزت دار لوگوں نے اس کے رشتے کو ٹھکرا دیا تھا لیکن اس نے اس غریب بڈھے کو پھانس لیا تھا اور اپنی لڑکی کا رشتہ اسے دینے پر رضامند کر لیا تھا۔ لیکن یہ تو لڑکی کو بیچنے کے مترادف تھا جو ایسا کلنک تھا جو کسی کھتری کے ماتھے پر کبھی نہیں لگا تھا۔ برادری نے اس بڈھے کو اس سودے بازی سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن منگنی بھی ہو گئی اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ شادی کے دن جب بارات سٹیشن پر پہنچی تو اس کی تضحیک کرنا والا ایک جم غفیر وہاں موجود تھا جس کے شور شرابے میں بد دل باجے والوں کا شور بھی دب گیا۔ بڈھے کو برادری سے

خارج کر دیا گیا۔ شادی میں کوئی شامل نہ ہوا۔ مہمانوں کی خدمت کرنے کے لئے کوئی نہ آیا۔ دوسرے دن جب بارات واپس گئی تو ویسا ہی جم غفیر موجود تھا جو باراتیوں کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ بارات صرف ایک رات ٹھہر سکی۔ وہ "چوروں کی طرح آئے اور صبح ہونے سے پہلے غائب ہو گئے۔" یہ استعارہ ایسی بے جوڑ اور سماج باہر شادیوں کے لئے مخصوص تھا جن میں ایک چھوٹی سی بارات شام کو دیر سے آتی ہے اور بغیر اپنا منہ دکھائے صبح ہونے سے پہلے ہی غایب ہو جاتی ہے۔

وہ امیر شخص پھر کبھی ہمارے شہر نہیں آیا اور چند برسوں کے بعد مر گیا۔ اس کا بوڑھا سسر اپنی امارت کے باوجود حقارت کی زندگی جیتا رہا۔ اس کے منہ میں دولت کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کی بیٹی اسے ملنے کے لئے آ جاتی تھی لیکن کوئی شخص اس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ الٹا اس کی شان و شوکت سے نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

برادری کے سزا دینے کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔ اس میں پنچایت کے ایک رکن نے وہ اصول توڑا جس کے نافذ کرنے والوں میں وہ خود بھی شامل تھا۔ اس شہر کی ہندو برادری نے فیصلہ کیا کہ شادیوں پر آتش بازی فضول خرچی ہے اس لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ امیر آدمی خود بھی پنچ تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ آتش بازی دوسرے شہر سے منگوائی گئی۔ برادری نے اسے خبردار کیا کہ ایک پنچ کے لئے اس کا اپنا بنایا ہوا اصول توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ اس نصیحت کو اس نے بڑے غرور سے ٹھکرا دیا۔ جب بارات آئی تو سوائے چند رشتے داروں کے اس کے استقبال کو وہاں کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ اس معاملے نے اس شخص کو سبق سکھلا دیا۔ وہ انتظامات اور شان و شوکت جو اس کی تحسین و آفرین کا باعث ہو سکتے تھے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ بدتر یہ تھا کہ لڑکے والوں کی نظر میں اس کی عزت خاک میں مل گئی اور وہ سوچ میں پڑ گئے کہ انہوں نے کس خاندان میں اپنے لڑکے کی شادی کر دی ہے۔ برادری نے بھی اس سے سبق سیکھا اور انہوں نے بھی آتش بازی کے لئے اصول ذرا نرم کر دیئے۔ آتش بازی فضول خرچی تھی لیکن کسی کے نقصان کا باعث نہیں تھی۔ الٹا یہ ایک تفریح کا ذریعہ تھی۔

برادریاں اگر طاقتور بھی ہوں تو یہ تند اور سخت مزاج نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی انہیں امیر اور طاقتور اشخاص متاثر کر سکتے تھے۔ صدیوں بعد لوگوں نے ان پر بھروسہ کرنا سیکھا تھا۔ اگر برادریاں قدرتی قوانین کی خلاف ورزی کرتیں تو لوگ ان پر بھروسہ کرنا چھوڑ

دیتے۔ ایک طاقت ور آدمی کچھ عرصے کے لئے برادری کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اسے بھی آخر اپنے لڑکیوں لڑکوں کی شادی کرنا ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھار اس کے ہاں بھی جنازہ اٹھتا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے کے لئے وہ برادری سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔

ہمارا قانون دان چچا ہمیں بتاتا تھا کہ برادری کا نظام اس وقت کمزور ہونا شروع ہوا جب انگریز اپنے ساتھ منضبط قانون' غیر جانبدار عدالتیں' جج اور پیشہ ور وکلاء' مہنگی کورٹ فیس' قانون شہادت اور قانونی ضابطے اپنے ساتھ لائے۔ پہلے پہلے تو جج صاحبان لوگوں کے طور طریقوں سے واقف نہیں تھے۔ لیکن جیسے ہی ججوں نے لوگوں کو سمجھنا شروع کیا تو لوگوں کو بھی پتہ چل گیا کہ جھوٹی گواہیوں اور استدلال میں لفاظی کے ذریعے قانون کی گرفت سے بچا جا سکتا ہے۔ مگر برادری کے سامنے جھوٹ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر جھوٹ کا اس وقت پتہ نہیں چلتا تو کوئی بات نہیں کیونکہ بعد میں وہ عیاں تو ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے برعکس جج کے سامنے جس کی نظر میں آپ مستغیث یا ملزم ہیں' جھوٹ صرف اسی وقت قابل مواخذہ ہے اگر وہ مقدمے کے دوران بولا جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب اچھی فصل پر کوئی شخص مقدمے بازی کے لئے ایک رقم مخصوص کر دیتا تھا اور بدلہ چکانے کے لئے قتل کی اس رقم کے زور پر اور اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر کے مقدمے سے صاف بچ نکلتا تھا۔

اگر عدالتی نظام کی آمد پر برادری اور پنچایت کی عدالتی اور ثالثی تفاعل یا وظیفے کی اہمیت کم ہو گئی تو مغربی تعلیم کی ترقی اور گھر سے دور نکل جانے کے رجحان نے ان اداروں کی معاشرتی حیثیت کو گزند پہنچایا۔ سماجی معاملات کو رواج کی روشنی میں دیکھنے کی جگہ لوگوں نے اپنے نجی معیار قایم کر لئے۔ ہمارے والد نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں اپنی ساری زندگی گجرات میں اپنی کھتری برادری سے دور گزاری اور اپنی نئی مغربی تعلیم کی روشنی میں رواجوں میں تبدیلیاں کیں۔ ان تبدیلیوں نے ہمارے ان عقاید کو چیلنج کیا جن کو بغیر ثبوت کے قبول کر لیا گیا تھا۔ حقیقت میں انہوں نے وہی طرق کار اختیار کیا جو ایک طویل عرصے سے اجتماعی طور پر برادری کرتی رہی تھی یعنی گھسے پٹے رواجوں میں تبدیلی کرنا لیکن اب انہیں خود اکیلے ہی طے کرنا تھا کہ کس رواج کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ برادری نظام کے کمزور ہونے سے ذات پات کا نظام بھی کمزور ہونا شروع ہو گیا کیونکہ کسی ذات کی فرایض کا تعین روزمرہ نافذ ہونے والی ان پابندیوں سے ہوتا ہے جن کے پس پردہ خوف موجود ہو۔ جب کوئی شخص اپنے گاؤں سے دور چلا جاتا تھا تو اس پر برادری کی گرفت ختم ہو جاتی تھی۔

نئی جگہ نئے دوست بنتے تھے اور اکثر نئے رشتے بھی استوار ہوتے تھے۔ اگرچہ اصل برادری سے رشتہ قایم رکھنے کی کوشش ضرور کی جاتی تھی لیکن یہ رشتہ بتدریج کمزور ہوتا شروع ہو جاتا تھا۔ آپ نئی برادری میں شامل ہو سکتے تھے لیکن اس سے رشتے کبھی اتنے مضبوط نہیں ہو سکتے تھے۔

چھٹا باب

میرے لئے گجرات ہی میرا گھر ہے۔ میرے خاندان کا اصل تعلق تو کالا سرائے سے ہے لیکن میرے ذہن میں کالا سرائے کی کوئی یاد نہیں۔ کینال کالونیوں کی یادیں بڑی گریز پا تھی۔ گجرات میں ہماری اپنی برادری تھی' اپنے رشتے دار تھے' ہم رہتے بھی وہیں تھے۔ یوں گجرات ہی میرا گھر ہے۔ پنجابی زبان کا لفظ گھر یا فارسی زبان میں لفظ وطن ہمارے لئے بڑا عزیز تھا۔ کسی اجنبی سے اس کا نام یا ذات پوچھنے سے پہلے آپ اس کا وطن پوچھتے تھے۔ اگر دونوں کا وطن ایک ہی ہو یا قریب قریب ہو تو فوراً ہی رشتہ قایم ہو جاتا تھا کسی اجنبی شہر میں آپ دونوں ایک برادری بن جاتے تھے اور برادری کے تمام حقوق و فرائض آپ پر عاید ہو جاتے تھے۔ شادیوں' تہواروں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر تحفوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اگر اس کی بیوی آپ کے شہر کی ہے تو وہ آپ کی بہن تصور ہوتی تھی اور وہ خود بھی وہیں کا ہو تو وہ آپ کا بھائی سمجھا جائے گا۔ اگر دونوں خواتین ایک ہی شہر سے ہوں تو وہ بہنیں بن جاتیں تھیں۔ بچے ان کو انہی نئے رشتوں پر مبنی ناموں سے ہی پکارتے۔

سفر کرتے ہوئے ریل کے ڈبے میں اچانک پتہ چل جائے کہ کوئی شخص آپ ہی کے شہر کا ہے تو فوراً نعرہ لگتا تھا "لوہ تسی تے ساڈے وطنی ہوئے' ساڈے آپنے گھر دے' ساڈے بھرا۔ واہ واہ"۔ محبت کا جذبہ آپ میں جوش مارتا تھا خصوصاً اس وقت جب آپ گھر سے دور ہوں۔ ڈبے میں ہر شخص اس بات پر تہنیت پیش کرتا تھا۔ پنجاب کے کسی انجانے حصے میں آپ دونوں اپنے آپ کو جلا وطن تصور کرتے تھے۔ ہوا' پانی' دودھ' سبزیوں اور گوبھی کے پھولوں کا ذائقہ اور رنگ یہ سب بتاتے تھے کہ آپ کو ان سب کی عادت نہیں اور آپ اپنے گھر سے دور ہیں۔ ایسے اختلافات کی توقع ہوتی تھی۔ ایسے میں کسی ہم وطن کا مل جانا بڑی خوش نصیبی سمجھی جاتی تھی۔ مقامی لوگ بھی اس کو بخوشی تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قدرتی چیز ہے کہ دور ہو جانے پر چیزیں ویسی نہیں رہتیں جیسے کہ وطن میں ہوتی ہیں۔ ہماری خانہ بدوشی کی زندگی میں گجرات ہی ہمارا گھر تھا۔

گجرات کی بنیادیں بارہویں صدی میں گجروں نے رکھی تھیں۔ گجر چرواہے تھے۔ صوبہ

گجرات بھی انہوں نے ہی بسایا تھا۔ اپنے شاندار ماضی کے مقابلے میں ۱۹۱۷ء میں اس کی آبادی بیس ہزار نفوس سے بھی کم تھی۔ گجرات شہر گرینڈ ٹرنک روڈ پر واقع ہے۔ یہ سڑک شیر شاہ نے لاہور اور پشاور کے درمیان بنائی تھی۔ شہر دریائے جہلم اور چناب کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال کی جانب تیس میل کے فاصلے سے ہمالیہ کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مغرب کی طرف اتنے ہی فاصلے پر پبی کی پہاڑیاں ہیں۔ یہاں سے پوٹھوہار کی سطح مرتفع شروع ہو کر راولپنڈی تک جاتی ہے۔ یوں گجرات شہر ایک مثلث میں واقع ہے جس کے دونوں اضلاع پر پہاڑیاں ہیں اور اس مثلث کے قاعدے پر جنوب میں میدان ہیں جو دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اس مقام کی فوجی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شمال مغربی دروں اور دریائے جہلم کو عبور کرنے کے بعد حملہ آور گجرات پر نازل ہو جاتے تھے جو میلوں چوڑے میدان میں اپنے ایک قلعے اور فصیل کے ساتھ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ لاہور سے مغرب کی جانب یہ واحد قلعہ بند شہر تھا۔

شہر ایک زاویہ قائمہ والی مثلث نما پہاڑی پر آباد ہے۔ پہاڑی کا ایک ضلع بڑی تیزی سے اوپر اٹھا ہوا ہے۔ شہر پہاڑی کی چوٹی سے شروع ہو کر میدان تک آنے والی ڈھلوان پر واقع ہے۔ اس کے اطراف ایک فصیل تھی جس میں چوٹی پر واقعہ دروازے کے علاوہ پانچ اور دروازے تھے۔ فصیل کی وجہ سے صدیوں تک شہر بڑا گنجان آباد رہا اور صرف پچھلی صدی کے اواخر میں فصیل کے باہر گھر بننے لگے۔ ان میں میرے دادا کا گھر بھی تھا۔ تیس سال کے مسلسل امن نے جو آئندہ بھی متوقع تھا' لوگوں کی ہمت بندھائی کہ وہ فصیل سے باہر نکلیں۔ تقریباً آٹھ سو سال تک شہر کا اندرونی حصہ کبھی تبدیل نہ ہوا تھا۔ شاید یہ مدت اس سے کچھ زیادہ ہی ہو کیونکہ گجروں کے اس شہر کو آباد کرنے سے پہلے بھی اس کی فوجی اہمیت کے پیش نظر یہاں کچھ آبادی ضرور ہو گی۔ گجروں نے اس مقام کو صرف نام دیا ہو گا اور اسے قلعہ بند بنایا ہو گا۔ اس کی عمر کے سوا اس کی باقی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

شہر کی منصوبہ بندی اس کے دفاع کے پیش نظر کی گئی تھی۔ اس شہر کی تین بڑی گلیاں تھیں جو شہر کے اندر تیر اور کمان کی صورت میں تھیں۔ ایک گلی شمالاً جنوباً کمان کی صورت میں دو دروازوں کو ملاتی تھی۔ دوسری گلی مشرقی دروازے سے پہاڑی کی چوٹی پر واقع قلعے کو جاتی تھی۔ اس کی صورت کمان میں فٹ تیر کی سی تھی۔ تیسری گلی شمالی دروازے کے قریب سے ہو کر ایک قوس کی صورت میں جنوبی دروازے تک جاتی تھی۔ شہر کی بڑی گلیاں خاصی تنگ تھیں۔ ان میں دکانیں تھیں جن کی درجہ بندی ان کی اقسام پر مبنی تھی۔ ایک

بازار سناروں کا تھا دوسرا حلوائیوں اور نان بائیوں کا اور تیسرا خشک سامان بیچنے والوں کا۔ رنگ ریزوں' ٹھٹھیاروں' بزازوں اور جنرل مرچنٹس کے بھی اپنے اپنے بازار تھے۔ چھوٹی گلیوں میں کمہاروں' جولاہوں اور دوسرے پیشہ وروں کی جیسے بینڈ باجے والوں کی دکانیں تھیں۔ شہر کے ایک حصے میں طوائفیں اور ناچنے گانے والیاں رہتی تھیں اور ایک حصے میں میراثی آباد تھے۔

یہ گلیاں شہر کو تین حصوں میں بانٹتی تھیں۔ ان حصوں میں محلے آباد تھے جن میں داخل ہونے کے صرف دو راستے ہوا کرتے تھے یعنی کوئی گلی ایک طرف سے شروع ہوتی تھی اور دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ ایسے بھی محلے تھے جن میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ گلیاں تنگ تھیں اور ان کے دونوں طرف مکان تھے۔ ایک بھیڑی گلی تھی جو اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ اگر اندر داخل ہونے سے پہلے کسی کو آپ نے اس گلی میں دیکھ لیا تو آپ کو اس کے گزرنے تک کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دو جوان آدمی آمنے سامنے ہو کر بھی اس میں سے نہیں گزر سکتے تھے۔ یہ صرف دو فٹ چوڑی تھی اور اس کے دونوں طرف بغیر کھڑکیوں کے بلند دیواریں تھیں جو کم از کم سو سال پرانی ہوں گی۔ ان میں استعمال ہونے والی پتلی اینٹیں ایک آدمی کے قد کے برابر اونچائی تک گھس گھس کر پالش ہو چکی تھیں اور لگتا تھا کہ ان پر کالے رنگ کی لاکھ کی ایک چمکدار تہ چڑھا دی گئی ہے۔ دوسری گلیاں اتنی تنگ تو نہیں تھیں مگر صرف اتنی چوڑی تھیں کہ ان میں سے صرف دو آدمی بیک وقت گزر سکیں۔ کئی گلیاں دو یا تین محلوں میں سے گزرتی تھیں اور آخر میں اکثر بند ہو جاتی تھیں۔ محلوں میں لوگ صرف رہائش رکھتے تھے اور ان میں دکانیں نہیں ہوتی تھیں۔ ایک محلے میں اکثر ایک ہی ذات کے لوگ رہتے تھے لیکن ہمارے زمانے میں یہ رجحان ختم ہو چکا تھا اگرچہ ہندو اور مسلمان بالعموم علیحدہ علیحدہ محلوں میں رہتے تھے لیکن ایک چھوٹا سا محلہ ایسا بھی تھا جس میں ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ کیوں کے اپنے محلے تھے۔

جگہ کی تنگی کی وجہ سے گھر دو یا تین منزلہ ہوتے تھے۔ اینٹوں اور لکڑی کے استعمال کی بنا پر مکان کی اس سے زیادہ اونچائی ممکن نہ تھی۔ ہر گھر کے سامنے ایک تھڑا ہوتا تھا جس کے دونوں طرف دو دو یا تین تین سیڑھیاں ہوتی تھیں۔ گھر کا داخلی دروازہ تھڑے کے وسط میں ہوتا تھا۔ تھڑا کئی کام آتا تھا۔ دوپہر کے بعد اس پر بیٹھ کر عورتیں سینا پرونا کرتی تھیں' کشیدہ کاری کرتی تھیں' گپیں لگاتی تھیں یا آپس میں لڑائیاں کرتی تھیں۔ اپنے اپنے

تھڑے سے وہ آپس میں با آسانی بات چیت کر لیتی تھیں۔ انہی تھڑوں پر پھیری والے اپنے سامان تجارت کی نمائش کرتے تھے۔ عورتیں اوپر ہی کھڑکیوں سے سامان دیکھ لیتی تھیں۔ وہ صرف اس وقت نیچے آتی تھیں جب انہیں کچھ خریدنا ہو۔

گجرات آپ ٹرین کے ذریعے پہنچتے تھے۔ سٹیشن شہر سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ اس کے باہر تانگوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ سرخ قمیضوں والے قلی آپ کا سامان تانگوں کے اڈے تک لے جاتے تھے۔ وہاں تانگے والے آپ کو فوراً گھیر لیتے تھے اور آپ کو ہر طرف سے کھینچنا شروع کر دیتے تھے۔ آپ سالم تانگہ بھی لے سکتے تھے یا دوسری سواریوں کے ساتھ بھی بیٹھ سکتے تھے۔ تانگے میں سامان رکھنے کے بعد قلیوں سے جھگڑا شروع ہو جاتا تھا۔ پہلے آپ تھوڑے پیسے بتاتے تھے اور پھر بتدریج بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ بچوں کو گود میں بٹھانے کے بعد چار سواریاں لے کر تانگہ شہر کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔ شہر جانے والی سڑک پیشاور سے آنے والی سڑک کو نصف فاصلے پر کاٹتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہاں آپ کو چنگی پر رکنا پڑتا تھا اور ہر نئی چیز پر مقررہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ مشرقی دروازے سے گزر کر تانگہ بڑی گلی میں داخل ہو جاتا تھا اور ایک چھوٹے سے کنویں پر جسے کھاری کھوئی کہتے تھے، رک جاتا تھا۔ اس کنویں کا پانی کھارا تھا جو اس علاقے میں ایک غیر معمولی چیز تھی۔ یہاں ہم تانگے سے اتر جاتے تھے اور کسی سے سامان اٹھوا کر اپنی گلی میں چلے جاتے تھے۔ تھڑوں کے درمیان صرف پانچ فٹ چوڑی گلی بل کھاتی ہوئی محلہ قانوگو پہنچ جاتی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ اس محلے میں دو چوک تھے۔ ان دونوں کو جوڑنے والی گلی صرف تیس فٹ لمبی تھی اور اپنے دونوں طرف کے گھروں کے درمیان سے ایک سرنگ کی طرح گزرتی تھی کیونکہ گھروں کے اوپر والے حصے چھتوں سے باہم ملے ہوئے تھے۔ دوسرے چوک میں جا کر یہ گلی ختم ہو جاتی تھی۔

دوسرے محلوں میں درمیانے طبقے کے مخصوص گھروں کی طرح ہمارا تین منزلہ گھر تھا مگر اپنی اندرونی اور بیرونی تزئین کی بنا پر دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کا بڑا دروازہ تھا جس کی لکڑی پر نبت کاری کی طرح کام کیا ہوا تھا۔ لکڑی کی بیل بوٹے لوہے کے کیلوں سے چسپاں کئے گئے تھے۔ رات کو ایک مستطیل شہتیر اسے اندر سے بند کر دیتا تھا۔ شہتیر کے لئے باہم مقابل دیواروں میں سوراخ تھے۔ شہتیر کو پہلے ایک سوراخ میں ڈالا جاتا تھا اور پھر اس کو سیدھا سامنے کھینچ کر دوسرے سوراخ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ پرانی حفاظتی ترکیب ارل کہلاتی تھی اور ہمارے گھروں میں عام تھی۔ گھر کی ہر منزل پر دیواروں میں کھڑکیاں اور

روشندان تھے جن میں مختلف شکلوں کے رنگ برنگے شیشے لگے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کا رنگ ہلکا نیلا تھا اور گھر کے سامنے والے حصے پر ہلکا گلابی رنگ تھا۔ گھر کا بیرونی حصہ متشاکل، دلکش اور مزین تھا۔ گھر چوکور تھا اور اس کے درمیان ایک کنواں (خالی جگہ) تھا۔ ہر منزل پر کمروں کے سامنے برآمدے تھے جو کنویں کے گردا گرد بنے ہوا تھا۔ نچلی منزل پر کنواں لکڑی کے ایک چوکور فریم سے جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں، ڈھکا ہوا تھا۔ دوسری منزل پر اس کے چاروں طرف لکڑی کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ سامنے والے حصے کے سوائے جس میں صدر دروازہ تھا گھر کی ساری دیواریں بغیر کھڑکیوں کے تھیں اس لئے کنویں کا مقصد روشنی اور تازہ ہوا مہیا کرنا اور گرمیوں میں گھر کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔ سردیوں میں ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے ہمیں کھڑکیاں بند رکھنی پڑتی تھیں۔ بارشوں میں سارا پانی کنویں میں اکٹھا ہو کر نالیوں کے ذریعے باہر نکل جاتا تھا۔ موسم بہار کے شروع میں جب اولے پڑتے تھے تو نچلی منزل کا فرش اولوں سے ڈھک جاتا تھا۔ اس طرح گنجان آبادی میں بھی قدرتی عناصر کے لئے ہمارے گھر کے دروازے کھلے رہتے تھے۔

صدر دروازے سے گزرنے کے فوراً بعد ڈیوڑھی تھی۔ یہ گھر میں آنے والوں اور پھیری والوں کے لئے ایک قسم کا استقبالیہ تھا۔ کوئی شخص بغیر اجازت ڈیوڑھی سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ ڈیوڑھی کے بائیں جانب ایک تنگ سا زینہ تھا۔ جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے مکان بلند تھا۔ اپنی بلندی کے تناسب سے گھر کے زینے کی چڑھائی بہت زیادہ تھی۔ ہر سیڑھی اونچی تھی۔ ان کے ساتھ اوپر سے نیچے تک ایک موٹا رسا لگا ہوا تھا تاکہ اس کو پکڑ کر چڑھنے میں آسانی رہے۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف ایک اور دروازہ نچلی منزل کے کمروں کی طرف کھلتا تھا۔ دونوں دروازے بند کر دینے کے بعد بھی ڈیوڑھی کھلی رہتی تھی۔ پہلی منزل پر کنویں کے چاروں طرف کمروں میں دن کی روشنی بہت کم آتی تھی۔ ان کی پشت پر دیواروں میں کھڑکیاں نہ ہونے سے یہ کمرے بڑے تاریک ہو گئے تھے۔ ہم ان کو گھر کے گوداموں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پہلی منزل پر ہاتھ سے چلنے والا ایک نلکا تھا۔ اوپر والی منزلوں میں پانی ایک پائپ کے ذریعے چڑھایا جاتا تھا۔

جب کوئی مہمان یا پھیری والے دروازہ کی کنڈی ہلاتے تھے اور اگر گھر کے مرد باہر ہوں تو میرے والدہ اوپر کھڑکی میں سے دیکھتی تھیں۔ کوئی رشتے دار ہوتا تو وہ نیچے اتر آتیں۔ سامان بیچنے والوں کا اوپر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سامان کے ساتھ اوپر چڑھنا ویسے ہی مشکل تھا۔ اگر کچھ لینا ہوتا تو میری والدہ نیچے آ کر خرید لیتیں یا رسی کے ذریعے

ایک ٹوکری نیچے لٹکا دیتی تھیں اور جب سودا ٹوکری میں رکھ دیا جاتا تھا تو وہ اسے اوپر کھینچ لیتی تھیں۔ مرد گھر میں ہوتے تو ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ رواج یہ تھا کہ آنے والے نچلی منزل سے ہی آواز دیں۔ وہیں ان کو بتا دیا جاتا تھا کہ وہ اوپر آ جائیں یا وہیں انتظار کریں۔ اگر موسم خراب ہوتا تو وہ ڈیوڑھی میں انتظار کرتے۔ عورتیں صرف آواز دے کر ہی اوپر آ جاتی تھیں۔ قریبی رشتے دار اور قریبی دوست بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

ڈیوڑھی کا ایک غم ناک استعمال بھی تھا۔ کسی کی وفات پر پرسا دینے والے مرد تو باہر گلی میں تھڑے پر بیٹھ جاتے تھے لیکن عورتیں ڈیوڑھی میں چلی آتیں۔ رشتے دار اور قریبی دوست اوپر آ جاتے تھے۔ جب میت نیچے لائی جاتی تو جنازے کی تیاری کے لئے اسے ڈیوڑھی ہی میں رکھا جاتا۔ پرسا دینے والی عورتیں بھی ڈیوڑھی ہی میں اظہار افسوس کرتی تھیں۔

شادی کے دنوں میں ڈیوڑھی کا ایک مخصوص استعمال بھی تھا۔ رخصتی کے وقت دلہن کچھ دیر ڈیوڑھی میں رکتی تھی تاکہ اپنے والدین کو الوداع کہہ سکے۔ جب وہ اپنے نئے گھر پہنچتی تھی تو اس کا استقبال ڈیوڑھی ہی میں ہوتا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب اس کا شرمیلا پن بے تکلفی میں بدل جاتا تو نوجوان دلہن بھاگ کر ڈیوڑھی میں پہنچتی تھی تاکہ اپنے شوہر سے جلدی سے گلے مل سکے۔ سمجھ دار ساس خود بہو کو نیچے جانے اور دروازہ کھولنے کے لئے کہتی تھی۔ چوری چھپے کی محبت میں لڑکی ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے چھپ کر لڑکے کو متوجہ کرنے کے لئے مختلف آوازیں نکالتی تھی تاکہ بھونڈا سا بوس و کنار ہو سکے۔

ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم پہلی منزل پر پہنچتے تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں ایک پانی ڈالنے کی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں نلکوں کی آمد سے پہلے ماشکی اس میں پانی ڈال دیتا تھا جو ایک نالی کے ذریعے باورچی خانے میں پہنچ جاتا تھا۔ اسی جگہ سے برآمدہ شروع ہوتا تھا اور گھر کے اندرونی طرف چاروں طرف گھوم جاتا تھا۔ دائیں طرف ایک لمبا کمرہ تھا۔ یہ ہماری بیٹھک تھی۔ اس کے سامنے دو کمرے تھے۔ ان میں ایک تو سونے کے لئے استعمال ہوتا تھا اور دوسرے میں رضائیاں' کمبل اور دوسری ایسی اشیا رکھی جاتی تھی جن کی ضرورت اکثر پیش آتی رہتی تھی۔ سونے کے کمرے کے پٹ تو سادہ تھے لیکن بیٹھک کے دروازوں میں رنگ دار شیشے لگے ہوئے تھے۔ باورچی خانے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یہ ایک کھلا دالان تھا۔

دوسری منزل بھی پہلی منزل جیسی ہی تھی سوائے اس کے کہ باورچی خانے کے مقابل سمت میں جگہ بالکل کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ یہ منزل زیادہ روشن تھی اور اس کھلی جگہ کی وجہ سے زیادہ کشادہ دکھائی دیتی تھی۔ چھت پر کھلے آسمان کے نیچے ایک تندور تھا۔ گرمیوں میں اس میں روٹیاں پکتی تھیں اور کھانا گرم رکھا جاتا تھا۔

تیسری منزل پر مہتابیاں تھیں۔ پردے کے لئے ان میں لکڑی کی اونچی دیواریں تھی۔ زینہ ایک بند جگہ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ یہاں پانی کے بغیر غسلخانے تھے۔ یہاں سے چند سیڑھیاں کھلی چھت پر چلی جاتی تھیں۔ یہاں سے ہم قلعے کے قریب سے شروع ہونی والی ڈھلوان کی عین کوہان پر کھڑے ہو کر پورے شہر کا نظارہ کر سکتے تھے۔ ڈھلوان ہرے بھرے کھیتوں تک جاتی دکھائی دیتی تھی۔ زمین پر چھائی ہوئی دھند سے اوپر کو نکلتے ہوئے دور برف سے ڈھکی ہوئی ہمالیہ کی چوٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ سردیوں میں بارش کے بعد ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان یہ بڑی شاندار نظر آتی تھیں۔ ان میں صبح کے وقت گلابی اور شام کو کاسنی رنگ جھلکتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد جھٹ پٹے میں یہ چوٹیاں ماند سے نیلے رنگ کی ہو جاتی تھیں۔ برف سے ڈھکی چوٹیاں سورج کی روشنی کو اس وقت بھی منعکس کرتی تھیں۔

پہلی اور دوسری منزلوں پر برآمدوں کی دیواروں پر ایرانی اسلوب کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان کا اہم بنیادی عنصر نازک پھول دان تھے جن میں سے خوبصورت پھولوں سے لدی ہوئی نازک ٹہنیاں باہر نکلتی تھیں۔ پھولوں میں گلاب' انار' نرگس اور سوسن تھے۔ پتا نہیں ان دیواروں پر کب پلستر ہوا تھا اور رنگ کب ہوا تھا۔ لیکن رنگ اور پلستر بڑی دیر سے قائم تھے۔ تصویریں تھوڑی سی دھندلا گئی تھیں۔ تصویروں کی لمبی لائنیں برش سے بڑی نزاکت سے کھینچی گئی تھیں۔

ہمارا رہن سہن بڑا غیر رسمی تھا۔ ہمارے ہاں کوئی خلوت نہیں تھی اور ہم کچن میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ اگر کوئی مہمان ہو تو ملازم کھانا بیٹھک میں لے آتا۔ رشتے دار ہوں تو دوسری منزل کی بیٹھک میں بیٹھتے تھے اور اگر مہمان تکلف والے یا اجنبی ہوتے تو انہیں اوپر والی بیٹھک میں لے آتے تھے۔ خواتین درمیانی منزل پر ہی رہتیں۔ طرز رہائش موسموں کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔ سردیوں کے دن ہم تیسری منزل کی چھت پر دھوپ میں گزارتے تھے اور شامیں اور راتیں دوسری منزل پر جو ان دنوں میں بڑی آرام دہ ہوتی تھی۔ گرمی کے دن ہم نچلی منزل کے تاریک کمروں میں گزارتے تھے اور شامیں دوسری

حنل پر اور جیسے ہی گرمی زور پکڑتی شام کو ہم چھت پر چلے جاتے تھے۔

ہمارے گھر خاصے خود کفیل تھے۔ گھروں میں استعمال ہونے والی اجناس جیسے گندم، مکی، چاول اور دالیں ہم وافر مقدار میں خرید لیتے تھے جو اگلی فصل آنے تک چلتی تھیں، کافی دیر بعد بھی کی اور گندم میری والدہ چکی میں خود ہی پیس لیتی تھیں۔ کپاس خرید کر خود ہی چھوٹی سی بیلنی پر بیل لیتی تھیں۔ روئی دھنکنے والے جب پھیری لگانے آتے تو وہ اس روئی کو دھنکوا لیتی تھیں۔ دھنکنے والا اپنے پنجن کو چھت سے باندھ لیتا تھا اور روئی کو دھنک دیتا تھا۔ وہ خود ہی لکڑی کے چرخے پر روئی کات لیتی تھیں اور پھر سوت جولاہے کو دے دیتی تھیں تاکہ وہ ان کی حسب منشا بن دے۔ وہ گری کا تیل اور سوڈا خود ہی خرید کر کپڑے دھونے والا صابن بنانے والے کو دے دیتی تھیں۔ وہ اچار، چٹنیاں مربے خود ہی تیار کرتی تھیں۔ اجزا پنساری سے خرید کر وہ شربت بنانے والے کو دے کر شربت بنوا لیتی تھیں۔ وہ سینا پرونا اور کشیدے کا کام بھی خود ہی کرتیں اور اگر ہماری بہنیں ہوتیں تو وہ آہستہ آہستہ ان کا جہیز بھی تیار کر کے محفوظ کر لیتیں۔ گھر کی گائے اور بھینس کے چارے کی وہ خود ہی نگرانی کرتی تھیں۔ کھل، بنولے، چھان، نمک، گڑ اور بچی ہوئی خشک چپاتیاں ملا کر بھینس کا چارہ تیار کیا جاتا تھا۔ وزن کے حساب سے وہ دھات کے برتن خریدتی تھیں اور پھر خود ہی قلعی کروا لیتی تھیں۔ جب یہ برتن خراب ہو جاتے یا ٹوٹ جاتے تو وہ وزن کے حساب سے انہیں بیچ بھی دیتی تھی۔ ہم لکڑی کے لٹھے خرید لیتے تھے اور انہیں ان کشمیریوں سے کٹوا لیتے تھے جو سردیوں میں اپنا وطن چھوڑ کر مزدوری کے لئے پنجاب آیا کرتے تھے۔ ہم نے زمین سے اپنا رشتہ گملوں میں سبزیاں اگا کر قایم رکھا۔

ہمارا محلہ بڑا محفوظ تھا۔ دونوں چوکوں میں ہندو اور مسلمان آباد تھے۔ برقعے کے سوا جو مسلمان عورتیں گھر سے باہر جاتے وقت پہنتی تھیں، ہمارے لباسوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہندوؤں میں گھگرے کا رواج عملی طور پر ختم ہو چکا تھا اور میرے زمانے میں چند ہی ہندو عورتیں ہوں گی جو گھگرا پہنتی تھیں۔ عورتیں ہمیشہ شلوار قمیض ہی پہنتی تھیں اور ہمارے محلے میں کوئی سماجی تفریق نہیں تھی۔ ہمارے محلے میں ایک مسلمان وکیل، ایک ہندو حلوائی، میونسپل کمیٹی کا ایک مسلمان کلرک، اور ایک برہمنوں کا خاندان رہتا تھا۔ لڑکیاں لڑکے اکٹھے کھیلتے تھے اور ظہر کے بعد تمام عورتیں اپنی پیڑھیاں اور کشیدہ کاری کا سامان لے کر تھڑوں پر آبیٹھتی تھیں، آپس میں باتیں کرتیں اور گپیں ہانکتی تھیں۔

لوگ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھتے تھے۔ اکثر حوائج ضروریہ کے لئے باہر کھیتوں میں چلے

جاتے تھے۔ کچھ سیر کے لئے نکل جاتے تھے۔ راستے میں کسی نیم کے درخت سے ایک ٹہنی توڑ کر اور اس کا سرا دانتوں سے چبا کر مسواک بنا لیتے تھے۔ اس سے دانت صاف کر کے اسے پھینک دیتے تھے اور رہٹ پر جا کر نہا لیتے تھے۔ سردیوں میں کنویں کا پانی گرم ہوتا تھا اور گرمیوں میں ٹھنڈا۔ وہاں دوسرے لوگوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور آپس میں تبادلہ خیالات بھی ہو جاتا تھا۔ اخباریں ابھی گجرات نہیں پہنچی تھیں۔ واپسی پر گھر آتے ہوئے وہ سبزی منڈی سے گزرتے اور گھر کے لئے تازہ سبزیاں خرید لیتے تھے جو ان کے آنے سے پہلے ہی گجرات کے اطراف کھیتوں سے منڈی میں پہنچ جاتی تھیں۔ صبح کا کھانا کھا کر مرد دس بجے تک اپنے اپنے کام پر نکل جاتے تھے۔ جو دفتروں میں کام کرتے تھے وہ پانچ بجے گھر واپس پہنچ جاتے تھے اور پھر جا کر شام تک کام کرتے تھے۔ سردیوں اور گرمیوں کے اوقات کار مختلف ہوتے تھے۔ گرمیوں میں دفتر اور سکول چھ بجے شروع ہو جاتے تھے اور دوپہر کو بند ہو جاتے تھے۔ سردیوں میں کام دس بجے شروع ہو کر شام چار بجے ختم ہو جاتا تھا۔ گرمیوں میں سب لوگ دوپہر کو سو جاتے تھے اور دوپہر کے بعد دوستوں کو ملنے یا سیر کرنے نکل جاتے تھے۔ بعض اوقات شام کے کھانے کے بعد میاں بیوی دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لئے اکٹھے چلے جاتے تھے لیکن بلامقصد ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ عام طور پر لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ زندگی اس طرح ایک ہموار ست رفتاری سے چلتی تھی۔ اس میں تھوڑی بہت تیزی تہواروں اور مہمانوں کی آمد پر آ جاتی تھی۔ ایسے موقعوں کا بڑا انتظار رہتا تھا۔

ہندوؤں کے کئی تہوار تھے لیکن پر جوش طریقے سے منائے جانے والے تہوار لوہڑی، بسنت، ہولی، بیساکھی، رکھڑی، دوسرا اور دیوالی تھے۔ لوہڑی کا تہوار جنوری میں آتا تھا۔ زمین میں گڑھا کھود کر آگ جلائی جاتی تھی۔ لوگ مخصوص مٹھائیاں جن پر سرسوں کے دانے لگے ہوتے تھے اور بھنے ہوئے چاول کھاتے تھے۔ بچے کی پہلی لوہڑی پر خاص تیاریاں کی جاتی تھیں۔ آتش بازی اور بارود کے گولے بھی چھوڑے جاتے تھے۔ لوہڑی کے آنے سے پہلے ہی بچے لکڑیاں اکٹھا کرنی شروع کر دیتے تھے۔ شام کو عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے آگ کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے جو جنوری کے دنوں میں بڑی اچھی لگتی تھی۔ ہم تھکان اور نیند سے چور رات گئے گھر واپس آکر سو جاتے تھے اور ہمارے کانوں میں پٹاخوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔

بسنت موسم بہار کا تہوار تھا۔ یہ پکی ہوئی فصلوں کے پیلے رنگ سے منسوب تھا اور

شہروں اور دیہاتوں میں ایک ہی طرح منایا جاتا تھا۔ اسی سے پتنگ بازی کا آغاز ہوتا تھا۔
اس کے بعد ہولی آتی تھی۔ یہ بڑی بد تمیزی کا تہوار تھا اور ہر سال بد سے بدتر ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہ تمام پابندیوں سے آزاد تہوار تھا جب ہر کوئی ہر کسی پر رنگ دار پانی یا رنگ پھینک سکتا تھا اور دوسرے لوگوں کے چہروں پر رنگ مل سکتا تھا۔ اس دن ہر شخص پرانے کپڑے پہنتا تھا کیونکہ دن کے ختم ہونے پر وہ کپڑے برباد ہو چکے ہوتے تھے۔ ان کو اتار کو الگ رکھ دیا جاتا تھا تاکہ اگلے سال پھر کام آ سکیں۔ چہرے اور ہاتھوں سے رنگ صاف کرنے میں انہیں رگڑ رگڑ کر دھونا پڑتا تھا۔ اس معاملے میں تو کئی گلیاں بد نام تھیں کیونکہ ان میں گزرنے والوں پر چھت سے راکھ، گرد و غبار اور گندگی تک پھینکی جاتی تھی۔ خواہ کچھ ہو جائے کوئی شخص اس کا برا نہیں مناتا تھا اور ہر بات کو مذاق میں ٹال دیا جاتا تھا۔ گھر کے اندر بھی چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔ گھر آنے والے دوست حباب آپ کو کھینچ کر باہر لے آتے تھے اور ایک دفعہ رنگے جانے پر دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کر کے بدلہ لیا جاتا تھا۔ عورتیں محلوں میں ہولی کھیلتی تھیں اور مرد گلیوں میں دیوانہ وار یہ تہوار مناتے تھے۔ ہولی اور اپریل فولز ڈے ہم مخرج سمجھے جاتے ہیں۔

ہولی کے بعد اپریل میں بیساکھی آ جاتی تھی۔ ہم یہ تہوار شہر سے چھ میل دور دریائے چناب کے کنارے مناتے تھے۔ لیکن یہ مختلف قسم کا تہوار تھا گو اس میں بھی شور اور ہنگامے کا ایک خوشگوار امتزاج ہوتا تھا۔ یہ تہوار کے ساتھ دریا پر پکنک منانے کا موقع بھی تھا۔

اس کے لمبے عرصے کے بعد اگست میں راکھی یا رکھڑی کا تہوار آتا تھا۔ راکھی یا رکھڑی سے مراد حفاظت کا بندھن ہے۔ اس موقعے پر بہنیں اپنے بھائیوں یا منہ بولے بھائیوں کی کلائی پر ایک ریشمی تاگے کا بندھن باندھتی ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا بھائی نہ ہو تو وہ کسی بھی لڑکے کو اپنا بھائی بنا لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ رکھڑی کا بندھن بڑا مزین ہو گیا اور اس میں ریشمی پھندنے اور شیشے کے موتی لگنے لگے۔ ہم سب اپنی اپنی کلائیوں پر بندھے ہوئے بندھنوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ شروع میں تو اس کا مطلب تھا کہ بھائی بہن کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ بے معنی ہو گیا۔ رکھڑی کے بدلے میں بھائیوں کو اپنی بہنوں کو کچھ پیسے دینے ہوتے تھے۔ ہم بچوں کو یہ بہت برا لگتا تھا۔ ہمیں اپنی بہنوں کو دینے کے لئے چاندی کے تین روپے دیئے جاتے تھے۔ ہماری کوئی بہن تھی ہی نہیں اس لئے ہم احتجاج کرتے تھے کہ ہم تو ان روپوں کو بہتر طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں جب کہ یہ

لڑکیاں انہیں اپنے گلوں میں ڈال دیں گی۔

رکھڑی کے بعد دسہرا اور دیوالی بہترین تہوار تھے۔ ان دونوں تہواروں کا تعلق راماین سے ہے۔ دسہرے پر رام اور لکشمن کی راون کے ساتھ لڑائی کا ناٹک پیش کیا جاتا تھا جس میں لنکا کے راکھشش راجا راون کو شکست ہوتی ہے۔ دیوالی پر چودہ برس کے بن باس کے بعد رام کی واپسی کی یاد میں خوشی منائی جاتی تھی۔ دسہرہ آنے سے پہلے پوری راماین کو ڈرامائی صورت میں پیش کرنے کے لئے سارے شہر سے چندہ اکٹھا کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لئے شہر میں ایک کمیٹی بنائی جاتی تھی۔ مقامی ڈرامائی جوہر سے ایکٹروں کا انتخاب کیا جاتا تھا اور چوک میں سٹیج تیار کیا جاتا تھا۔ ایک مہینے تک روزانہ راماین بتدریج پیش کی جاتی تھی۔ یہ بالکل ایک غیر پیشہ ورانہ کوشش ہوتی تھی۔ تمام ایکٹر مرد اور لڑکے ہوتے تھے اور ہر پیشکش مفت ہوتی تھی۔ سٹیج سے متعلق کچھ وقتی تدابیر تو بڑی ذہانت پر مبنی ہوتی تھیں اور ان کی وجہ سے لوگ حیران ہوتے تھے کہ سٹیج کے مختلف مسایل ڈائریکٹر نے کیسے حل کر لئے۔ سب سے مشکل سین وہ تھا جس میں رام، لکشمن اور ہنومان وہ سمندر پار کرتے ہیں جو ہندوستان اور لنکا کے درمیان ہے۔ ہنومان کا ہمالیہ کی طرف اڑ کر جانا یا سروپ نکھا کی طرف پیش قدمی پر لکشمن کا اس کی ناک کاٹ ڈالنا۔ (جو چنداں مرادنگی نہیں تھی) مشکل سین تھے۔ بعض اوقات کئی سین چھوڑ بھی دیئے جاتے تھے اور کبھی کبھی علامتوں کا استعمال بھی کیا جاتا تھا یا پھر ایکشن کی جگہ صرف الفاظ یا ایکشن اور الفاظ دونوں استعمال کئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ڈائریکٹر نے کھیل سے ایک دن پہلے اعلان کیا کہ وہ رام اور اس کی فوج کو واقعی سمندر میں سے گزرتا ہوا دکھائے گا۔ ہم سب متجسس تھے کہ یہ کیسے ہو گا کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی نے یہ مشکل حل نہیں کی تھی۔ ایک چھوٹی سی ہلتی جلتی سٹیج پر آپ سمندر کیسے دکھائیں گے؟ چنانچہ مقررہ وقت پر جس کا سب کو انتظار تھا دو آدمی سٹیج پر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک گیلی سفید دھوتی تھی جسے انہوں نے کناروں سے پکڑا ہوا تھا اور وہ اس کو ایسے ہلا رہے تھے جیسے کہ وہ اسے سکھا رہے ہوں۔ ہوا میں لہراتے وقت وہ ایسے لگتی تھی جیسے سمندر کی لہریں ہوں۔ پھر رام اور اس کے ساتھی آئے اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد دھوتی کو پھلانگ کر دوسری طرف لنکا پہنچ گئے۔ ہر کام بڑی سادگی اور موثر طریقے سے کیا گیا تھا۔ سب دیکھنے والوں نے بڑی تعریف کی۔ ہم سمندر سے ایک ہزار میل دور تھے اور ہمیں خیال نہ آیا کہ اگر دھوتی نیلی ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔
اس امید میں کہ شاید ہمیں بھی کوئی کردار بالخصوص ہنومان کے بندروں کا مل جائے ہم

اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔ ہمارے چہروں پر بندروں جیسے سرخ رنگ کا نقاب ہوتا تھا۔ ہماری پتلونیں اور نکریں سرخ ہوتی تھیں جن میں سے دم باہر نکلی ہوئی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں بڑی سجی ہوئی کمان اور تیر ہوتے تھے اور ہم سٹیج پر ناچتے کودتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی ہنومان ہمیں ایک آدھ مکہ بھی رسید کر دیتا تھا جس پر مکا کھانے والا بندر واقعی چیخنا شروع کر دیتا تھا۔ اس پر دوسرے بندر اس کی ہنسی اڑاتے تھے کہ وہ جعلی جنگجو ہے۔ اگر زمین پر بیٹھنا نہ چاہیں تو رات کے کھانے بعد ہم اپنی اپنی کرسیاں لے کر رام لیلا کے میدان میں پہنچ جاتے تھے۔ رات گئے تک تماشا جاری رہتا تھا اور دوسرے دن بڑی باریک بینی سے اس پر تبصرہ ہوتا تھا اور گزرے سال کی اداکاری سے اس کا موازنہ ہوتا تھا۔

اداکاری کا معیار روز بروز اور سال بسال بدلتا رہتا تھا لیکن تماشائی بڑے نرم دل تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مقامی حسد اور رقابت موجود نہیں تھی۔ میرے خیال میں جن دیوتاؤں کی وہ روزانہ پوجا کرتے تھے جیسے رام' سیتا وغیرہ ان کو رنگ برنگی سٹیج پر ہنستے کھیلتے اور زندہ دیکھنے پر وہ بڑے متاثر ہوتے تھے۔ کیکئی کے کہنے پر اس کے سوتیلے بیٹے رام کو بن باس ملنا تاکہ اس کا اپنا بیٹا بھرت راجا بن جائے' اس پر راجا دسرتھ کا شدید کرب میں مبتلا ہونا' بھرت کی وفاداری اور ضد کہ وہ بھی رام کے ساتھ جائے گا' راون کا سیتا کو اغوا کرنا اور سیتا کا چیخنا چلانا' جنگ میں زخم کھا کر لکشمن کا بے ہوش ہو جانا اور پل پل ہنومان کا انتظار جو سنجیونی بوٹی لانے کے لئے دو ہزار میل دور ہمالیہ گیا ہوا تھا' ایسے دل خراش واقعات تھے جو ناظرین کو رلا دیتے تھے۔ یہ سادہ مرد اور عورتیں اداکاری کی حقیقت نگاری سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ وہ اپنے خیالات اور زندگی کے ہیروؤں کی پوجا کرنا چاہتے تھے اس حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ شعوری اور غیر شعوری مزاح بھی چلتا تھا مثلاً جب لکشمن سروپ نکھا کا کردار ادا کرنے والے لڑکے سے حقیقت میں نفرت کرتا ہو اور وہ اتنی حقیقت نگاری سے اداکاری کرے کہ وہ واقعی سروپ نکھا کی ناک کاٹتا نظر آئے اور اس پر سروپ نکھا کا کردار ادا کرنے والے لڑکے کی اصلی چیخوں پر سب قہقہے لگاتے تھے۔ رام کی فوج کا کردار ادا کرنے والے لڑکوں کے پن لگے ہوئے تیروں سے راون کے فوجیوں کو کچوکے لگانے کی حقیقت نگاری کو بھی لوگ پسند کرتے تھے۔

رام لیلا کے اس عظیم رزمیہ کو ہر رات رفتہ رفتہ آخری سین تک پیش کیا جاتا تھا حتے کہ آخری سین میں راون کو شکست ہو جاتی تھی۔ یہ سین دسہرے کے دن کھلے میدان میں دکھایا جاتا تھا۔ کاغذوں سے بنا ہوا جس کے اندر پٹاخے بھرے ہوتے تھے' راون کا

نفرت انگیز اور قبیح پتلا اور اس کے ساتھ اس کے بھائی کمبھ کرن اور بیٹے اندر جیت کے کاغذی پتلے میدان میں کھڑے کئے جاتے تھے۔ بھڑکیلے نئے کپڑوں میں ملبوس ہم اس میلے میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور اپنی چونی یا اٹھنی جو اس موقعے پر ہمیں ملا کرتی تھی' بے دریغ خرچ کرتے تھے حتیٰ کہ رام لیلا کے نقطہ عروج کا لمحہ آن پہنچتا تھا۔ شام کے وقت ایک گھوڑا گاڑی میں رام اور لکشمن آتے تھے اور تالیوں کے شور میں ایک بڑے ڈرامائی انداز میں رام ایک تیر راون پر چھوڑتا تھا۔ یہ رام کا آخری معرکہ تھا۔ تیر لگتے ہی راون اور اس کے ساتھی شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتے تھے۔ پٹاخے اور گولے چھٹتے تھے اور بارودی ہوائیاں آسمان کا رخ کرتی تھیں۔ راون دھڑام سے گر پڑتا تھا اور بارود کے گولوں' پٹاخوں اور شعلوں سے اس کا جسم لرزتا تھا۔ ہم بھرے ہوئے پیٹوں کے ساتھ گھر واپس لوٹتے تھے اور افسردہ ہوتے تھے کہ رام لیلا کا موسم ختم ہو گیا ہے لیکن اس خیال سے خوش بھی ہوتے تھے کہ جلد ہی یعنی اکیس دن بعد دیوالی کا بہترین تہوار آنے والا ہے۔

دیوالی کی صورت جیسے کہ مجھے سکنڈنیویا میں بعد میں پتہ چلا' کرسمس کی ایک جھلک سی ہے۔ یہ ایک گھریلو تہوار ہے جس پر سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا ہے۔ دیوالی کے دن گھر پر رہنا بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے تاکہ لکشمی دیوی کی نوازشات میں آپ بھی شامل ہوں۔ دیوالی کی تیاریاں کئی دن پہلے شروع ہو جاتی تھیں اور ہر شخص کو ان میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ عورتیں مٹھائیاں تیار کرتی تھیں اور دیوار پر بیلیاں بناتی تھیں۔ دیوار کے ایک حصے پر گائے کے گوبر کا پلستر کیا جاتا تھا۔ اس پر سفید رنگ کیا جاتا تھا اور پھر سرخ رنگ سے سواستیکا بنایا جاتا تھا۔ مٹی اور بھوسے کو ملا کر دیئے رکھنے کے لئے دیوار پر چھوٹے چھوٹے طاق بنائے جاتے تھے۔ مٹی کے دیئے جن سے لفظ دیوالی بنا ہے' پانی میں بھگوئے جاتے تھے۔ ان دیئوں کے لئے چھوٹی لڑکیاں روئی کی بتیاں بناتی تھیں۔ ہر دیئے میں سرسوں کا تیل ڈال کر اس میں وہ ایک بتی رکھ دیتی تھیں۔ بعد میں ان کی جگہ رنگ برنگی موم بتیاں آ گئیں۔ ہمارے والد کو پورا گھر رنگ کروانا پڑتا تھا۔ وہ چاندی کے نئے روپے اور بازار سے مٹھائیاں خرید کر لاتے تھے۔ اس موقعے پر کئی چیزیں تو گھر پر ہی بنائی جاتی تھیں اور کئی بازار سے خریدی جاتی تھیں جیسے سفید' گلابی اور زرد رنگ کی مخصوص مٹھائیاں جنہیں گھوڑوں کی صورت میں سانچوں سے بنایا جاتا تھا' لوگوں اور گھوڑوں کے مٹی کے مجسمے' رام' لکشمن' سیتا' لکشمی' ہنومان اور دوسرے دیوی دیوتا اور اساطیر کے کچھ سینوں کی رنگین تصویریں' بانس اور کاغذ سے بنی ہوئی لالٹینیں' موم بتیاں اور آتش بازی۔

دیوالی کے دن بڑی سرگرمی نظر آتی تھی۔ لالٹینیں لٹکانا' دیٔوں کو قطار در قطار رکھنا جو دروازے کی سیڑھیوں سے شروع ہو کر اوپر کھڑکیوں اور منڈیر تک اور پھر گھر کے اندر اور بیٹوں پر۔ شام کو جب ہر چیز تیار ہو جاتی تھی تو ہم ایک دفعہ پھر نہاتے تھے اور نئے کپڑے پہنتے تھے۔ اس کے بعد ہم بڑے بے صبرے ہو جاتے تھے اور والدین کو بار بار کہتے تھے کہ وہ دیوالی شروع کریں اور ہمیں بار بار یہی بتایا جاتا تھا کہ اندھیرا ہونے تک ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ دن کے وقت تو دیئے نہیں جلا سکتے۔

نومبر میں رات جلدی آ جاتی اور ہمارا شوق دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ ہم دیئے جلانے کے لئے دوڑ پڑتے تھے۔ اگر تھوڑی سی ہوا چل رہی ہو تو یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ مٹی کے دیئے کو ہوا بجھا دیتی ہے اور دیئوں کی قطار میں اندھیرے رخنے در آتے ہیں۔ عموماً شام کو ہوا نہیں ہوتی تھی اور قطار قطار دیئوں کے لرزتے ہوئے شعلے ہمارے گھر اور لوگوں کے گھروں کا ایک روشن خاکہ کھینچ دیتے تھے۔ پورا محلہ بقعۂ نور بن جاتا تھا۔ ہم دوسرے بچوں کو پکارتے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کا شو بہتر ہے مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن ابھی تک مٹھائیوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے گھر میں پوجا ہوتی تھی۔ پوجا کے لئے ہم سب کو اکٹھا کر کے ہماری والدہ ہمیں بیٹوں کے سامنے بٹھا دیتی تھیں۔ دیئوں کے سامنے فرش پر ایک تھالی رکھی جاتی تھی جس میں چاندی کے روپے ہوتے تھے۔ روپوں پر زعفران لگا ہوتا تھا اور انہیں چاولوں سے ڈھانک دیا جاتا تھا۔ یہ لکشمی دیوی کی نذر تھی۔ یہی لکشمی پوجا ہے۔ مٹھائیوں کی تھالیاں فرش پر رکھی جاتی تھیں۔ جب پوجا ختم ہو جاتی تھی تو پرشاد بانٹا جاتا تھا۔ پوجا ختم ہونے پر ہم پٹاخے چلانے کے لئے باہر دوڑ پڑتے تھے۔ آتش بازی سے جس میں پھل جھڑیاں' ہوائیاں' رنگین موم بتیاں وغیرہ ہوتی تھیں' ہمارا چھوٹا سا محلہ ایک پری خانہ بن جاتا تھا اور ہمارے سادہ ذوق کی تسکین کرتا تھا۔ آتش بازی کے بھی اپنے نام تھے جیسے مہتابیاں اور انار جس سے چنگاریوں کی صورت میں روشنی کا فوارہ نکلتا تھا۔

ایک مرغوب مرحلہ جس کا ہمیں شدید انتظار رہتا تھا' وہ بازار میں جا کر دیوالی دیکھنا تھا۔ ہمارے بزرگ ہمیں بازار لے جاتے تھے۔ ہم ان کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے کہ بھیڑ میں کہیں گم نہ ہو جائیں۔ یہ نظارہ بڑا دلکش ہوتا تھا۔ گھروں پر قطار در قطار رکھے ہوئے دیئے' موم بتیاں' لالٹینیں' بالکنیوں سے لٹکتی ہوئی رنگ برنگی لالٹینیں اور پھر مٹھائیوں کی دکانیں جو گیس کے لیمپوں کی روشنی میں دمکتی تھیں' اور جن میں مخروطی صورت میں مٹھائیوں کے

انبار اور چمکدار تھالوں میں اہراموں کی صورت میں اوپر جاتی ہوئی ہر رنگ کی مٹھائیاں جن پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوتے تھے اور ان تحریص کی پہاڑیوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا حلوائی جو بازار میں کھڑے لوگوں کو تول تول کر مٹھائیاں بیچتا تھا۔ اس دن وہ معمول سے زیادہ کم تولتا تھا۔ جب ہم گھر پہنچتے تھے تو سارا گھر کھلا پڑا ہوتا تھا' ہر کمرے میں روشنی ہوتی تھی اور پوجا کی جگہ کیسر میں رنگے ہوئے روپوں کی تھالی ابھی وہیں رکھی ہوتی تھی۔ دیئوں کی قطاریں ابھی بھی جھلملا رہی ہوتی تھیں اگرچہ کئی دیئے بجھ چکے ہوتے تھے۔ آج خوشحالی کی دیوی نے ہر گھر میں جانا ہے اس لئے سب دروازے کھلے رکھنا اور تمام بتیاں جلتی رکھنا بہت ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ دیوی کا شاندار استقبال ہو سکے۔ دیوی کو خوش کرنے کے لئے جوئے کا عجیب و غریب رواج پڑ گیا تھا۔ کئی دن پہلے سے ہی لوگ مختلف کھیلیں اور جوا کھیلنا شروع کر دیتے تھے اور دیوالی کی رات کو تو ہمارے والدین بھی ہمیں جوا کھیلنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ ہم کوڑیوں سے جوا کھیلتے تھے جو اس وقت بھی سب سے چھوٹا سکہ رائج الوقت تھا۔

دوسرے دن زبردست افسردگی کا احساس ہوتا تھا۔ دیوالی تو جا چکی ہے اور آنے والے تین مہینوں میں کوئی تہوار نہیں ہو گا۔ اس وقت لوہڑی آئے گی۔ ہم اداس ہو جاتے تھے لیکن اس خیال سے کہ اس دن چھٹی ہے' ہماری اداسی ذرا کم ہو جاتی تھی۔ ہم موم بتیوں کا موم اکٹھا کرنے میں لگ جاتے تھے اور پھر اس موم سے بتیاں بنانے کی نیم دلانہ کوشش کرتے تھے۔ لیکن اصل دیوالی تو جا چکی ہوتی تھی۔

وہ تہوار جو ہم جوش و جذبے سے مناتے تھے ہندوں اور مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی تلخیوں سے خراب ہوتے چلے گئے۔ ہندوں کو عیدالضحیٰ پر مسلمانوں کا گائے کی قربانی دینا برا لگتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے تہواروں پر شور و شغب پر اعتراض کرتے تھے اور کسی بھی تہوار کو خواہ وہ ہولی ہو' دیوالی ہو یا دسہرہ ہو بغیر کسی ہنگامے کے منانے نہیں دیتے تھے۔ بعض اوقات تو یہ تہوار خون خرابے کا باعث بھی بن جاتے تھے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ خون خرابے سے بچنے کے لئے برسوں تک ہم نے کوئی تہوار منایا ہی نہیں یہاں تک کہ رام لیلا بھی ختم کر دی گئی لیکن اس کے برعکس تہواروں کی لمبی فہرست میں ہم نے نئے تہوار شامل کرنے شروع کر دیئے۔ ہوٹلوں' کلبوں' فوج کی میسوں میں یہاں تک کہ گھروں میں بھی کرسمس برطانوی دور کے مقابلے میں آج زیادہ دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ کلبوں میں بچوں کی کرسمس پارٹیاں اور نئے سال کے رقص ہوتے ہیں۔ یوم آزادی

اور ریپبلک ڈے بھی اب تہواروں کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں ہم نے نئے تہوار منانے شروع کر دیئے ہیں پرانے تہوار اپنی اہمیت کھو رہے ہیں۔

ساتواں باب

میری سکول کی تعلیم ختم ہونے تک ہم تقریباً ایک سال تک گجرات میں ہی رہے۔ سات سال بعد میں واپس آیا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ بطور ایک بچے کے اور بطور ایک بالغ کے میں گجرات کی شہری زندگی سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ گجرات واقعی ایک زندہ شہر تھا۔ یہ شہر تقریباً خود کفیل تھا اور اس کی یہ خود کفیلانہ کیفیت ازمنہ وسطی والی تھی جس کے مطابق لوگ اپنے اپنے موروثی ہنروں اور پیشوں سے متعلق تھے اور اپنی اپنی برادریوں میں بڑے دوستانہ اور بھائی چارے کے ماحول میں رہتے تھے۔ ایسے گنجان آباد شہر میں جہاں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا تھا اور دوسروں کے معاملات سے واقف تھا، رواداری کی بڑی ضروری تھی۔ تاہم میرے خیال میں اس رواداری کی سطح کے نیچے کچھ زیریں روئیں ضرور تھیں۔ یہ بڑا پیچیدہ قسم کے ہیجان پیدا کرتی تھیں جو سوسائٹی کی پریشانی کا باعث بنتی تھیں لیکن سطح پر کسی قسم کا غوغا نظر نہیں آتا تھا۔ صدیاں گزر جانے کے بعد شہر کا ایک مزاج بن گیا تھا۔ گجرات کی اپنی شہرت تھی جو قدرے ناخوشگوار بھی تھی، مگر پھر بھی اس شہر کے رہنے والے اس پر فخر کرتے تھے۔ تلواریں، بندوقیں اور ہتھیار بنانے کے لئے یہ شہر مشہور تھا۔ اس صنعت کی طرح اس شہر نے بھی اپنے اندر ایک قوت پیدا کر لی تھی جو پچھلی صدی کے آخر میں بڑے تند و تیز طریقے سے ابل پڑی۔ پنجاب میں شاید ہی کوئی ایسا کامیاب خاندان ہو جس کا تعلق گجرات شہر یا ضلعے سے نہ ہو۔ جب ترقی کی رفتار تیز ہوئی تو بعد میں سرگودھا، شاہ پور، سیالکوٹ اور گجرانوالہ جیسے شہروں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کچھ ایسی ذاتیں بھی تھیں جن کے بارے میں لوگوں نے کبھی سنا تک نہ تھا جیسے کھڑتال کے پوری، بھیرے کے ساہنی اور گروٹ کے بترے، وہ بھی سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں پھیل گئے۔

گجرات میں نو وارد ہونے کے باوجود اپنے دادا چچا کی وساطت سے ہم مقامی برادری میں شریک ہو گئے اور دوسرے خاندانوں سے ہمارے تعلقات بڑی جلدی استوار ہو گئے۔ جب میں ابھی بچہ ہی تھا تو میں اپنی والدہ کے ساتھ دوسرے گھروں میں ملنے ملانے یا بازار

سے سودا سلف خریدنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہماری رفتار بڑی سست ہوتی تھی کیونکہ جاننے والوں سے باتیں کرنے کے لئے میری والدہ رک جاتی تھیں۔ ہم اپنی چھت والی گلی سے نکل کر اگلے چھوٹے سے چوک میں پہنچ جاتے تھے۔ اپنی بالکنی سے ایک مسلمان خاتون میری والدہ کو دیکھ کر پوچھتی "بی بی جی کدھر جا رہی ہو۔ چھوٹا بھی ساتھ ہے۔ ماشاء اللہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ بڑا ہو کر اپنے باپ کی طرح یہ بھی انجینئر بنے گا"۔ میری والدہ جواب میں خدا کی جگہ پرماتما کا نام لیتیں کیونکہ ہندو خدا کو پرماتما کہتے ہیں۔ ہمسائے کی لڑکی فاطمہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی تھی اور پوچھتی تھی کیا تم میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلو گے؟ اس کی ماں اسے ہلکا سا تھپڑ رسید کرتی اور اس کو جھڑک کر کہتی "تم بے حیا ہوتی جا رہی ہو"۔ برسوں بعد جب میں اسی گھر میں رہنے کے لئے آیا تو فاطمہ بڑی خوبصورت لڑکی میں بدل چکی تھی۔ باہر جاتے وقت وہ اب برقعہ پہنتی تھی مگر روایتی شرم کے نیچے وہ پہلے کی طرح ہی بے باک اور نظرباز تھی۔ چوک کی دوسری طرف ایک حلوائی رہتا تھا۔ میری ماں کو دیکھ کر اس کی بیوی ملنے کے لئے نیچے آ جاتی تھی اور پوچھتی تھی "بہن جی، کیا حال ہے"؟ اس کی چھوٹی لڑکی روپا مجھے ایسے دیکھتی جیسے میں بہت اچھا لڑکا ہوں اور لڑکیوں کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ وہ بھی بڑی ہو کر بڑی خوبصورت نکلی۔ اس کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ فاطمہ اور روپا دونوں زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ یہ افواہ بھی تھی کہ وہ دونوں ایک مسلمان لڑکے کو چاہتی تھیں۔ اس لڑکے کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جب روپا کے والدین کو پتہ چلا تو انہوں نے بڑی جلدی اس کی منگنی کر دی اور چند مہینوں بعد اس کی شادی بھی کر دی۔ بیچاری کی شادی ایک ایسے رنڈوے سے ہوئی جو اس سے دوگنی عمر کا تھا۔ جب اس کی ڈولی اٹھنے لگی تو وہ دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔ یہ رونا اپنے والدین سے جدائی پر نہیں تھا۔ وہ اس وجہ سے روئی تھی کہ اس کی شادی ایک بے حس بوڑھے سے ہو گئی تھی۔

شہر کی تنگ گلیوں میں والدین اور ہمسائیوں کی نگرانی کے باوجود ایسے آنکھیں لڑ جانا بڑا عجیب لگتا ہے لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے اور کسی نہ کسی کو پتا بھی لگ جاتا ہے۔ لڑکی کو ڈیوڑھی میں تیزی سے غائب ہوتے ہوئے یا گلی میں گزرتے ہوئے، کسی شخص کو بالکونی سے اشارہ کرتے یا کاغذ کا گولا بنا کر نیچے پھینکتے کوئی نہ کوئی دیکھ لیتا تھا۔ کوئی بڑی نڈر لڑکی منڈیر پھاندتے نظر آ جاتی تھی۔ گھر سے برقعہ پہن کر نکلنے کے بعد تھوڑی دور جا کر نقاب اس خیال سے الٹ دینا کہ اسے کون پہچانے گا، یہ بھی لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ ایسے معاملات کا

جلد یا بدیر پتہ ضرور لگ جاتا تھا لیکن لوگ ایسے معاملات کے بارے میں کھل کر باتیں نہیں کرتے تھے۔ شہریوں کو کسی نہ کسی طرح یہ خیال ضرور رہتا تھا کہ معاملہ اپنے شہر کے اندر ہی رہے اور عملاً پردہ پوشی بھی کی جاتی تھی۔ ایسی بات تو کسی کے خاندان میں بھی ممکن ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھی معاملہ حد سے بڑھ بھی جاتا تھا مگر اسے دبا دیا جاتا تھا اور ختم بھی کر دیا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ لڑائی جھگڑے میں اسے اچھالا بھی جاتا تھا اور حریف کے منہ پر مارا جاتا تھا۔

میری ماں اگلی گلی میں چلی جاتی تھیں جہاں صرف ہندوؤں کے گھر تھے۔ وہاں وہ تھڑے پر بیٹھی عورتوں سے باتیں کرنے لگتی تھیں۔ پنجابی عورتوں کی طرح یہ عورتیں بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ جیسے کالی مرچ اور نمک کے ساتھ سانجا، گنا، بھنے ہوئے چنے، بھنے ہوئے مکی کے دانے یا گلی میں جو پھیری والا اس وقت بیچتا ہو، کھاتی رہتی تھیں۔ اکثر باتیں گھر میں بیماری خصوصاً بچوں کی بیماری، شادی، بیاہ، پیدائش یا موت کے متعلق ہوتی تھیں یا پھر اس بات پر تبصرہ ہوتا تھا کہ رات کے کھانے کے لئے کون کیا پکا رہی ہے۔ ادق بحث اس دوائی کے بارے میں ہوتی تھی جس سے کوئی شفا یاب ہوا ہو۔ ہم اسی طریقے سے چلتے رہتے تھے۔ اگرچہ میرے لئے ایسی گفتگو بڑی غیر دلچسپ ہوتی تھی تاہم مٹھائی کا ایک ٹکڑا یا کسی پھل کے ملنے کا امکان ہمیشہ رہتا تھا۔ اگلی پوری گلی مسلمانوں کی تھی۔ اس کا نام شیخاں دی گلی تھا۔ کبھی یہ لوگ ہندو تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے اور انہیں شیخ کا اعزاز ملا۔ یہاں بھی میری ماں بہت سی عورتوں کو جانتی تھیں۔ اس گلی میں ان کے گھروں سے نکلتی ہوئی لہسن کی بو ہمیں کچھ عجیب سی لگتی تھی۔ پھر یہ بھی عجیب لگتا تھا کہ ایشور یا پرماتما کی جگہ وہ اللہ اور خدا کا نام لیتے تھے۔

یہاں چھوٹی گلی بڑی گلی سے جا ملتی تھی۔ جونہی ہم اس گلی میں داخل ہوتے تھے، میری والدہ سر پر دوپٹہ اوڑھ لیتیں اور میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھیں۔ اس گلی سے بچنے کے لئے وہ فوراً ایک تنگ گلی میں گھس جاتی تھیں۔ یہ طوائفوں کی گلی تھی اور دوسری گلیوں جیسی ہی تھی لیکن میرے لئے یہ بڑی پراسرار تھی۔ مجھے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کون عورتیں ہیں، ان کے مرد کہاں ہیں اور ان کے بچے کیوں نہیں۔ وہ دوسری مسلمان عورتوں کی طرح ہی لگتی تھیں کیونکہ اصل میں وہ تھیں ہی مسلمان۔ ایک آدھ ہندو لڑکی جو ان میں شامل ہو جاتی تھی وہ انہی کا رہن سہن اپنا لیتی تھی۔ ان کے چہروں پر تھکن ہوتی تھی اور انداز بیباک بلکہ بے حیا تھے۔ مثلاً وہ ننگے سر ہوتی تھیں، جہاں دوسری عورتیں صبح کے وقت نہا

دھو کے صاف ستھری نظر آتی تھیں یہ خستہ حال دکھائی دیتی تھیں' شام کو جب دوسری عورتیں کام کر کے تھک جاتی تھیں تو یہ بنتی سنورتی تھیں- ان میں اکثر عورتیں بوڑھی تھیں لیکن کچھ بڑی جوان بھی تھیں اور ان کا حسن بڑا پراسرار تھا- وہ اس طریقے سے بجتی اور بنتی سنورتی تھیں کہ ہماری دلہنوں کو بھی ایسا کرنے کا حوصلہ نہ تھا- وہ خوبصورت بھی تھیں لیکن ہماری جوان عورتوں کے مقابلے میں ان کا حسن کچھ مختلف تھا- ان نوجوان عورتوں کے انداز میں اپنے سے بڑی عمر کی عورتیں کے لئے روایتی عزت بھی نظر نہیں آتی تھی- کیا یہ آپس میں رشتے دار تھیں؟ لیکن وہ بیٹیاں یا بھانجیاں بھتیجیاں بھی نہیں لگتی تھیں- بالا خانوں سے عجیب قسم کی موسیقی سنائی دیتی تھی: ستار' طبلہ' گھنگرو اور لڑکیوں جیسی آواز جو بار بار کسی گیت کا مکھڑا دہرا رہی ہو- اس کے کیا معنی تھے؟ اپنی ماں سے یہ پوچھنے کی مجھ میں جرات نہیں تھی- مجھے کسی نہ کسی طرح سے یہ احساس تھا کہ وہ جواب دینے سے کترائیں گی- ایک دفعہ میں نے ایک گھر کی نالی سے سرخ رنگ کا پانی نکلتے دیکھا اور میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اس گھر میں کوئی قربانی دی جا رہی ہے-

اپنے تھڑے پر بیٹھی ایک بوڑھی طوائف سے باتیں کرنے کے لئے میری ماں رک جاتیں- وہ ہمارے خاندان والوں کا حال پوچھتی- جواب دینے میں میری والدہ کوئی جھجک محسوس نہ کرتیں- مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے جوان چچا یا چچی یا کسی اور مرد نے ان عورتوں سے کبھی کوئی بات نہیں کی- یہ ہم سب کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور گجرات کی زندگی کا حصہ تھیں- دوسری ذاتوں کی طرح ان کا بھی ایک پیشہ تھا- پیشے یا خدمت کی بنا پر ان سے نفرت نہیں کی جا سکتی تھی- وہ نہ تو قابل احترام تھیں اور نہ ہی قابل قبول لیکن ان کو نفرت سے بھی کبھی نہیں دیکھا گیا-

طوائفوں کے محلے سے گزر کر ہم سناروں کے محلے میں داخل ہو جاتے تھے- یہاں سب سنار رہتے تھے- سناروں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ آپ کو کبھی پورا تول نہیں دیتے- ایک کہانی ہے کہ ایک سنار نے اپنی ماں کے لئے زیور بنایا اور اس میں سے سونا چوری نہ کیا- اپنی ریت سے ہٹنے کی وجہ سے اسے نیند نہ آئی- آدھی رات کو اس نے اپنی ماں کو جگایا اور یہ کہہ کر اس سے زیور واپس مانگا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے اور جب تک یہ غلطی کو درست نہ کرلے گا اسے نیند نہیں آئے گی- سنار اپنی برادریوں میں شادیاں کرتے ہیں لیکن ان میں شادیوں کے ضابطے اتنے شدید نہیں- ہم عموماً ایک سنار کے گھر پر رکتے تھے- یہ ہمارے زیورات بناتا تھا- میری ماں اس کی بیوی سے باتیں کرتی تھیں- ہم اس

عورت سے برابری کا سلوک کرتے تھے گو اس کا شوہر میرے والد کے سامنے بڑے احترام سے بات کرتا تھا- عورتوں کے مقابلے میں ذات کے فرق کا اظہار مردوں کے عادات و اطوار میں زیادہ نمایاں تھا- دلچسپ بات یہ ہے کہ کھتری اور سنار کئی نسلوں سے بڑے قریبی محلوں میں رہ رہے تھے مگر ان کے درمیان نہ کبھی شادی ہوئی نہ یہ کھانا اکٹھا کھاتے تھے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی دوسرا سماجی لین دین تھا-

سناروں کے محلے سے ہم بھیڑی گلی میں آ جاتے تھے جو شہر کی تنگ ترین گلی تھی- ہم اس کی چکنی دیواروں سے گھسٹ کر گزرنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے- گلی کی دوسری طرف ہم ایک اور کھتری محلے میں داخل ہو جاتے تھے اور عورتوں سے رسمی گفتگو کے بعد ہم آگے نکل جاتے تھے-

ان دنوں اس محلے میں رسوائی کا ایک واقعہ ہوا تھا- وہاں ایک سرکاری دفتر کا ہیڈ کلرک اور اس کی بیوی بچے رہتے تھے- دونوں خاصی عمر کے تھے- ان کی ایک جوان بیٹی تھی- اس کی عمر تقریباً بیس سال تھی لیکن ابھی تک وہ غیر شادی شدہ تھی- کئی دوستوں اور برادری والوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کر دے کیونکہ لڑکی کو اتنی دیر گھر میں بٹھانا ٹھیک نہیں اور خطرناک ہے- اس سے کسی اچھے لڑکے سے شادی کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں کیونکہ لوگ شک کرنا شروع کر دیتے ہیں- اور بیس پچیس سال کا غیر شادی شدہ لڑکا کہاں سے ملے گا؟ لڑکی خوبصورت تھی اور صحت مند بھی لیکن بڑے میاں نے بات سنی ان سنی کر دی- ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ اگر لڑکی نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو وہ قابل معافی ہو گا- ایک رات بڑا شور ہوا اور چور چور کی آوازوں سے سارا محلہ جاگ اٹھا- ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بوڑھے بابو نے رات کو اپنی لڑکی کو ایک مرد کی آغوش میں دیکھ لیا- جیسے ہی لڑکی نے اپنے والد کو دیکھا اس نے مرد کو دھکا دے کر پرے ہٹایا اور چور چور کا شور مچا دیا- "چور" فوراً ہی غایب ہو گیا- گلی میں دوڑتے ہوئے اسے کسی نے پہچان لیا- وہ ایک بڑے خاندان کا بیٹا تھا اور اس کی شہرت داغ دار تھی- لوگوں کو اس کی محبت کے کئی افسانے معلوم تھے لیکن چوری یا نقب زنی نئی بات تھی- اس کا خاندان بھی کافی مالدار تھا- چنانچہ کسی کو یقین نہ آیا کہ وہ لڑکی کی چوڑیاں اتارنے کے لئے گھر میں گھسا تھا- لوگوں کو یقین تھا کہ لڑکی کے ایما وہ بابو کے گھر آیا تھا- یہ رسوائی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی- بزرگوں نے اس مسئلے پر پھر بابو سے بڑی سنجیدگی سے گفتگو کی- اس نوجوان نے قبول کر لیا کہ وہ چوری کی نیت سے وہاں گیا تھا- بعد میں پولیس سے مل ملا کر اس نے معاملہ رفع دفع

کروا لیا۔

ایسے معاملات میں ایک غیر تحریری قانون تھا کہ اگر مرد اور عورت اکٹھے پکڑے جائیں تو عورت فوراً مرد کو پہچاننے سے انکار کر دے اور مرد پر نقب زنی' آبرو ریزی یا جلدی میں سوجھ جانے والا کوئی اور الزام لگا دے۔ ایسے مرد کا ساتھ دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایسے معاملات کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا تھا۔ لڑکی بھی صرف اس شرط پر رضامند ہوتی تھی کہ روایتی طریقے پر چلتے ہوئے تمام ذمے داری لڑکا اپنے اوپر لے گا۔ لڑکی کے خلاف کوئی کاروائی کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا اس لئے سماج بھی لڑکی کی طرف داری کرتا تھا۔ اسے والدین یا شوہر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اپنے معاملات تو لڑکا خود ہی سلجھا سکتا تھا۔ اگر لڑکے پر کوئی الزام لگ بھی جاتا تو یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ مگر ایسے واقعات کچھ زیادہ نہیں تھے اور معاشرہ بڑا کٹر تھا۔ ایسی لغزش یا خلاف ورزیوں پر معاشرے کی روش تجربے پر مبنی تھی۔ دوسرے شہروں کے مقابلے میں اس قسم کے معاملات گجرات میں کچھ زیادہ ہی تھے اور یہاں کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی زندہ دلی کے لئے مشہور تھیں۔ غلطی کی مرتکب لڑکی خواہ شادی شدہ ہو یا کنواری اپنے خاندان کے لئے بدنامی کا باعث بنتی تھی اور یہ سزا کافی سمجھی جاتی تھی کہ کلنک کا ٹیکہ اس کے خاندان کے ماتھے پر لگ گیا ہے جو آسانی سے نہیں مٹتا تھا۔ گو وہ ظاہر تو یہ کرتے ہوں گے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں مگر لوگ جانتے ضرور تھے۔ نئی رشتے داریوں اور برادری کے معاملات میں یہ ٹیکا بڑی دیر تک نظر آتا تھا۔

دوشیزگی مقدس تھی۔ غیر شادی شدہ لڑکی کو کنواری کہتے تھے۔ شادی سے پہلے کی آشنائی کبھی کبھار کا معاملہ تھا۔ ایک ہی خاندان میں ایسے معاملات کچھ کم نہیں تھے گو وہ ظاہر کم ہی ہوتے تھے۔ بھابھی اور دیور' ایک نوجوان چچی اور اس کے بھتیجے اور کبھی کبھار ایک سوتیلی ماں اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان ایسی آشنائیاں ہو جاتی تھیں۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ تو مشترکہ خاندان کا نظام تھا جس کے تحت والدین اور بچے بطور ایک معاشری اکائی کے علیحدہ نہیں رہتے تھے بلکہ سب قریبی رشتے دار اکٹھے رہتے تھے۔ دوسری وجہ طے شدہ شادیاں تھیں۔ یہ اکثر کامیاب ہوتی تھیں مگر بعض اوقات متضاد مزاج لوگوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی کرتے تو شاید کبھی میاں بیوی نہ بنتے مثلاً ایک سرد مزاج شوہر اور ایک جذباتی بیوی۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو مرد خاموشی سے طوائفوں کے پاس جا سکتا تھا مگر ایک غیر مطمئن بیوی کے لئے ایسا کوئی

چارہ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ خاندان کے اندر یا باہر کوئی آشنائی پیدا کرے۔ میاں بیوی کی عمروں میں عدم تفاوت بھی ایک وجہ تھی اور اس کے لئے بھی والدین ہی ذمہ دار تھے۔ ایک چھوٹی عمر کی لڑکی کی شادی ایسے مرد سے کر دی جاتی تھی جو عمر میں لڑکی کے والد کے برابر ہو۔ ایسی صورت میں شوہر کا چھوٹا بھائی' بیٹا یا بھتیجا عورت کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا خصوصاً اس وقت جب عورت کو شوہر سے نفرت ہو۔ سالیوں اور ان کے بہنوئی کے درمیان شادی کے موقعے پر دل لگی ہوتی تھی۔ وہ دولہے سے بڑے پریشان کن اور بیہودہ سوال کرتی تھیں۔ اس کے جوتے چھپا دیتی تھیں اور شرارتیں کرتی تھیں۔ بعض اوقات ایسی دل لگی ایک نازک صورت اختیار کر لیتی تھی۔ آخری وجہ یہ تھی کہ ایک نوجوان بیوہ اپنے مرحوم شوہر کے چھوٹے بھائی یا اس کے والد سے تعلقات پیدا کر لے۔ معاشرے میں بیواؤں کی کوئی داد فریاد نہیں تھی اس لئے وہ آسانی سے شکار بن جاتی تھیں۔

جوان بیوائیں ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ لوگ کسی قیمت پر ان کو دوبارہ شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان بیواؤں کا کیا کیا جائے۔ خواہ وہ اپنے شوہر کے گھر رہے یا اپنے والدین کے پاس بیوہ کو ایک بوجھ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسے خاندان کی بدنصیبی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ والدین اور بھائی تو پھر ہمدردی کا اظہار کرتے تھے لیکن دوسرے لوگ تو بالکل لاتعلق رہتے تھے۔ اس کی ساس تو خاص طور پر یہ سمجھتی تھی یہ عورت پورے خاندان کے لئے نحوست ہے اور اس کے بیٹے کو کھا گئی ہے۔ اسے پیٹ بھر کھانے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے سے بھی منع کیا جاتا تھا۔ وہ خاندان کی خوشیوں اور تہواروں میں بھی شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ خاندان میں اس کا مقام بغیر تنخواہ کے ملازم کا ہوتا تھا۔ ملازم تو پھر ملازمت چھوڑ کر جا سکتا تھا مگر بیوہ ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آریا سماج نے کچھ بہتری کی کوشش کی۔ اس نے بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی یا ان کی تعلیم کا پرچار شروع کیا تاکہ وہ کچھ نہیں تو ٹیچر بن کر ہی زندگی گزار لیں۔ مگر لوگوں کا ردعمل بڑا سست تھا۔ وہ بیوگی کو بھگوان کی مرضی قرار دیتے تھے اور اسی عقیدے پر اڑے رہے۔ میرے والد کے زیر اثر دو بیوہ عورتیں اپنی شادی کرنے میں کامیاب ہوئیں لیکن یہ بہت بعد میں ہوا۔

کھتری محلے سے ہم منڈی میں جا نکلتے تھے۔ یہ گجرات کی مارکیٹ تھی جو ایک بہت بڑے چوک کی صورت میں بنی ہوئی تھی۔ اس میں غلے والوں' پرچون اور تھوک فروشوں کی

دکانیں تھیں۔ اس کے پکے فرش پر غلے' دالوں' چاولوں' گڑ اور دوسری اشیائے خوردنی کے ڈھیر لگے ہوتے تھے جس سے گاہک ضرورت کی اشیا خریدتے تھے۔ چوک کے درمیان بڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ اس کے نیچے سبزی بیچنے والی عورتیں بیٹھتی تھیں۔ یہ سبزیاں شہر کی فصیل کے باہر کھیتوں میں اگائی جاتی تھیں۔ سلیقے سے ٹوکریوں میں سجی ہوئی رنگ برنگی سبزیاں بڑی خوبصورت لگتی تھیں۔ سبزیاں بیچنے والی ہمیشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کا تعلق آرائیوں سے تھا جو مسلمان تھے۔ عام کسان کی نسبت آرائیں سبزیاں اگانے میں بڑے ماہر تھے۔ آرائیں مرد اور لڑکے سبزیاں اگاتے تھے اور ان کی عورتیں یہ سبزیاں فروخت کرتی تھیں۔ میری ماں رک کر سبزیوں کو دیکھتیں۔ خریداری ہمیشہ ایک ہی طریقے سے کی جاتی مثلاً "بہن بینگن کیا بھاؤ ہیں"؟ میری ماں پوچھتیں۔ "بہن میں آپ سے کیا بھاؤ تاؤ کروں' جو دل چاہے دے دینا" سبزی فروش عورت کا جواب ہوتا تھا۔ زیادہ سودے بازی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ مطلوبہ شے کا بھاؤ پہلے ہی بہت کم ہوتا تھا۔ وہ ایک سیر بینگن تول کر دے دیتی اور اوپر سے ایک یا دو بینگن بطور جھونگا ڈال دیتی تھی۔ جھونگا بڑا عجیب رواج تھا۔ جو کچھ بھی آپ نے تعداد یا تول کے مطابق خریدا ہو اس رواج کے مطابق آپ اس سے زیادہ کے حق دار تھے۔ جب ہم بچے تھے تو دکان دار سے زیادہ سے زیادہ جھونگا مانگتے تھے۔ ہماری سودے بازی کا معیار یہ نہیں تھا کہ ہم نے کون سی چیز کس بھاؤ سے خریدی ہے بلکہ یہ تھا کہ ہم نے کتنا جھونگا لیا ہے۔

آگ لگنا میں نے پہلی دفعہ منڈی میں دیکھا۔ آگ بہت بڑی تھی اور جس جگہ آگ لگی تھی اس کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کا گودام تھا۔ گجرات میں آگ بجھانے کی کوئی گاڑی نہیں تھی۔ آگ بجھانے کے لئے سارا شہر امڈ پڑا۔ قریبی کنویں سے بالٹیوں سے جنھوں نے ایک زنجیر کی صورت اختیار کر لی تھی' آگ پر پانی ڈالا جاتا تھا۔ یہ شدید جنگ گھنٹوں تک جاری رہی۔ گجرات جیسے گنجان آباد شہر میں جہاں عمارتیں لکڑی اور اینٹوں سے بنی ہوں' آگ بڑی ہولناک ہو سکتی ہے۔ ایک تنگ سی گلی کے ایک طرف آگ لگنے سے یہ پورے محلے کو محبوس کر سکتی ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایسے واقعات بہت کم تھے۔ مجھے آتش زدگی کا دوسرا کوئی واقعہ یاد نہیں پڑتا۔

سبزیاں خریدنے' ریزگاری لینے اور بچوں کا حال احوال پوچھنے کے بعد ہم پھر چل پڑتے تھے اور بڑی گلی میں آ جاتے تھے۔ یہ بڑی ڈھلوان گلی تھی اور بڑی تیزی سے اوپر کو سب سے اونچی جگہ کی طرف جاتی تھی۔ میرے لئے یہ گلی بڑی دلچسپی کا باعث تھی۔ یہاں سوڈا

واٹر کی رنگ برنگی بوتلوں سے بھری ہوئی دکانوں کی قطاریں تھیں۔ ان بوتلوں میں مصنوعی رنگ اور ذائقے ڈالے جاتے تھے۔ ایک دکاندار کہتا تھا کہ اس کے پاس پچاس سے زاید ذائقے ہیں۔ ایک مقامی بیرسٹر کے لئے وہ بیئر میں گلابی رنگ ملا کر بوتلیں تیار کرتا تھا۔ ان دکانوں کے بعد پھلوں کی دکانیں تھیں۔ ان کے بعد نان بائیوں کی دکانیں تھیں۔ یہ آلو چھولے' تندوری روٹی' کلیجی گردے' کباب اور آلو کی ٹکیاں بیچتے تھے۔ یہ سب خاصے کے کھانے تھے جو کوئلوں پر بھونے جاتے تھے یا سیخوں پر تیار کئے جاتے تھے۔ ان کی مہک میری ناک میں پہنچ کر مجھے بہت للچاتی تھی۔ ان کے بعد حلوائیوں کی دکانیں تھیں۔ میرے اور مکھیوں کے لئے رنگ برنگی مٹھائیاں بڑی پرکشش تھیں۔ پھر جنرل مرچنٹس کی دکانیں تھیں۔ یہ اکثر بنا بنایا درآمد شدہ مال بیچتے تھے۔ یہ مال عموماً انگریزی یا جرمن ہوتا تھا۔ ان کے تجارتی نام زبان زد عام تھے۔ اس وقت جاپان ابھی مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ ان دکانوں پر ہر قسم کا سامان جیسے چاقو' چھریاں' سوتی اور ریشمی تاگے' آئینے' صابن' بوتلوں میں بند سر میں لگانے کا تیل' استرے' جرابیں' سوتی اور اونی بنے ہوئے کپڑے وغیرہ ملتے تھے۔ مقامی چیزوں کے مقابلے میں یہ دساور کا مال زیادہ شاندار تھا۔ ہاتھ سے بنی ہوئی لکڑی کی کنگھیوں پر ہم باہر کی کنگھیوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح مقامی لوہاروں کی ٹھوس فولاد کی بنی ہوئی قینچیوں اور چاقوؤں پر ہم شیفیلڈ اور سولجن کی الیکٹرو پلیٹڈ قینچیوں اور چاقوؤں کو ترجیح دیتے تھے۔ گھر میں بنے ہوئے صابن کے مقابلے میں پیرزز سوپ اور ونولیا صابن بہتر سمجھے جاتے تھے۔ اپنے کپڑے کے بنے ہوئے بٹنوں پر چمکدار بٹنوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

یہ گلی بڑے چوک کی طرف مڑ جاتی تھی جہاں چاروں گلیاں آ کر مل جاتی تھیں۔ چوک کے بائیں طرف سناروں کا بازار تھا اور دائیں طرف پنساریوں کی دکانیں تھیں۔ پنساری جڑی بوٹیوں کی دوائیاں مثلاً گل قند جسے جلاب کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا' اچار' چٹنیاں' مربے' عرق گلاب' عرق کیوڑا' پستہ' بادام اور کئی اور دوسرے غیر معمولی سامان بیچتے تھے۔ قریب ہی سونے اور چاندی کے ورق تیار کرنے کی دکانیں تھیں۔ یہ ورق مٹھائیوں پر لگائے جاتے تھے۔ سونے یا چاندی کے بڑے باریک ذروں کو براون رنگ کے آٹھ انچ لمبے اور پانچ انچ چوڑے کاغذوں میں لپیٹنے کے بعد پتھر پر رکھ کر ہتھوڑی کے دستے سے کوٹا جاتا تھا اور یہ ذرے باریک ورقوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان کو مٹھائیوں پر لگانے کے لئے کاغذ کو اوپر اٹھا کر بڑی آہستگی سے الٹا دیتے تھے۔ ورق خود بخود لہراتا ہوا مٹھائی پر آ کر چپک جاتا تھا۔ ورق سجاوٹ کے لئے بھی تھا اور اسے مقوی بھی سمجھا جاتا

تھا۔ ورق تیار ہوتے وقت یہاں کا پر ستم پرندے کی ٹانک ٹانک کی آوازیں آتی تھیں۔

اس گلی سے گزرتے ہوئے ایک دفعہ میں نے ایک عجیب اور دہشت انگیز منظر دیکھا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ تجارتی سامان سے بالکل خالی ایک دکان میں ایک شخص پیتل کے ایک لمبے دیئے کے سامنے مراقبے کے انداز میں سر جھکائے بالکل ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ دیئے میں صرف ایک بتی تھی۔ اس آدمی نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دیئے کی روشنی سے اس کا سایہ پیچھے والی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ گلی میں چلتے ہوئے لوگ اسے رک کر دیکھتے تھے مگر کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور وہ بھی آنکھ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھتا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دن کی روشنی میں اس نے دیا کیوں جلایا ہوا ہے اور وہ کسی سے بات کیوں نہیں کرتا۔ اوپر اس کے گھر سے بھی رونے پیٹنے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی موت واقع ہوئی تھی۔ جب تک میں سکول نہ پہنچا مجھے کسی سے پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔ سکول پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ دیوالیہ ہو گیا ہے۔ دیوالیہ کا مطلب ہے دن کو دیا جلانا۔ دیئے کو دیوا بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس حرکت یا کام کو دیوا یا دیا نکالنا کہتے ہیں۔ مناسب وقت پر اس کے قرض خواہ اس دیوالیہ شخص سے اور اس کی برادری اور پنچایت سے بات چیت کریں گے لیکن آج تو وہ صرف یہ افسوس ناک منظر ہی دیکھتے رہیں گے۔ اس بر سر عام اعتراف کو اور کفارے کی اس واقعہ کو لوگ پشتوں تک یاد رکھیں گے۔ "کیا اس کا باپ دیوالیہ نہیں تھا؟ کیا اس کے دادا نے دیا نہیں جلایا تھا؟" ہر کوئی یہ سوال پوچھے گا۔ اس کا قرضہ اس کے بیٹوں اور پوتوں کو اتارنا پڑے گا۔

گلی کے چوک سے سڑک اوپر ہی چڑھتی چلی گئی تھی اور اس سے چھوٹی چھوٹی گلیاں نکل کر محلوں یا دوسری جگہوں سے جا ملتی تھیں یہاں ہر محلے کے اندر جانے والے راستے پر لکڑی کا ایک گیٹ ہوتا تھا اور اس کے پیچھے بڑے مضبوط ارل لگے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ شہر کا قدیم ترین حصہ تھا اور اس کا تعلق ازمنہ وسطی سے تھا۔ یہاں ایک باؤلی بھی تھی جس کی سیڑھیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ باؤلی بہت گہری تھی کیونکہ زمین کی سطح سے قلعہ بہت بلندی پر تھا۔ یہاں ایک پرانا حمام بھی تھا جس کا تعلق شاید مغلوں کے زمانے سے تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس سے بھی قدیم ہو۔ ہم بڑی گلی تک پہنچنے کے لئے اوپر ہی چڑھتے جاتے تھے اور پھر ایک رشتے دار کو ملنے ایک گلی میں مڑ جاتے تھے۔ قلعے والے علاقے میں گھر اور بھی تنگ تھے کیونکہ پرانے زمانے میں اس محفوظ علاقے میں آبادی کا دباؤ

اور بھی زیادہ ہو گا۔ یہاں کئی گھروں اور گلیوں میں سورج کی روشنی صرف گھنٹوں کے لئے آتی تھی۔ سردیوں میں یہ گھر اندھیرے اور بڑے ٹھنڈے ہوتے تھے اور گرمیوں میں یہ بڑے ٹھنڈے رہتے تھے۔ ہم کچھ اور گھروں میں بھی ملنے جاتے تھے۔ میری والدہ باتوں میں مصروف ہو جاتیں اور میں گلی میں کھیلنے والے لڑکوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس علاقے میں کوئی چوک نہیں تھا۔ صرف تنگ بل کھاتی گلیاں تھیں جن کے دونوں طرف اونچے اونچے مکان تھے۔ ماضی میں حملوں کے دوران یہاں کیا کچھ ہوتا ہو گا۔ یہ سوچ کر ہی انسان خوف سے لرز اٹھتا ہے۔ جب شہر ہاتھ سے نکل جاتا تھا تو لوگ اس علاقے میں آ جاتے تھے۔ راستے بند کر دیتے تھے اور کھولتے تیل اور پانی کے کڑاہے چھتوں پر لے جا کر حملہ آوروں کا انتظار کرتے تھے۔ سپاہیوں پر لوٹ مار اور عورتوں کی بے حرمتی کا بھوت سوار ہوتا تھا اور وہ گلیوں میں ادھر ادھر دیوانہ وار بھاگتے پھرتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں دہلی کی فتح کے بعد نادر شاہ کے قتل عام کا ذکر پڑھتے ہیں تو گجرات والے اس کا کچھ کچھ مطلب سمجھ جاتے ہیں۔

شاید ایسی ہی تباہی اس وقت بھی آئی ہو گی جب گجرات میں طاعون پھوٹی تھی۔ تنگ اور اندھیری گلیوں میں یہ بیماری آندھی کی طرح پھیل گئی تھی۔ طاعون ہر گلی' ہر محلے اور ہر گھر میں پہنچی اور مرضی سے اپنے شکار کا انتخاب کیا۔ گلی سے گھر کے اندر داخل ہو کر وبا تنگ زینوں سے اوپر چڑھ جاتی تھی۔ گھر والوں کو اپنی خونخوار انگلیوں سے چھو کر منڈیر پر سے ہی دوسرے گھر میں کود جاتی تھی اور وہاں اپنا کام ختم کر کے پھر گلی میں آ جاتی تھی۔ اس کے شکار ایک دو دن درد سے تڑپتے اور کراہتے تھے۔ گھر والے مریض کی مدد کرنے سے گھبراتے تھے لیکن وہ پھر بھی مدد کرتے تھے اگرچہ انہیں پتہ ہوتا تھا کہ سوائے تسلی دینے کے وہ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ ہذیان میں مبتلا مریض کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ کوئی اس کی تیمار داری کر رہا ہے۔ اکثر ایک گلی میں اتنی موتیں ہو جاتی تھیں کہ انہیں شمشان گھاٹ لے جانے کے لئے باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ایک مردے کو جلانے کے بعد جب لوگ واپس آتے تھے تو دوسرا تیار ہوتا تھا۔ جیسے ہی اس کا جنازہ خاموشی سے گلی میں سے گزرتا تو لوگ پوچھتے تھے اب یہ کون ہے۔ بعض اوقات تو پورا گھر ہی صاف ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب طاعون کا ہلکا سا حملہ ہوا تو میرا سر بھی چکرانے لگا اور مجھے گرمی محسوس ہونے لگی۔ میں بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے ایک گلٹی بھی نکل آئی۔ ہمارے ڈاکٹر نے کہا کہ یہ طاعون کی یقینی علامت ہے۔ سوائے میرے چچا کے منشی کے ہر شخص نے ڈاکٹر سے اتفاق کیا۔ منشی نے کہا

کہ یہ درست ہے کہ شہر کے ایک حصے پر طاعون کا حملہ ہوا ہے اور لڑکے کو گلٹی بھی نکل آئی ہے تاہم اسے یقین نہیں تھا کہ یہ طاعون ہی ہے۔ اس نے میری ٹانگ کا بغور معائنہ کیا۔ اس دوران اس نے میرے ٹخنے کے قریب زخم کا ایک نشان دیکھا جو صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس نے کہا کہ گلٹی کی وجہ یہی زخم ہے۔ اس کی تشخیص درست نکلی۔

قلعے سے واپسی پر ہم اس محلے سے گزرتے ہوئے اس چھوٹے راستے پر آتے تھے جس پر پیپل والی چھوٹی کھوئی واقع تھی۔ مجھے یہ راستہ پسند تھا کیونکہ مارکیٹ کے علاوہ سارے شہر میں صرف یہاں ہی ایک درخت تھا۔ درخت بڑا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک کنواں تھا۔ یہ جگہ بہت ٹھنڈی تھی۔ پیپل بڑا خوبصورت درخت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اسے ٹھیک ہی مقدس قرار دیا تھا۔ اس کے پتے بڑے نازک اور چمکدار ہوتے ہیں۔ پتوں کی رگیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اتنے سبک اور نازک ہوتے ہیں کہ ذرا سی ہوا چلنے پر وہ لرزنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر پتہ ایک پنکھے کا کام کرتا ہے۔ پیپل کے نیچے ہوا بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پیپل کے نیچے اکثر ایک کنواں بھی ہوتا ہے۔ کنویں کے اردگرد پھیلا ہوا پانی ٹھنڈک کو بڑھا دیتا ہے۔ بڑ کے درخت کی شان بڑی منضبط ہے لیکن پیپل میں ایک نرم سا دوستانہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ جب اس کے نئے پتے نکلتے ہیں تو نرم و نازک، ہلکے سے گلابی اور ناقابل یقین حد تک ایک نو زائیدہ بچے کی ہتھیلی مانند ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ درخت اپنی پوری شان میں ہوتا ہے۔ اس کی ممتا بھری چھاؤں میں لوگ سوتے ہیں، پوجا کرتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں لیکن اندھیرا ہو جانے کے بعد ہم کبھی اس کے قریب نہیں گئے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان کے نیچے ڈائنیں رہتی ہیں۔ ڈائن کی پہچان بھی ہمیں بتائی گئی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت ہوتی ہے مگر ان کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی تنبیہہ کی گئی تھی کہ اگر ہم نے احتیاط نہ کی تو وہ ہمیں پکڑ لیں گی اور کھا جائیں گی۔ وہ صرف انسانی گوشت ہی کھاتی ہیں۔

واپسی پر ہم تھوڑی دیر کے لئے ایک بھیور کے گھر رکتے تھے۔ میری والدہ اس کی بیوی کو بتاتی تھیں کہ اگلے ہفتے کچھ مہمانوں آنے والے ہیں اس لئے اسے ہمارے گھر آنا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ عمارتیں بنی شروع ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو جیل، مشن ہسپتال، سکول تھے اور کچھ دکانیں تھیں۔ چند منچلے دکاندار بھی شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ سول سٹیشن عرصے سے قایم تھا۔ دفتروں اور افسروں کی

رہائش گاہوں پر مشتمل یہ خود ایک بستی تھا۔ ابتدائی برطانوی دور کے افسروں نے شہر کے باہر وسیع زمین پر اپنے بنگلے تعمیر کئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ کالونیاں بڑھ کر خود ٹاؤن شپ بن گئی تھیں۔ ان کا ایک مقرر نمونہ تھا جو بڑا خوش آئند تھا۔ سول سٹیشن کے رہائشی علاقے میں وسیع بنگلے تھے۔ ہر بنگلے میں سبزیوں اور پھولوں کے باغیچے ہوتے تھے۔ تمام بنگلوں کے باورچی خانے، ملازموں کی رہائش گاہیں، اصطبل اور دھوبی گھاٹ اپنے ہوتے تھے۔ بیرونی گیٹ سے شروع ہو کر ایک لمبی سڑک بنگلے تک جاتی تھی۔ ایسی سڑکوں کے دونوں طرف درخت تھے۔ ان کے کمروں کی دیواریں سولہ فٹ سے بھی اونچی تھیں۔ گھر کے چاروں طرف ایک وسیع برآمدہ ہوتا تھا جس کے ستون بڑے متناسب تھے۔ باغیچوں میں پھول، سبزیاں اور انگلستان سے برآمد کئے ہوئے درخت بھی لگائے جاتے تھے۔ یوں کئی اقسام کے پھول، سبزیاں اور درخت یہاں متعارف ہوئے۔ ان میں سے کئی پھول جن کو ہم انگریزی کہتے ہیں، ہمالیہ کے دامن میں جنگلی حالت میں ملتے ہیں لیکن ہمارے باغیچوں میں یہ براستہ انگلستان ہی آئے۔

سول سٹیشن کے غیر رہائشی علاقے میں ڈاک خانہ، گورنمنٹ کے لئے کام کرنے والے امپیریل بنک کی ایک شاخ، ہسپتال اور سکول اور کبھی کبھی کالج، سرکاری دفاتر، عدالتیں، پولیس کا ہیڈ کوارٹر، پولیس کی بیرکیں اور پریڈ گراؤنڈ اور کمپنی باغ بھی ہوتے تھے۔ باغوں کا سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چلایا تھا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان میں سے کئی باغوں کا نام وکٹوریہ گارڈنز رکھا گیا لیکن ان کو کہا کمپنی باغ ہی جاتا تھا۔ بڑے شہروں میں جنرل سٹور جیسی ایک دکان بھی ہوا کرتی تھی۔ یہاں بوتلوں اور ڈبوں میں بند یورپی کھانے، شراب اور عام ضروریات کا تجارتی سامان ملتا تھا۔ ایسی دکانوں کے مالک عموماً پارسی تھے۔ کمپنی باغ کے ایک حصے میں یورپی لوگوں کی ایک کلب بھی ہوا کرتی تھی۔ بعد میں جب سرکاری ملازمتوں اور پیشوں میں ہندوستانیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے بھی اپنی کلبیں بنانی شروع کر دیں۔ طرفہ یہ کہ جو کلبیں شہروں کے نام پر قایم ہوئی تھیں وہ صرف یورپی لوگوں کے لئے مخصوص تھیں شاید اس لئے کہ وہ پہلے قایم ہوئی تھیں۔ ایک سول سٹیشن کو مکمل کرنے کے لئے ایک پروٹسٹنٹ گرجا اور چند مقامی لوگ ہوتے تھے جن کے نام ڈینیل، سیموئیل وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ رومن کیتھولک مذہب نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ وہ ایک چھوٹی اور افسردہ سی جماعت تھی جو چرچ کے قرب و جوار میں رہتی تھی۔ ہمارے اور انگریزوں کے درمیان یہ ایک ایسی جماعت تھی جو نہ ہم سے کوئی تعلق قایم کر سکی اور نہ انگریز نے

انہیں قبول کیا۔

میرے سکول کا نام گورنمنٹ ہائی سکول گجرات تھا۔ میرے والد' میرے چچا اور ان سے پہلے میرے دادا اسی سکول میں پڑھ چکے تھے۔ یہ سول سٹیشن میں واقع تھا اور پچھلی صدی سے مخصوص سرکاری سکولوں جیسا تھا۔ اس کی ایک منزلہ عمارت اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس کی شکل انگریزی حرف ایچ جیسی تھی۔ اس کے سامنے سڑک کے بالمقابل ایک باغ تھا۔ اس کے پیچھے کھیلوں کی گراونڈز تھیں۔ اس کے ایک طرف ہوسٹل تھا اور اس کے ساتھ ہی رہائش گاہیں تھیں۔ میرے والد کے زمانے کا انگریز ہیڈ ماسٹر جا چکا تھا۔اس کی جگہ ایک ہندوستانی متعین تھا۔ سکول میں دس جماعتیں تھیں اور اس کے تین درجے تھے۔ پہلے پانچ سال کی تعلیم کو پرائمری کہتے تھے۔ اگلے تین سال کو مڈل اور آخری دو برسوں کو ہائی سکول کہتے تھے۔ پرائمری اور مڈل تک تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی مگر ہائی سکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ ہماری تعلیم لکڑی کی تختی پر خوش خطی اور ہندسے لکھنے سے شروع ہوتی تھی۔ ہر روز تختی پر گاچنی مٹی ملی جاتی تھی۔ ہم سرکنڈے کے قلم سے لکھتے تھے۔ ان قلموں کو ہر روز تراشا جاتا تھا۔ مٹی کی دواتوں میں دیئے کی کالک سے بنی روشنائی میں کپڑے کی ایک چندی بھگو کر دوات میں ڈال دی جاتی تھی۔ ان سے ہم اپنی تختی پر فارسی رسم الخط میں اردو کے حروف لکھتے تھے۔ بعد میں تختی کو دھو کر اس پر دوبارہ گاچنی مٹی مل کر سکھا دی جاتی تھی تاکہ اگلے دن کے لئے یہ پھر تیار ہو جائے۔

ہمارا نصاب شاید اس نصاب سے بہتر تھا جو میں نے تیس سال بعد بمبئی میں دیکھا۔ مثال کے طور پر ہم جغرافیہ تین مراحل میں پڑھتے تھے۔ پرائمری جماعتوں میں ہم صرف اپنے ضلعے کا جغرافیہ پڑھتے تھے پھر اپنے صوبے کا۔ مڈل سکول میں ہندوستان اور ایشیا کا اور ہائی سکول میں دنیا کا جغرافیہ۔ اسی طرح ہمارا تاریخ کا نصاب بھی چار حصوں میں پڑھایا جاتا تھا یعنی ہندو' مسلمان اور برطانوی دور اور ہائی سکول میں انگلستان کی تاریخ اختیاری مضمون تھا۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ بمبئی کے کانونٹ سکول میں میری بیٹی کا جغرافیے اور تاریخ سے تعارف جزائر برطانیہ کے ذریعے ہوا ہے تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اشوک اور کلکتے سے آشنا ہونے سے پیشتر اسے کنگ الفریڈ اور برطانیہ کی بندرگاہوں کا پتہ تھا۔ انگریزی راج کی برکتوں کی ایک سادہ لوح کوشش کے باوجود انگریز ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز نے ہمارے لئے بڑا اچھا نصاب تجویز یا تھا۔ ابتدائی کلاسوں میں ذریعہ تعلیم اردو تھا لیکن آخری پانچ برسوں میں انگریزی سیکھنی ہوتی تھی اور سنسکرت' فارسی' عربی سے ایک زبان

بطور اختیاری مضمون رکھنا پڑتا تھی۔

سکول کے زمانے میں دلچسپ دن کرکٹ کا سالانہ ٹورنامنٹ' انسپکٹر آف سکولز کے معائنے کے دن' پنجاب کے گورنر کی آمد اور گرمیوں میں فائن ڈے کی چھٹی ہوتی تھی۔ فائن ڈے ایک ایسا رواج تھا جو صرف پنجاب کے خشک علاقے میں ہی قایم ہو سکتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں کے لمبے سلسلے کے بعد جب ان کی یک رنگی کا ازالہ بادل یا بارش ہونے کی صورت میں ہوتا تو تمام جماعتوں میں خبر پھیل جاتی تھی کمروں میں کام کرنا شرم کی بات ہے۔ وہ دن کھیلنے یا بارش میں بھیگنے کا دن ہوتا تھا۔ بارش میں بھیگنے کے عیش کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جو ہماری خشک آب و ہوا میں رہ چکے ہوں۔ ہم میں سے کچھ دلیر لڑکے اکٹھے ہو کر ہیڈ ماسٹر کے نام درخواست لکھتے ہیں جو اس طرح ہوتی تھی۔

To: The Headmaster,
Government High School,
Gujrat, Punjab.

Honoured Sir,

Today, by the grace of God, is a fine day. Therefore, we the students of the Government High School, Gujrat, Punjab, request that a holiday should be declared. For this act of kindness we shall for ever for your long life, happiness and prosperity.

Yours most obediently,
The Students,
of the Government High School,
Gujrat, Punjab.

اچھا تاثر پیدا کرنے کے لئے درخواست کا انگریزی زبان میں ہونا ضروری تھا اور اس میں خدا کا نام بھی لینا ضروری تھا کیونکہ ممکن تھا کہ خدا بادلوں اور بارش کے متعلق اپنا ارادہ بدل دے اور سورج پھر نکل آئے۔ سب لڑکے بادلوں کے چھائے رہنے کے لئے دعائیں مانگتے اور ہیڈ ماسٹر کے حکم کا بڑی شدت سے انتظار کرتے تھے۔ یکدم بغیر مقررہ وقت کے سکول کی گھنٹی دیوانہ وار بجنے لگتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آج سکول بند ہو گیا ہے۔ تین سو لڑکے شور مچاتے ہنگامہ کرتے سکول سے بھاگ نکلتے تھے۔ خدا اور ہیڈ ماسٹر دونوں ہی بڑے مہربان دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اب اگر خدا اپنا ارادہ بدل بھی دیتا تو ہمیں اس کی کوئی

پرواہ نہ ہوتی۔

مغربی پنجاب میں کرکٹ بڑا مقبول کھیل تھا اور گجرات کی ٹیم بڑی اچھی تھی۔ چنانچہ سالانہ کرکٹ ٹورنامنٹ ایک بڑا اہم واقعہ تھا اور اس وجہ سے شہر میں بڑا جوش و خروش ہوتا تھا۔ میچ کے دنوں میں چھٹیاں ہوتی تھیں اور ہم سردیوں کی دھوپ میں آرام کرتے تھے، اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتے تھے۔ ہمیں یہ امید بھی ہوتی تھی کہ میچ پورے چار دن چلے گا۔ صبح اور شام ہم ہوسٹل کے اردگرد منڈلاتے تھے جہاں مہمان ٹیم ٹھہرا کرتی تھی۔ ہم جیتیں یا ہاریں ان کی روانگی اور ہماری کلاسوں کی واپسی ہمیں افسردہ کر دیتی تھی۔ ہم ہندوستانی کھیل جیسے گلی ڈنڈا، کبڈی اور فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال اور ہاکی بھی کھیلتے تھے لیکن کرکٹ سب سے زیادہ دلچسپ کھیل تھا۔

سکول انسپکٹر سال میں ایک دفعہ آتا تھا۔ ہم اس کا بڑا انتظار کرتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہمارا امتحان لینے نہیں آتا بلکہ ہمارے استادوں کی خصوصاً ہیڈ ماسٹر کی کارکردگی کا معائنہ کرنے آتا ہے۔ ہم بڑے اکڑتے تھے کہ ہمارے استادوں کا مستقبل اب ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اگر ہم چاہیں تو انہیں برباد کر سکتے ہیں۔ بڑی معصومیت سے سوالات کے غلط جوابات دے کر ہم انسپکٹر کو یہ سوچنے پر مجبور کر سکتے ہیں کہ ہماری لاعلمی کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ٹھیک طرح سے پڑھایا ہی نہیں گیا۔ اور اگر متعلقہ استاد یہ وضاحت کرے کہ ہم دانستہ حیلہ سازی کر رہے ہیں تو یہ بھی استاد کے خلاف جاتا تھا کہ اس نے ڈسپلن قایم نہیں رکھا۔ اگر ہم چاہتے تو چند لمحوں میں ہم بتا سکتے تھے کہ ہمیں یہ استاد پسند نہیں ہے۔ استادوں کو ان ساری باتوں کا علم ہوتا تھا۔ کئی دنوں تک وہ ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے تھے مگر بے چین بھی رہتے تھے۔ انسپکٹر کے پچھلے معائنے کے بعد صرف ان دنوں میں ہم پر شفقت اور مہربانی کی جاتی تھی۔ ذہین لڑکوں کو بڑی احتیاط سے تیار کیا جاتا تھا۔ غبی لڑکوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ انہیں یہ بھی بتا دیا جاتا تھا اگر غبی لڑکے سے سوال پوچھا جائے تو ذہین لڑکے کو فوراً مداخلت کرنی چاہئے تاکہ غبی لڑکا جواب ہی نہ دے سکے۔ ہم بھی جانتے تھے اور استاد بھی اس طرح کا عندیہ دیتے تھے کہ انسپکٹر کے جانے کے بعد حساب چکایا جائے گا۔ چنانچہ ہماری بھی ایک حد تھی۔ مجھے اپنے استاد کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ اب بھی یاد ہے جب بڑے جوش اور اشاروں کے ساتھ میں نے یہ نظم سنائی تھی

Twinkle, twinkle, little star,
How I wonder what you are,
Up above the world so high
Like a diamond in the sky.

کوئی شرارت نہ کر سکا۔ میرے سکول اور کالج کے دنوں میں بھی یہ میرا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ واحد کارنامہ تھا۔

گورنر کا دورہ بھی بہت بڑا واقعہ ہوا کرتا تھا۔ اس موقع پر سب اچھی چیزیں چھٹی، مٹھائی، آتش بازی وغیرہ اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ان دنوں تیاری کے لئے کلاسوں میں جانا بڑا پر لطف ہوتا تھا۔ ہم کاغذ کی لمبے لمبے سٹریمر اور آرائشی جھنڈیاں بناتے تھے۔ سرخ رنگ کے کپڑے پر سنہری کاغذ سے بنے ہوئے حروف چسپاں کرتے تھے۔ کیلے کے درختوں کے تنوں، آم کی شاخوں اور پتوں اور گیندے کے پھولوں سے سجاوٹ کرتے تھے۔ کاغذ اور کپڑے کے یونین جیک بناتے تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کی تصویروں کو وفادارانہ کلمات سے سجاتے تھے۔ ہم "گاڈ سیو دی کنگ" کا ترانہ انگریزی اور اردو دو مختلف طرزوں میں گانا سیکھتے تھے۔ دورے سے دو دن پہلے شہر کے رنگریز ہماری پگڑیاں رنگنے کے لئے سکول پہنچ جاتے تھے۔ ہر کلاس کی پگڑی کا رنگ علیحدہ ہوتا تھا ——— گلابی، زرد، نیلا، سبز وغیرہ۔

دوسرے دن مقررہ وقت سے گھنٹوں پہلے ہم سکول کی سامنے والی سڑک کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ لڑکے بھی اور سڑک بھی دونوں صاف ستھرے دکھائی دیتے تھے۔ مختلف رنگوں کی پگڑیوں کی دو قطاریں، سبز درختوں، پھولوں اور رنگ دار کاغذوں سے سجا ہوا راستہ سب مل کر دھنک کا سماں پیدا کرتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے جھنڈے ہوتے تھے۔ ہوا میں پھولوں کی مہک ہوتی تھی لیکن ہماری ناک کو مٹھائیوں کی خوشبو زیادہ بھاتی تھی۔ مٹھائی عموماً زرد رنگ کے لڈو ہوتے تھے جو اس وقت سکول میں حلوائی تیار کر رہے ہوتے تھے۔ مٹھائی مفت تقسیم کی جاتی تھی لیکن اس کے لئے گورنر کے گزرنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

آخرکار جلوس پہنچ جاتا تھا۔ آگے آگے پولیس بینڈ اور اس کے پیچھے پولیس والے مارچ کرتے تھے۔ گجرات میں فوج نہیں تھی۔ ان کے بعد تمنوں اور وکٹوریہ گاڑیوں کی لمبی قطاریں ہوتی تھیں۔ وکٹوریہ گاڑیاں وفادار روسا کی ہوتی تھی۔ ان پر تازہ رنگ کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں گجرات میں موٹر گاڑیاں نہیں تھیں۔ آگے والی گاڑی میں عجیب و غریب

لباس میں گورنر اور ان کی لیڈی صاحبہ بیٹھتے تھے۔ ان کے اے ڈی سی کا لباس ان سے بھی زیادہ عجیب ہوتا تھا۔ وہ سر پر ایسی خود پہنتا تھا جس میں سے سرخ رنگ کا پھندنا باہر نکلا ہوا ہوتا تھا۔ جب گورنر' بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کے پرجوش نعرے لگتے تھے تو گورنر اپنا ٹاپ ہیٹ لہرا کر جواب دیتا تھا اور ان کی بیگم شاید ہمارے خیال میں بڑی ڈھیٹائی سے مسکراتی تھی۔ مقامی امراء' رائے بہادر صاحبان' خان بہادر صاحبان' میونسپل کمیٹی کے ممبران اور ضلعے کے سرکردہ زمیندار بھی جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ جلوس کے گزرتے ہی ہم اپنی قطاروں سے نکل کر سکول کی طرف دوڑتے تھے تاکہ ہم اپنے لڈوؤں کا لفافہ حاصل کر سکیں۔ شام کو کمپنی باغ میں آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔ ہم ریلوے سٹیشن پر بھی جاتے تھے تاکہ گورنر کی سپیشل ٹرین بھی دیکھ سکیں جس کا رنگ ہاتھی دانت کی طرح کا تھا۔ ٹرین پر پہرہ ہوتا تھا۔

اس قسم کے اور بھی کئی مواقع تھے : ۱۹۱۸ء کا یوم فتح اور بادشاہ کے چچا ڈیوک آف کناٹ کا دورہ۔ یوم فتح پر ہمیں پریڈ گراونڈ لے جاتے تھے۔ وہاں ہمیں کانسی کے تمغے انعام میں ملتے تھے۔ ہم وہاں تقریریں سنتے تھے اور برطانیہ کے ناقابل تسخیر ہونے کے متعلق گیت گاتے تھے۔ ہم بادشاہ سلامت کی شان میں بھی گیت گاتے تھے۔ جرمنی کی دغا بازی اور شک و شبہ سے بالاتر شکست کے بارے میں بھی گیت گائے جاتے تھے۔ ڈیوک آف کناٹ کی آمد پر بھی تمغے تیار کئے گئے تھے' پریڈیں ہوئیں اور مٹھائیاں تقسیم ہوئیں تھیں۔ اگرچہ یہ سب موقعے ہماری تفریح طبع اور ضیافت کے لئے تو نہیں تھے لیکن ہم ان سے بڑے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کا اصل مقصد برطانیہ کے لئے وفاداری کا جذبہ اور اس کے ساتھ ایک تعلق پیدا کرنا تھا۔ ہم نے برطانیہ کے اہم افراد کے ساتھ چھٹی' رنگ دار پگڑیاں اور مٹھائیاں منسلک کر دی تھی لیکن یہ ظاہری اہمیت اور شان و شوکت غیر انفرادی اور غیر شخصی تھی۔ اپنے عجیب و غریب ہیئت اور فاصلے کی بنا پر ہمارے لئے وہ بے معنی تھے سوائے اس کہ یہ بڑے لوگ ہیں جن کا خیر مقدم کرنا سب کے لئے ضروری ہے۔ بڑے لوگوں کے لئے ان کا مفہوم مختلف تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں مدعو کیا جانا نمایاں ہونے کی علامت تھی جس سے اہم اور بلند مقام کے حتمی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ایسی دعوتوں پر مدعو ہونا بڑی عزت افزائی تھی اور کسی کا مدعو نہ کیا جانا اس کے غیر اہم ہونے کا واضح ثبوت تھا۔ گورنر کی پارٹی کے ہاتھی دانت کے رنگ کے کریسنٹڈ کارڈ بڑی حفاظت سے کپڑے میں لپیٹ کر رکھے جاتے تھے اور اپنی وفاداری کے ثبوت میں انگریز افسروں کو پیش کئے جاتے تھے۔ کبھی

کبھی میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریز اسے ایک رسمی چیز سے زیادہ کوئی اہمیت دیتے ہوں گے یا ان کی شان میں گائے ہوئے گیتوں اور ہمارے بزرگوں کے سادہ اظہار وفاداری کو وقتی انبساط کے علاوہ بھی کوئی وقعت دیتے ہوں گے۔ بعد میں جب میں نے برطانیہ میں لوگوں کو بادشاہ اور ملکہ کے حق میں نعرے لگاتے دیکھا تو مجھے فوراً ہی فرق محسوس ہوا۔ کسی شخص کا صرف یہ سادہ سا جملہ "وہ صحت مند نظر آ رہا ہے" اس افتخار اور محبت کا اظہار کرتا تھا جو زیادہ گہرے سوتوں سے پھوٹتے ہیں۔ گورنر کا اودی رگوں والا سرخ چہرہ اور اس کی بیگم کا پاؤڈر شدہ چہرہ ان کے اصل جذبات کی کوئی صحیح عکاسی نہیں کرتے تھے۔ ہم سے پہلے کی نسلیں ان کو امن و انصاف کی علامتیں سمجھ کر تشکر کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ لیکن ہمارا واسطہ تو انگریزی راج کی برکتوں سے تھا جن کو ہم روزمرہ کی زندگی کے نظام کا فطری جزو سمجھتے تھے لیکن یہ نظام بھی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے جلد ہی تباہ ہونے والا تھا۔ اس چھوٹے سے شہر گجرات میں زندگی پھر اسی ڈھب پر نہیں آ سکتی تھی اور ۱۹۴۷ء کی رستاخیز نے تو صدیوں کے پیٹرن کو بدل دیا۔ دوسری دفعہ ایک کاٹھیا واڑ سے نیا خیال گجرات پہنچا۔ پہلا خیال سوامی دیانند کا آریا سماج کے آدرش کا تھا اور دوسرا گاندھی جی کا قوم پرستی کا تصور۔

یہ گڑگڑاہٹیں گجرات میں بڑی ہلکی تھیں۔ پنجاب کے باہر کے کچھ لوگوں نے اس موضوع پر کچھ تقریریں کیں جن کو سمجھنا ہمارے لئے مشکل تھا۔ ہم صرف کتھا' مذہبی موضوعات پر گفتگو اور آریا سماج کے وعظ سننے کے عادی تھے۔ سیاسی تقریریں ہمارے لئے نئی تھیں۔ پنجاب میں باہر سے آنے والے لوگ ہندوستان کی آزادی کی بات کرتے تھے تو ہم حیران ہوتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے کل یگ کی بات جانی پہچانی مثالوں اور روزمرہ میں کی تو ہمیں پتا چلا کہ ان لوگوں کا مطلب کیا ہے۔ کیا یہ پیشین گوئی نہیں کی گئی تھی کہ ہندوستان کی تاریخ میں سات یگ ہوں گے۔ سچائی' خوشحالی اور انصاف کا دور یعنی ست یگ گزر گیا۔ اس کے بعد غربت' افلاس' غلامی' اخلاقی انحطاط اور جھوٹ کا دور شروع ہوا۔ یہ کل یگ ہے جس میں انسان نے اپنے الفاظ کے معنی کھو دیئے ہیں' وہ نئی عدالتوں میں جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور اپنی دروغ گوئی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس زمانے میں رواج' گرو اور بزرگوں کا احترام کرنا انسان نے چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنی برادری سے انحراف کرتا ہے اور ایسی روش اختیار کرتا ہے جو اگر اس نے کل اختیار کی ہوتی تو اس کی عزت اور ذات دونوں برباد ہو جاتے۔ اَن (یہ لفظ اناج اور کھانے سے زیادہ معنی رکھتا ہے) اور دودھ کی

اب قلت ہو گی جبکہ کل تک ان کے دریا ہمالیہ سے نکل کر پورے ہندوستان میں بہتے تھے۔ یہ دولت مند ملک ایک سنہری چڑیا ہے جسے اب پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے پر نوچے جا رہے ہیں۔ یہ گھریلو مثالیں تھیں جن میں داستانیں بھی تھیں اور تاریخ بھی۔ یہ آسانی سے سمجھ آ جاتی تھیں لیکن ان سے اخذ کئے جانے والا نتیجہ کہ ان سب کی وجہ انگریزی راج ہے' اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کل یگ کے لئے انگریز کیسے ذمہ دار ہے جس کی پیش گوئی بہت عرصہ پہلے کی جا چکی تھی۔

ہمیں کاٹھیا واڑ کے ایک چھوٹے سے سادے آدمی کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ نئے روزمرہ میں بات کرتا ہے۔ گاندھی نے ہندوستان کو بھارت ماتا کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام ماضی کی یادیں جگاتا تھا۔ اس کا تلازمہ گاؤ ماتا تھا۔ یہ ہندو ذہن پر اثر انداز ہوا۔ مسلمانوں نے فوراً ہی اس کا جواب خلافت عثمانیہ کے حق میں تحریک خلافت اور مادر ہند کی صورت میں دیا۔ قومی افتخار کا ذکر گاندھی نے نئے الفاظ میں کیا کہ برطانوی امن دراصل غلامی ہے۔ آہستہ آہستہ ہمارے ذہنوں میں ایک نئی تصویر ابھرنے لگی جس کے مطابق ہندوستان کل یگ سے نکل کر رام راج میں داخل ہو رہا ہے۔

جب گاندھی کی گرفتاری کی خبر آئی تو گجرات میں بھی تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی۔ ہمارے ایک خوصورت نوجوان چچا زاد بھائی نے جو لالہ ٹھاکر داس کا پوتا تھا' کچھ نوجوانوں کو ساتھ لے کر تار برقی کی تاریں کاٹ دیں اور شہر میں گشت بھی کیا۔ پولیس نے اسے پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو گیا ہے۔ عین اسی دوران ہماری والدہ ہمارے ایک رشتے دار کو ملنے لاہور گئی ہوئی تھیں۔ وہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ خیر وہ پریشان تو نہ ہوئیں لیکن انہوں نے لاہور سے نکلنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن ہر بار سپاہی انہیں واپس بھیج دیتے تھے۔ وہ بہت سادہ اور معصوم عورت تھیں اور ان کے بارے میں شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا وہ سیاسی مقاصد کے تحت مارشل لاء کی خلاف ورزی کر رہی ہیں۔ اگرچہ ریل گاڑیاں نہیں چل رہی تھیں پھر بھی انہوں نے فوجیوں سے کہا کہ وہ ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی کا انتظار کریں گی۔ میں انہیں جانتا ہوں اور اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ سپاہیوں سے بچ کر نکل جاتیں تو پورے اسی میل پیدل چل کر گجرات پہنچ جاتیں۔

لاہور سے ہر قسم کی افواہیں آ رہی تھیں: لوگوں کو پیٹا جا رہا ہے' اجتماعی گرفتاریاں ہو

رہی ہیں' لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل رینگنے کا حکم دیا جاتا ہے' دھوپ میں چھ چھ میل پیدل چلا کر طالب علموں کو چھاؤنی میں جھنڈے کو سلام کرنے کے لئے فوجی لے جاتے ہیں۔ اور پھر امرت سر میں جلیاں والا باغ کی خبر آئی۔ ہم نے سنا کہ جنرل ڈائر نے باغ کے دروازے پر مشین گنوں سے مورچہ لگا دیا تھا جو اس پائین باغ میں داخلے کا واحد راستہ تھا اور جس کے چاروں طرف بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہاں سے ڈائر نے گولیاں برسانا شروع کیں۔ لوگ بھاگے لیکن راستہ نہ پا کر درختوں پر چڑھ گئے۔ ان کو اور وہ جنہوں نے ایک نیچی دیوار کی آڑ میں پناہ لے لی تھی' گولیوں کی بوچھاڑوں سے اکٹھا کر کے ڈھیر کر دیا گیا یہ بھی بتایا گیا کہ جب اس کی بندوقوں کے لئے سب گولی بارود ختم ہو گیا تو بین کرتی ہوئی بیواؤں اور یتیموں کو مردوں کے ڈھیروں میں اپنے لواحقین کو تلاش کرتے ہوئے چھوڑ کر ڈائر اور اس کے تھکے ہوئے سپاہی اپنے ہتھیار اٹھا کر واپس لوٹ گئے۔ ڈائر نے فاتحانہ انداز میں اعلان کیا کہ سارا باغی شہر اس کے رحم و کرم پر تھا اور وہ اسے جلا دینا چاہتا تھا لیکن پھر اسے رحم آ گیا اور وہ رک گیا۔

گجرات کے لوگ چکرا گئے اور ان کے ذہنوں میں نادر شاہ کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ لیکن نادر شاہ تو محض ایک مہم جو تھا' ایک لٹیرا تھا' جس نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس اس قتل عام کا جواز ہے: دھلی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد اس کے کچھ سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور وعدہ خلافی کی سزا قتل عام تھی۔ لیکن یہ سرکار تو مختلف تھی۔ یہ تو مہربان اور رحم دل تھی۔ اس نے ساٹھ سال تک طاقت کے روایتی ہتھکنڈوں کے بغیر حکومت کی ہے۔ اچانک یہ تبدیلی کیوں؟ ساٹھ سال کے بعد تو ہم یہ بھی بھول چکے تھے کہ ہمارے اوپر برطانیہ کی حکومت ہے۔ ان چند گوروں کے سوا جو تانگوں سے سگریٹ باہر پھینکتے تھے تاکہ لوگوں کو ان کی عادت پڑے' شہر میں کبھی کوئی انگریز نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں تعینات تین یا چار انگریزوں کو دیکھنے کے لئے شہر سے نکل کر سول سٹیشن جانا پڑتا تھا۔ ان میں ڈپٹی کمشنر' سپرنٹنڈنٹ پولیس' کبھی کبھار ایکس ای این' اور ممکن ہے سیشن جج یا شاید پادری صاحب تھے۔ ہندوستانی خود اعلیٰ افسر بن رہے تھے۔ قبولیت کے اس پرسکون ماحول میں فولادی کلے سے کام لینا بڑا عجیب لگتا تھا۔ سیاست دانوں کی باتوں پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ یہ بے معنی باتیں تھیں جو ہم اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ کبھی ہندوستان میں دودھ اور گھی کی نہریں بہتی تھیں اور اب اس کل یگ کو دیکھو۔ اور اگر کسی نے آزادی اور مساوات کی بات کی تو کیا ہماری انگریزی کی کتابیں یہی کچھ نہیں پڑھاتی

تھیں؟

اب پنجابیوں کی تیسری نسل آ رہی تھی جس کی پرورش انگریزی فکر پر ہوئی تھی اور اسی کے مطابق وہ اپنے لئے سوچنے لگے تھے۔ میرے والد کی نسل ٹریبیون اخبار میں خبریں اور اداریے پڑھتے تھے۔ وہ بڑے محتاط انداز میں بات کرتے تھے لیکن انہوں نے بھی پہلی دفعہ سیاست کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ہر شخص سیاست پر بحث کرتا تھا۔ سکول کے طالب علموں نے بھی گاندھی' تلک' لاجپت رائے' علی برادران' بھارت ماتا اور آزادی جیسے نام سیکھ لئے تھے۔ کیا کوئی تبدیلی آنے والی تھی؟ اپنے ناگزیر سلسلوں میں بادشاہیاں اور شاہی خاندان سمندر کی موجوں کی طرح ابھرے اور اسی طرح ساقط بھی ہو گئے۔ عقلمند لوگوں کے سر ہلنا شروع ہو گئے اور انہوں نے پھر حکمت کی پرانی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب کوئی حاکم موقع کی مناسبت سے زیادہ تند ہو جائے تو یہ اس کے خوف زدہ ہونے اور خود اعتمادی کی کمی کی علامت ہے۔ اگر اس کی تندی سے کوئی فایدہ نہ ہو تو اگلی دفعہ وہ اور تند ہو جاتا ہے اور پھر کچھ حاصل کئے بغیر وہ خود ہی تھک جاتا ہے۔ نئے حاکم ایسے نہیں لگتے کہ وہ تندی زیادہ دیر تک برداشت کر سکیں گے۔ پنجاب کے لئے تبدیلی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ عرصہ دراز سے پنجاب میں اتنی بار تبدیلیاں آ چکی ہیں کہ پنجابی اپنی گرد آلود خشک زمین پر آنے والی بارش کی طرح ان تبدیلیوں کو سونگھ لیتے ہیں۔

اگرچہ آنے والے چند برسوں میں گجرات میں ہمیں عدم تعاون اور ستیہ گرہ نے تو اتنا متاثر نہ کیا مگر جیسے جیسے یہ تحریک پھیلتی گئی ہم بھی اس قسم کی سادہ اصطلاحوں میں بحث و مباحث کرنے لگے۔ گجرات میں کبھی کبھی سیاسی جلسے اور ہڑتالیں ہو جاتی تھیں اور شراب کی دکانوں یا اسی قسم کے جنرل سٹورز پر پکٹنگ بھی ہو جاتی تھی لیکن شہر نے سیاست میں زیادہ دلچسپی نہ لی اور یہ اپنی قرون وسطی والی رفتار سے ہی چلتا رہا۔

آٹھواں باب

ہم ابھی گجرات ہی میں تھے جب میرے والدین نے میرے چچا کی شادی طے کر دی۔ چچا اپنی قانون کی پریکٹس شروع کر چکے تھے۔

ڈگری کا امتحان پاس کرنے میں میرے چچا نے کافی وقت لگایا تھا۔ وہ اب چوبیس سال کے تھے اور ہمارے ہاں اتنی دیر کنوارے رہنا غیر معمولی بات تھی۔ شادی میں تاخیر کے بارے میں کئی لوگ سوال کرتے تھے اور میری ماں نے محسوس کیا کہ اب چچا کی شادی میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ اگر بزرگوں کو اپنی مرضی کرنے دی جاتی تو ان کی شادی ان کے طالب علمی کے زمانے میں ہی ہو چکی ہوتی۔ زمانہ بدل رہا تھا اور یہ میرے والد کے خیالات کے عین مطابق تھا کہ میرے چچا عملی زندگی میں داخل ہو کر شادی کریں۔ پرانے خیالات کے مطابق ایسی سوچ غیر متعلق تھی اس زمانے میں بالغ ہوتے ہی شادی ہو جاتی تھی نہ کہ اس وقت جب آپ کمانا شروع کریں۔ شادی اور کمائی دو مختلف چیزیں تھیں۔ شادی خاندانی' سماجی اور مذہبی فریضہ تھی جبکہ آمدنی محض حالات کا معاملہ تھا۔ میرے چچا کا چوبیس سال تک شادی نہ کرنا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہماری برادری میں پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن اب تو چچا کما بھی رہے تھے۔ چنانچہ والد نے میرے والدہ سے اتفاق کیا کہ یہ موقع بڑا مناسب ہے۔ لوگوں کو بھی اس فیصلے کی اطلاع ہو گئی۔

طے شدہ شادیوں میں محتاط والدین کئی باتیں پیش نظر رکھتے ہیں۔ لڑکی کا کھتری اور باہری ہونا لازمی ہے۔ اسے تعلیم یافتہ بھی ہونا چاہئے۔ اس سے صرف یہ مراد تھی کہ وہ کوری ان پڑھ نہ ہو۔ میرے چچا اچھے قد کاٹھ کے آدمی تھے اس لئے لڑکی کو بھی جسمانی طور پر اسی قسم کی ہونا چاہئے۔ چچا پکے رنگ کے تھے اس لئے لڑکی کا رنگ بھی سفید ہونا چاہئے۔ مزاج کے لحاظ سے اسے سنجیدہ اور متین ہونا چاہئے کیونکہ کالج کے دنوں میں میرے چچا اخلاقی پابندیوں سے بے پرواہ تھے۔ مختصرا میرے والدین ایسی لڑکی کی تلاش میں تھے جس میں میرے چچا کی ساری خوبیاں ہوں اور وہ میرے چچا کی تمام کمزوریوں کی تلافی بھی کر سکے۔ ایک اور خیال جو ہمارے طبقے میں پیدا ہو چکا تھا یہ تھا کہ لڑکی کا تعلق ایسے

خاندان سے ہو جو نئے پیشوں میں سے کسی ایک سے وابستہ ہو۔

ہمیں گجرات اور باہر سے کئی رشتے آنے لگے۔ گجرات کی کئی لڑکیوں کو تو میری والدہ جانتی تھیں اور کئی دوسری لڑکیوں کے بارے میں وہ سن چکی تھیں۔ لڑکا ان کے خیال کے مطابق باصلاحیت تھا اور ہمیں کافی دیر تک کسی اور کی شادی نہیں کرنی تھی' اس لئے وہ کڑا انتخاب کرنے میں حق بجانب تھیں اور خاصی مین میخ نکال سکتی تھیں۔ باقی لوگ اتفاق کرتے تھے کہ آخر وہ ایسا کیوں نہ کریں۔ لڑکا خوش شکل تھا اور کمائی بھی کر رہا تھا۔ اس کا چچا اور بڑے بھائی کا مقام بھی تھا اور اگر اس کے والدین نہیں تھے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اگر کالج کے زمانے میں وہ گمراہ تھے (یہ شہرت گجرت میں پہنچ چکی تھی) تو اس کا مطلب تھا کہ وہ تجربہ کار ہیں اور اس نے دنیا دیکھی ہے۔ تاہم میری والدہ کو مشورہ دیا گیا کہ اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ زیادہ جگہ انکار کرنے پر لوگ چہ مہ گوئیاں کرنے لگیں گے۔ میری والدہ ابھی نرم پڑنے ہی والی تھیں کہ ایک ایسا پیام آیا جس میں انہیں فوری دلچسپی پیدا ہو گئی۔

بھمبر اور کشمیر کے راستے پر گجرات کے قریب ہی ایک چھوٹے سے گاؤں پیرو شاہ میں ایک باہری کھتری خاندان رہتا تھا۔ ان کی ذات وہرہ تھی۔ لڑکی کا والد ابھی ابھی سرکاری ملازمت سے بطور افسر مال ریٹائر ہوا تھا۔ ایک ادنے مقام سے اس نے بڑی ترقی کی اور رائے بہادر کا خطاب بھی پایا۔ وہ پنجاب کے گورنر اوڈائر کا ذاتی دوست اور پروردہ تھا۔ جوانی میں لڑکی کا والدہ اوڈائر کا منشی اور ساتھی بھی رہ چکا تھا۔ دونوں نے ملازمت اکٹھی کی تھی اور ترقی بھی اکٹھے ہی کی تھی۔ اس کا ایک بیٹا امریکہ سے پڑھ کر آیا تھا۔ لڑکی ہر لحاظ سے بڑی اچھی تھی۔ ہمارے خاندان کے لئے یہ رشتہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ میری والدہ نے میرے والد سے بات کی اور مشورہ دیا کہ اپنے خاندانی حجام کو جو مسلمان تھا اور جسے احتراماً راجا کہا جاتا تھا' بات چیت کے لئے روانہ کریں۔

راجا نے ساری تفصیلات بڑے غور سے سنیں اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دوسرے حجاموں سے رابطہ کیا۔ کچھ وقت اس نے بازار میں گزارا جہاں وہ اپنے مقصد کے متعلق بڑی ہوشیاری سے سوالات پوچھتا رہا۔ اپنا اطمینان کر کے وہ رائے بہادر کے گھر پہنچا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ گجرات کے چند معزز خاندانوں کا راجا ہے تو اس کا استقبال بڑی خوش اخلاقی سے کیا گیا۔ اس کی آمد کا مقصد واضح تھا گو راجا اس طرف آنے کے لئے کسی عجلت میں نہ تھا۔ وہ اپنے مقصد کی اہمیت اور اس کے نتیجے میں مہمان نوازی

سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوا۔ کیونکہ وہ دو خاندانوں کی عزت بنا بھی سکتا تھا اور بگاڑ بھی سکتا تھا اس لئے اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ حقہ پینے کے دوران اس نے بڑی ہنر مندی سے دنیاداری پر بات شروع کی اور والدین کے اطمینان کا اچھی اولاد پر مبنی ہونے کے موضوع پر اظہار خیال کیا اور کہا یہ اطمینان تو صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بچوں کی مناسب جگہوں پر شادیاں ہوں اور وہ خوش رہیں۔ رائے بہادر اور ان کے ملاقاتی ساری بات سنتے رہے اور اتفاق کا اظہار کرتے رہے۔

جب سب ملاقاتی چلے گئے تو رائے بہادر نے بڑی راز داری سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ راجا نے صرف اتنی اطلاعات فراہم کیں جو رائے بہادر کی تسلی کے لئے کافی ہوں۔ وہ اس وقت زیادہ تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اگلی صبح بھی وہ مہمان نوازی کا مزہ لوٹنا چاہتا تھا ان معاملات میں طرفین کو پیش قدمی کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے' ایسی پیش قدمی جس میں پورا پورا رکھ رکھاؤ ہو اور اشتیاق کی کمی بھی نظر آئے۔ عجلت میں اور قبل از وقت ایسے کوئی استفسارات نہیں ہونے چاہئیں جن سے اشتیاق یا پریشانی ظاہر ہو۔ اس کے بعد رائے بہادر اندر چلے گئے اور ملازموں کو ہدایت کر گئے کہ وہ راجا کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھیں۔ اندر جا کر انہوں نے اپنی بیوی سے بات کی جس نے اتفاق کیا کہ معاملے کو آگے بڑھایا جائے۔

صبح راجا نے گرم دودھ' پراٹھوں اور مٹھائیوں سے پیٹ بھر کے ناشتہ کیا اور اطمینان کی ڈکار لی۔ اس کے بعد وہ حقے کے کش لگانے لگا۔ مقصد کی طرف آنے کی بجائے اس نے رائے بہادر' ان کے نام اور شہرت اور خاندان کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ جب میزبان کی کچھ تسلی ہوئی تو اس نے ہمارے خاندان کے بارے میں باتیں شروع کر دیں اور آخر تان عین مناسب جگہ پر آ کر ٹوٹی یعنی میرے چچا پر۔ اگر میرے چچا یہ سارے باتیں سنتے تو وہ بڑے محظوظ ہوتے اور ان کی حس ظرافت کی بھی تسکین ہوتی۔ راجا نے چچا کی ساری کمزوریوں کو اپنے زور بیان سے خوبیوں میں تبدیل کر دیا۔ چچا نے کئی سال کالج میں لگائے اس لئے نہیں کہ وہ فیل ہوتے رہے بلکہ وہ اپنے پروفیسروں کے اتنے منظور نظر تھے کہ چچا کے جانے پر وہ رضامند ہی نہ ہوتے تھے اور اسے بار بار فیل کر دیتے تھے۔ وہ کالج کی زینت تھے اور ان کے استاد انہیں کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا رنگ کرشن مہاراج جیسا تھا۔ خدا نے ان کے والدین چھین لئے لیکن اس کمی کا ازالہ بڑے بھائی اور بھابھی کی صورت میں کر دیا جنہوں نے چچا کی پرورش اپنے پلوٹھی کے بچے کی طرح کی۔ چچا

کا بھائی بہت بڑا انجینیئر ہے جس نے سارے کا سارا ڈیم اکیلے ہی تیار کر دیا تھا اور جسے نہری علاقے میں دیوتا کی طرح پوجا جاتا ہے۔

دوپہر میں بیوی کے ساتھ مزید صلاح مشورے کے بعد رائے بہادر نے بڑے سادہ اور جذباتی الفاظ میں راجا کو بتایا کہ اس تجویز سے ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی ہے اور وہ اپنی حنور نظر سب سے چھوٹی بیٹی دینے کو تیار ہیں۔ انہیں پورا بھروسہ ہے کہ اپنے نئے گھر میں وہ خوش رہے گی۔ انہوں نے راجا کا شکریہ ادا کیا اور اس کی پر خلوص تعریف کی۔

راجا اسی شام تانگے میں گجرات آیا حالانکہ اتنا سفر وہ پیدل بھی کر سکتا تھا۔ اپنے کام اور مشن کو بڑی نزاکت اور مہارت سے کامیاب کرنے پر وہ بڑا مطمئن تھا۔ اس نے ہمیں پیغام بھیجا کہ اسے ہم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور وہ صبح ہمارے گھر آئے گا۔ راجا یہاں بھی بڑا محتاط تھا اور یہاں بھی اس نے کوئی جلدی نہیں کی۔ ہم اس پیغام سے ہی مطمئن ہو گئے۔ صبح آ کر اس نے ساری بات پوری تفصیل سے بتائی۔ اسے انعام دیا گیا اور وہ دعائیں دیتا ہوا اور شادی پر مزید انعام کی توقعات لئے ہوئے رخصت ہوا۔

چچا سے بات ہوئی تو انہوں نے میرے والدین کو بتایا کہ وہ ان کی رضا پر راضی ہیں۔ اس پر ہماری والدہ نے خود پیرو شاہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنی ایک بزرگ خاتون کے ساتھ رائے بہادر کے گھر چلی گئیں۔ ان کی آمد متوقع تھی۔ میری والدہ آہستہ آہستہ اپنے مقصد کی طرف آئیں۔ وہ جوان اور ناتجربہ کار تھیں اور انہوں نے راجا جیسے تیقن کے بغیر بات شروع کی۔ لیکن اپنے مقام کی بزرگی کی بنا پر ان کے کردار میں ایک طرح کا قدرتی وقار موجود تھا۔ میری والدہ نے میرے چچا کی تعریفیں کیں۔ اسی طرح رائے بہادر کی بیوی نے بھی اپنی بیٹی کی تعریفیں کیں مثلاً جو مٹھائی میری والدہ نے اس وقت کھائی وہ ان کی بیٹی نے ہی تیار کی تھی اور جس گدے پر میری والدہ بیٹھی ہیں اس پر کشیدہ کاری بھی اسی نے کی تھی۔ وہ بڑی سگھڑ لڑکی ہے۔ آج کل کے لڑکے پڑھی لکھی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن تعلیم صرف اتنی ہونی چاہئے کہ لڑکیاں حد سے آگے نہ نکل جائیں۔ اس سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی ہے۔ گدے پر ان کی لڑکی نے نہ صرف ہندی میں بلکہ انگریزی میں بھی ویلکم لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آج کل بچوں کی صحیح پرورش کرنا بہت ضروری ہے وغیرہ وغیرہ اور یوں ماں اپنی بچی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ آخر میری ماں نے بڑی احتیاط سے بچی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہی اہم ترین مرحلہ تھا۔

اپنی لڑکی کے مناسب رشتے کے لئے تمام مائیں بے چین ہوتی ہیں۔ انہیں زندگی میں ایک قرض اتارنا ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی بیٹی ایک اچھے گھر جائے جہاں ایک دن وہ گرہ لکشمی یعنی گھر کی دیوی کہلائے۔ وہ اپنی بیٹیوں پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن خواہ وہ اپنی بیٹیوں کو کتنا ہی سلیقہ شعار کیوں نہ سمجھیں ان کے دل میں ایک اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ آنے والی اجنبی خاتون جو خود ایک ماں ہے اور وہ بھی اپنے بیٹے پر اسی طرح فخر کرتی ہے، اس کی ہیرے جیسی لڑکی کو لڑکے کے غیر مناسب خیال کر کے رشتے سے کہیں انکار نہ کر دے۔ اگر خدا چاہے تو اور رشتے بھی آ سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس رشتے سے بہتر ہی ہوں لیکن ہر انکار پر ماں کا افتخار مجروح ضرور ہوتا ہے۔

مہمان کے گھر میں داخل ہوتے ہی لڑکی کو علیحدہ کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ لڑکی کو مہمانوں کے آنے کا مقصد معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ دوسرے کمرے میں اسی پریشانی کے عالم میں کچھ کرنے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ اس کے معصوم ذہن میں سینکڑوں سوال آئے ہوں گے اور جب وہ اس ہیجانی کیفیت میں اپنے خیالات مجتمع کر رہی تھی تو اس کی ماں کی آواز آئی "بیٹا" شربت بنا کر مہمانوں کے لئے لاؤ۔" چاہنے والے ماں باپ لڑکیوں کو بھی بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنا آدھا معصوم چہرہ دوپٹے سے ڈھانکے ہوئے وہ ایک چمکدار کانسی کے جگ میں شربت لے کر آئی۔ جب وہ صحن میں سے گزر رہی تھی تو میری والدہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ لڑکی لنگڑاتی تو نہیں یا اس میں کوئی اور جسمانی خرابی تو نہیں۔ اب وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اس میں کوئی نقص تو نہیں۔ لڑکی نے میری ماں کو جھک کر سلام کیا۔ وہ سادہ لباس میں تھی۔ کنواری ہونے کی مناسبت سے اس نے کوئی زیور نہیں پہنا تھا۔ اس نے مدھم ڈیزائن والی قمیض اور سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ سر پر گھر کا رنگا ہوا سبز دوپٹہ تھا۔ اس کی نازک کلائیوں پر کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں آرائش کی بجائے صرف سوراخوں کو کھلا رکھنے کے لئے سونے کی باریک بالیاں تھیں۔ اس کی مانگ سیدھی تھی اور پراندہ کالے رنگ کا تھا۔ اس کا جسم بچگانہ تھا۔ اس کی چھاتیاں بھی ابھی پوری طرح نہیں ابھری تھیں۔ اس کی عمر اگرچہ سترہ سال تھی لیکن میری ماں کے خیال میں وہ اپنی عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اس میں اچھی پرورش پانے والی لڑکیوں کی باحیا سادگی تھی۔ میری والدہ کے خیال میں اس کا چہرہ خوبصورت تھا جو شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" میری ماں نے پوچھا۔
"ہم اسے ساوتری کہتے ہیں" اس کی ماں نے جواب دیا۔
میری ماں نے کچھ دیر سوچا اور کہا "نام تو بڑا خوبصورت ہے۔ ہمارے گھر میں ساوتری کوئی نہیں"۔ بس، اس پر معاملہ طے ہو گیا۔

اسی اثنا میں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے مناسب ہیں کہ نہیں میرے چچا اور ساوتری کے زائچے تیار کئے گئے اور انہیں تسلی دی گئی کہ دیوتاؤں کو یہ جوڑا پسند ہے سورج نے اس جوان کو طاقت اور زہرہ نے جو ہمارے ہاں مذکر ہے، اس نوجوان کو مردانگی اور رجولت دی ہے۔ مشتری نے لڑکی کو اشیر واد دی ہے جس کے بل پر گھر کو اچھی طرح چلائے گی۔ ایک مقررہ دن پر رائے بہادر کے گھر والے شگن لے کر گجرات آئے۔ لڑکی کی طرف سے صرف مرد رشتے دار ہی آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہجوم تھا جو بڑے بڑے تھال اٹھائے ہوئے تھا۔ مٹھائیوں، تازہ پھلوں، خشک میووں جس میں ناریل ایک لازمی جزو تھا، چھوہاروں اور باداموں سے وہ بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سو ایک روپیہ نقد سلامی دی۔ روپیہ اپنی حیثیت کے مطابق دیا جاتا ہے لیکن ہر مبارک موقع پر رقم طاق ہونی چاہئے جیسے گیارہ، اکیس، اکتیس، اکتالیس، اکاون یا ایک سو ایک۔ صرف پچیس اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اگر منگنی ٹوٹ جائے تو یہ رقم لڑکی کے والدین کو واپس کرنا ضروری ہے۔ ہم نے مہمانوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ میرے چچا نے رائے بہادر کے پاؤں چھوئے جنہوں نے اپنے ہونے والے داماد کی پیشانی پر سندھور کا ٹیکہ لگایا۔ طرفین کے رشتہ داروں نے ایک دوسرے کے تلک لگائے اور رائے بہادر نے اس وقت موجود رشتے داروں کو تھوڑے تھوڑے روپے تحفے کے طور پر دیئے۔ سلام دعا کے بعد مہمان رخصت ہو گئے۔ بعد میں ہم نے یہ مٹھائی اپنے رشتے داروں اور برادری والوں میں تقسیم کر دی اور ہر ایک کو اس کی قربت کی مناسب سے حصہ ملا۔ اس کے بعد شادی کے مہورت کے لئے زائچوں پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالی گئی۔

پرانے زمانے میں تو لڑکیوں کی منگنی چھوٹی عمر میں ہی کر دی جاتی تھی اور شادی جوان ہونے پر ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو بچی ابھی شیر خوار ہی ہوتی تھی کہ اس کی نسبت قریبی رشتے داروں میں طے پا جاتی تھی۔ ایک معمر خاتون نے مجھے بتایا کہ اسکی منگنی تو اس

کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہو گئی تھی گو ایسا محض اتفاق سے ہوا تھا۔ اس خاتون کی والدہ اپنی دو سال کی بچی کے ساتھ خاندان کے قریبی دوستوں کے گھر گئی۔ وہ بچی بڑی خوبصورت تھی اور جب وہ میزبان خاتون کے چار سال کے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی تو دونوں مائیں بڑے فخر سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ لڑکے کی والدہ نے کہا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی بہو بنائے گی۔ لڑکی کی والدہ نے اصولی طور پر ہاں کر دی لیکن دونوں کی عمر میں فرق صرف دو سال کا تھا جو مناسب نہیں تھا۔ لڑکی کی والدہ نے وعدہ کیا وہ لڑکے کی ماں کو بہو بنانے کے لئے اپنی اگلی بچی دے گی۔ دو سال بعد اس کے ہاں واقعی لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے اور لڑکی کی عمروں کے درمیان چار سال کا فرق مناسب سمجھا گیا اور یوں دونوں کی منگنی ہو گئی۔ یہ معمر خاتون وہی لڑکی تھی۔

ساوتری کی پیدائش پر ہی اس کی ماں نے اس کا جہیز اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا لیکن شادی سے ایک ماہ پہلے تیاریاں زور شور سے ہونے لگیں۔ درزی، کڑھائی کرنے والے، فرنیچر بنانے والے، ٹھٹھیرے اور سنار آ پہنچے۔ حلوائی اپنے بڑے بڑے برتنوں سمیت شادی اور برادری میں تقسیم کرنے کے لئے مٹھائیاں بنانے کے لئے آ گئے۔ بارات کو تین دن ٹھہرانے اور ان کے رہنے اور کھانے کا انتظام شروع ہو گیا۔ رائے بہادر بیرو شاہ کے بڑے آدمی تھے اور چونکہ اس خاندان کی یہ آخری شادی تھی اس لئے تمام انتظامات کا خاص طریقے سے ہونا ضروری تھا۔ لڑکی کی شادی بڑا تھکا دینے والا کام تھا۔

شگن کے بعد پہلی رسم میری والدہ کے لئے بھوجا بھیجنا تھا۔ انہوں نے میری ماں کے لئے کچھ روپے، کچھ زیور، کپڑوں کا جوڑا، کھوپڑا، چھوہارے، چینی اور چاول بھیجے۔ کچھ دن بعد انہوں نے پھر تحفے بھیجے۔ اسے گِد کہتے ہیں۔ اس میں ایک بھاری دوپٹہ تھا جس پر سنہری بارڈر لگا ہوا تھا، کچھ ہلکے کپڑے، خشک میوہ اور کچھ چاول اور شکر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شگن کے دن سے تحفوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا تھا۔ لڑکی کی شادی شدہ زندگی میں اسے اپنے والدین، چچاؤں اور بھائیوں سے زندگی بھر تحفے ملتے رہیں گے یعنی علاوہ دوسری رسومات کے جب اس کے بچے ہوں گے اور جب ان بچوں کی شادیاں ہوں گی۔

جب شادی کا دن قریب آیا تو سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا: پہلے بچے اور عورتیں آئیں اور پھر مرد بھی آ گئے۔ مقامی دعوت نامے ان کے راجا کے ذریعے بھیجے گئے۔ وہ ہر گھر گیا اور صابن کی دو ٹکیاں آنے والے مہمان کے گھر چھوڑ آیا۔ یہ پرانا رواج تھا جس کا مطلب تھا کہ دعوت میں آنے سے پہلے اپنے کپڑے دھو لیں۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا اور

چاروں طرف ہنگامہ تھا۔ معمر خواتین نے موقع غنیمت جانا۔ اس وقت وہ اپنے تمام غصے گلے ـــ کچھ حقیقی اور کچھ خیالی ـــ دل بھر کر نکال لیں۔ تمام رشتے دار اکٹھے ہو چکے تھے اور ایسے موقعے روز روز تو نہیں آتے۔

ہر رات عورتیں اور لڑکیاں بڑے صحن میں اکٹھی ہو جاتی تھیں اور ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ کے گیت گاتی تھیں۔ ان گیتوں کو ساگ گانا کہتے ہیں۔ یہ روایتی گیت ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتے آئے ہیں۔ ان میں لڑکی کی کامیاب شادی شدہ زندگی کے لئے دعائیں ہوتی ہیں۔ یہ گیت مکالے کی صورت میں ہوتے ہیں۔

باپ: بیٹی تم چندن کے درخت کے پیچھے کیوں کھڑی ہو؟

بیٹی: میں اس لئے کھڑی ہوں بابا' کہ میں اچھی شادی چاہتی ہوں۔

باپ: تمہیں کیسا ور چاہئے؟

بیٹی: جیسے تاروں میں چاند چمکتا ہے
جیسے چاند کے مقابلے میں کرشن چمکتا ہے.
مجھے ویسا ور چاہئے۔

اس کے بعد لڑکی اپنے بھائیوں اور پھر چچاؤں کو اسی طرح مخاطب کرتی ہے۔

راتوں کو بڑی دیر تک ڈھولکی بجتی تھی اور گیت گائے جاتے تھے۔ بے چاری لڑکی ایک کونے میں بیٹھی رہتی تھی۔ گو اس نے اپنے منگیتر کو نہیں دیکھا تھا مگر گیت اس کے اطمینان کا باعث بنتے ہوں گے۔

آخری دنوں میں کئی رسمیں ہوتی تھیں : گانا' شانتی پتھ اور مائیوں اور ان کے بعد شادی۔ ساوتری کو بڑے سادہ کپڑے پہنائے گئے تھے اور اسے ایک کمبل میں لپیٹ کر ہنگامے سے دور ایک کمرے میں اکیلے بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کی جھولی میں گڑ اور نمکین روٹیاں ڈال دی گئیں۔ اس کی کمر میں ماؤلی یعنی متبرک تاگہ باندھ دیا گیا۔ اسے ہدایت کی گئی کہ وہ ماؤلی کو اپنی کمر میں کس کر باندھ لے کیونکہ اس کا شوہر ہی اسے کھولے گا۔ لڑکیاں ہر وقت اس کے پاس موجود رہتی تھیں۔ انہوں نے ساوتری کے ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگائی اور سب لڑکیوں نے خود بھی مہندی لگائی۔ انہوں نے ساوتری کے کپڑوں میں سوراخ کر دیئے۔ یہ آخری دو دن مائیوں یا مایاں کہلاتے ہیں۔

دوسرے دن علی الصبح ستاروں کے ماند پڑنے سے پہلے عورتوں کے صحن میں مرد ویدی بنانے کے لئے آ گئے۔ ویدی پتوں اور پھولوں کا ایک شامیانہ سا ہوتی ہے جس میں شادی

کی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ کیلے کے چار بڑے بڑے تنے اور بہت سے ہرے پتے لائے گئے۔ کیلے کے تنوں سے چار ستون اور پتوں اور ٹہنیوں سے ان ستونوں پر چھت ڈال دی گئی۔ دو ٹوکریاں بالکل ویسی ہی جیسی سبزی فروش استعمال کرتے ہیں' الٹی رکھی دی گئیں۔ شادی کے وقت دولہا دلہن کو انہی پر بیٹھنا تھا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے ویدی تیار ہو جانی چاہئے۔ عورتیں اور بچے سارا دن ویدی کو پھلوں اور پھولوں کی مالاوں سے سجاتے رہے۔ اس پر سندھو چھڑکا گیا اور ناریل لٹکائے گئے۔

سورج نکلنے کے بعد شانتی پتھ کی رسم ادا کی گئی۔ شانتی پتھ سے مراد امن کا راستہ ہے ساوتری کمرے سے باہر آئی اور ویدی میں بٹھا دی گئی۔ ابھی تک اس نے پرانے کپڑے ہی پہنے ہوئے تھے۔ کوڑیوں اور گری کے مالایں اس کے کلائیوں پر باندھی گئیں۔ اس کا ماموں اور ممانی چوڑا لے کر آئے تھے۔ یہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا سرخ رنگ کا چوڑا تھا جو کلائی سے لے کر اس کی کہنی تک پہنچتا تھا۔ ساوتری کو ایک سال تک یہ چوڑا پہنے رہنا تھا تاکہ وہ جہاں بھی جائے سب کو معلوم ہو جائے کہ نئی دلہن ہے۔ ایک سال بعد چوڑا پوری رسمیں ادا کر کے اتارا جا سکتا ہے۔ اس دوران اگر شوہر کی وفات ہو جائے تو ساوتری کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے اس کو توڑنا ہو گا۔ ساوتری پر تیل سے مالش کی گئی اور ایک چھوہارا اس کے منہ میں ڈال دیا گیا۔ اس رسم کے بعد ساوتری اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پچھلی رات سے گھر میں ہر شخص نے برت رکھا ہوا تھا۔ ساوتری اور اس کے والدین کے سوائے سب نے برت توڑا۔ ساوتری اور اس کے والدین شادی ہونے تک کچھ نہیں کھا سکتے تھے۔

ساوتری نے اپنا چوڑا کبھی نہیں اتارا۔

شام ہونے پر دلہن کو شادی کے لئے تیار کیا گیا۔ ساوتری دو دن سے نہ نہائی تھی اور نہ ہی اس نے کپڑے بدلے تھے۔ چنانچہ ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کا انتخاب کیا گیا کہ وہ پنڈت کے ساتھ کنویں پر جائیں' وہاں پوجا کریں اور کنویں سے ایک گھڑا پانی لائیں۔ اس متبرک پانی سے ساوتری کو نہلایا گیا۔ اس کے بعد عورتوں نے ساوتری کو بنانا سنوارنا اور کپڑے پہنانا شروع کر دیا۔ اس کو صندل کے تیل کا ٹیکہ لگایا گیا۔ اس کے ہاتھوں پاؤں کو تو مہندی پہلے ہی لگ چکی تھی اب اس کے ہونٹوں پر دنداسہ اور آنکھوں میں کاجل لگایا گیا۔ اسے سرخ رنگ کے کپڑے پہنائے گئے جو قیمتی بھی تھے اور خوبصورت بھی۔ پنجاب میں سرخ رنگ دلہنوں سے مخصوص ہے۔ سر سے پاؤں تک اس کو زیور پہنائے گئے۔ اس

کے ہر عضو کے لئے ایک مخصوص زیور تھا۔ سر پر چونک تھا جس نے اس کے دوپٹے کو بڑی خوبصورتی سے اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سر کے لئے دو اور چھوٹے زیور تھے جنہیں پھول کہتے ہیں اور سر کے دونوں طرف پہنے جاتے ہیں۔ ان پر بڑا نازک کام کیا ہوا تھا اور ہر ایک پر ایک نیلا پتھر جڑا ہوا تھا۔ مانگ کے دونوں طرف دو چوڑے چوڑے ہموار زیور تھے۔ انہیں تویتڑیاں کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنگروں کی قطاریں تھیں جنہیں سونے کی زنجیروں سے باندھ کر مانگ کے اوپر سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک اور سنہری زنجیر سے سنگھار پٹی ماتھے پر الٹے ہلال کی شکل میں لٹکائی گئی تھی۔ اس کے کانوں میں بھاری بالیاں تھیں۔ ان کی شکل بھی الٹے پیالوں کی تھی۔ یہ جھمکے تھے۔ ساوتری کی ناک میں لونگ' گلے میں گلوبند اور اشرفیوں کا ہار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں' ہر انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ ہر انگوٹھی کو ایک سونے کی نازک زنجیر کے ساتھ کلائی میں پہنی ہوئی بریسلیٹ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ اس کے بازو پر سرخ رنگ کا چوڑا اور کلائیوں پر سنہری چوڑیاں اور بریسلیٹ تھیں۔ ایک بازو پر اس نے سونے کا بھاری کڑا پہنا ہوا تھا جس کے دونوں طرف چیتے کے سر بنے ہوئے تھے۔ ٹخنوں کے اوپر اس نے چوڑی پونہچیاں پہن رکھی تھیں اور پاؤں کی انگلیوں پر اس نے چھلے پہنے ہوئے تھے جن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھنگرو تھے' جب وہ چلتی تھی تو یہ بجتے تھے۔ اسے مخمل کی شلوار قمیض پہنائی گئی تھی۔ قمیض کے گلے' آستینوں کے کفوں اور دامن پر بھاری سنہری کام تھا۔ اسے باغ کی قسم کی سرخ پھلکاری اوڑھا دی گئی تھی۔ ساوتری لمبی تھی لیکن زیور اور کپڑوں کے بوجھ سے وہ جھک سی گئی تھی۔ مایوں کی دو دنوں کی تھکاوٹ اور پھر برت کی وجہ سے کمزوری' شادی کی لمبی رسومات کے مشکل مرحلوں کی وجہ سے گھبراہٹ' رخصتی اور مستقبل کے متعلق انجانے اندیشے' چنانچہ جب وہ اٹھنے لگی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے گھٹنے جڑ گئے ہیں۔ اسے سہارا دے کر کمرے میں لایا گیا۔ عورتیں اس کی تعریف کرتی تھیں اور اس کی سہیلیاں اس پر رشک کرتی تھیں۔ دو دن پرانے کپڑوں میں بغیر نہائے دھوئے رہنے کے بعد اب وہ ایک خوبصورت پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ بوڑھی عورتیں کہتی تھیں مایوں ایک اچھی رسم ہے۔ یہ تضاد پیدا کرتی ہے اور اس سے نکھرنے کے علاوہ لڑکی کو آرام بھی مل جاتا ہے۔

پیرو شاہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ہم گجرات میں بڑے مصروف تھے۔ دعوتی کارڈوں کا انگریزی رواج گجرات پہنچ چکا تھا۔ ہم نے ایک چھوٹے مقامی پریس کو کارڈ چھاپنے کا

آرڈر دے دیا تھا۔ اس میں ہمارے گھر شادی پر آنے کی دعوت تھی۔ وہاں سے بارات کو پیرو شاہ جانا تھا جہاں شام کو سہرا بندی کے بعد دلہن کے گھر ملنی' کھانا اور آدھی رات کو شادی کی رسومات انجام دینی تھیں۔ بارات کو تین راتیں پیرو شاہ رہنا تھا اور چوتھے دن صبح کو گجرات واپس آنا تھا۔ کارڈ کے بائیں جانب نمائشی پراسرار آر ایس وی پی لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک درآمد شدہ نزاکت تھی اور فالتو بھی تھی۔ بھلا شادی کی دعوت سے کون انکار کرتا ہے۔ ہر کارڈ پر کیسر لگایا گیا اور سرخ نشان بھی لگایا گیا تاکہ اچھے شگون کا اعلان ہو جائے۔ شادی میں شامل ہونے والوں کی فہرستیں بڑی احتیاط سے تیار کی گئیں۔ باراتیوں کی تعداد کا تعین رائے بہادر کے مشورے سے کیا گیا۔ ہمارے آدمی دو سو سے اوپر تھے۔ راجا رائے بہادر کے پاس گیا جو تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے لیکن انہوں نے وضاحت کی کہ پیرو شاہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں اتنے آدمیوں کو تین راتیں ٹھہرانا مشکل کام ہے۔ آخر ایک تعداد پر اتفاق ہو گیا۔ لڑکی والوں نے اس سے زیادہ کا بندوبست کیا تھا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ آخری وقت بھی کچھ لوگ مزید شریک ہوں گے اور مہمانوں کے دوست بھی تو ساتھ ہو سکتے تھے۔

گجرات کے باہر سے آنے والوں کو ٹھہرنے کا انتظام ہمارے' رشتے داروں اور دوستوں کے ہاں کیا گیا تھا۔ قریبی رشتے دار تو کئی دن پہلے اپنے بال بچوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے اور گھر مہمانوں سے ویسے ہی بھر گیا جیسے کہ دلہن کا۔ دلہن کی طرف سے داج یعنی جہیز تیار کیا گیا تو ہماری طرف سے دلہن کے کپڑے اور زیور تیار کئے گئے۔ اسے وری کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دلہا کی بہنوں کے لئے بھی کپڑوں کے جوڑے تیار کئے گئے۔ ہم نے بھی شانتی پتھہ' گانا اور مایوں کی رسمیں ادا کیں اور تحفے بھی پیرو شاہ بھیجے جن کو رسومات کی ادائیگی کے وقت دلہن کے گھر استعمال ہونا تھا۔

شادی کے دن پیرو شاہ جانے کے لئے سب لوگ نئے کپڑوں میں ملبوس' مشتاق اور خوش باش میرے پڑدادا کے گھر کے پاس تانگوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ شہر اور قریبی جگہوں سے تمام تانگے کرائے پر لئے جا چکے تھے۔ ابھی موٹر بسوں کی سہولت میسر نہیں تھی۔ بارات کے ساتھ بینڈ باجا' آتش بازی چلانے والے اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اور گیس لیمپ اٹھانے والے لوگ بھی تھے۔ لیکن سب سے زیادہ جاذب نظر گھوڑا تھا جس پر میرے چچا نے سوار ہو کر دلہن کے گھر جانا تھا۔ گھوڑے کو پہلے ہی سجا لیا گیا تھا۔ ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ گھوڑی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ گھوڑی کو خاص طور پر نہلایا گیا تھا اور

اسے اس حد تک صاف کیا گیا تھا کہ اس کا جسم چمک رہا تھا۔ اس پر مزین جھول اور زین ڈالی گئی تھی اور متبرک تاگے اس کی ایال اور لگام میں لگائے گئے۔ جب گھوڑی گھر کے سامنے کھڑی تھی تو اسے اور زیادہ سجایا گیا۔ پھر دولہا کی بہنیں ایک بڑے برتن میں چنے جن پر چاندی کے ورق لگائے گئے تھے' لے کر آئیں اور یہ گھوڑی کو کھلائے گئے۔ یہ گھوڑی کے لئے بھی خوش بختی کا دن تھا کیونکہ اس پر آج دولہا کو بیٹھنا تھا جس کا مرتبہ ایسے موقعوں پر بادشاہ کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سواری کی اپنی اہمیت ہے۔ گھر سے روانگی سے پہلے آخری رسم باگ پھڑائی تھی یعنی جب میرے چچا کو گھوڑی کی لگام سپرد کی جاتی تھی۔ اس رسم میں دولہے کو کچھ رقم اپنی بہنوں کو دینی ہوتی ہے اور بہنیں دولہے کے لئے گیت گاتی ہیں۔ ان گیتوں کو باگ پھڑائی کے گیت کہتے ہیں۔ کیسر میں ڈوبے ہوئے گھاس کے پتوں سے دولہے پر زعفرانی رنگ چھڑکا جاتا ہے۔

دوپہر کے بعد بارات پیرو شاہ پہنچی جہاں ساوتری کے رشتے داروں سے ملاقات ہوئی۔ باراتیوں کو مقامی دھرم شالا میں لایا گیا۔ یہاں انہوں نے کھایا' پیا اور آرام کیا۔ کچھ کو تو دھرم شالے میں ہی ٹھہرنا تھا اور دوسروں کو جنج گھر میں۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جسے مقامی لوگوں نے اس مقصد کے لئے خود ہی تعمیر کروایا تھا۔ میرے چچا اور دوسرے اہم لوگوں کو رائے بہادر کے گھر پر ٹھہرایا گیا۔ بارات اور دولہا دیکھنے اور ان پر ناقدانہ رائے زنی کرنے کے لئے پورا گاؤں امڈ پڑا۔ رائے بہادر گاؤں کے بڑے آدمی تھے۔ گاؤں والے یہ دیکھنا چاہتے تھے ان کی بیٹی برابر والے خاندان میں جا رہی ہے یا نہیں۔ قدیم روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے بارات پر ایسی آواز میں تیز تیز جملے چست کئے جو صرف ہم تک ہی پہنچ سکتی تھی۔ بارات میں کچھ مسخروں نے ان کا ترکی با ترکی جواب دیا اور لوگوں کو تفریح کا موقع ہاتھ آیا۔ باراتیوں میں سے ایک نے کہا "پیرو شاہ والو' اپنی ساری لڑکیاں باہر لے آؤ کیونکہ پھر تمہاری اتنی عزت افزائی نہیں ہو گی کہ بارات گجرات سے آئے"۔ اس کا جواب یہ ملا "جاؤ جاؤ گجراتی غنڈوں کو ہم جانتے ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ رائے بہادر صاحب مان گئے۔ لڑکا تو خیر غنیمت ہے لیکن باقی باراتیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد پیرو شاہ میں قحط پڑ جائے گا"۔ اور یوں جملے بازی جاری رہی۔

کھتریوں کے جنگجو بادشاہوں کے کلاسیکی لباس میں چچا دوارکا پرشاد بڑے چست اور باوقار نظر آ رہے تھے۔ پرانا رواج تو یہ تھا کہ اگر بادشاہ کو راستے میں بارات مل جائے تو بادشاہ احتراماً اپنے گھوڑے سے اتر جاتا تھا۔ چچا کی پگڑی کے اوپر چاندی کا تاج تھا جس پر

ایک سنہری پٹی لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ گلاب' یاسمین اور گیندے کے پھولوں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سنہری اور سرخ تاروں میں پروئے ہوئے پھول ان کے چہرے پر آبشار کی سی صورت بناتے نظر آ رہے تھے۔ اسے سہرا کہتے ہیں۔ پہلے پنڈت اور دادا چچا نے اسے چھو کر نزول برکت کی دعائیں مانگیں اور پھر سارے باراتیوں نے اسے چھوا اور سب نے دولہا کو دعائیں دیں۔ چچا نے بغیر بٹنوں کا کرتا پہنا ہوا تھا جسے فیتوں کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ کرتے کے کنارے پر سنہری بارڈر تھا۔ اس نے تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں سنہری تلے دار پوٹھوہاری جوتا تھا جس کی نوکیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی کمر میں سرخ مخمل کے نیام میں تلوار لٹک رہی تھی۔ نیام پر روپہلی کام تھا۔ چچا کے پیچھے گھوڑے پر میرا بڑا بھائی بیٹھا ہوا تھا۔ رواج یہ تھا کہ دلہن کے گھر جاتے وقت اس کا شہ بالا بھی ساتھ ہو جو اکثر چھوٹا بھائی یا بھتیجا ہوتا ہے۔

بارات کے آگے آگے بینڈ تھا اور ان سے بھی آگے وہ لوگ تھے جو گیس لیمپ اٹھائے ہوئے تھے۔ چچا گھوڑے پر بیٹھے تھے اور اس طرح یہ شاندار جلوس بارود کے گولے چھوڑتا ہوا گاؤں کی اہم گلیوں سے گزرنے کے لئے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر روانہ ہوا۔ کچھ لوگ بارات پر گلاب کا عرق چھڑک رہے تھے۔ راستے میں ہم ایک جنڈی کے درخت کے پاس رکے۔ یہاں ہمارے چچا نے گھوڑے سے اتر کر اس درخت کے تنے پر اپنی تلوار سے ایک رسمی نشان بنایا۔ یہ ایک رواج تھا جس میں کھتری دولہے کی طاقت اور اس کی تلوار کی تیزی کا امتحان مقصود ہوتا تھا۔ پرانے زمانے میں تلوار کے ایک ہی وار سے درخت کاٹنا یا اس کی ایک موٹی شاخ کاٹنا ہوتا تھا۔ ہمارے ورزشی چچا کے لئے ہماری بطل پرستی خواہ کتنی ہی ہو تلوار میں ان کی مہارت بڑی تھوڑی تھی اور وہ درخت پر صرف ایک چھوٹا سا نشان لگا سکے۔ جلوس گیتوں اور شور کے درمیان چلتا رہا۔ جب ہم رائے بہادر کے مکان کے سامنے پہنچے تو دستور اور آداب کے مطابق جلوس رک گیا۔ پتوں اور پھولوں کی محرابوں کے نیچے رائے بہادر اور ان کے خاندان کے قریبی لوگ ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ رائے بہادر خود ان کے سربراہ تھے۔ انہوں نے دلہن کا باپ ہونے کے ناتے گلابی پگڑی باندھی ہوئی تھی اور ڈبل بریسٹڈ لمبے کوٹ کی طرح کا ایک سفید لمبا چوغہ پہنا ہوا تھا جس پر انگریزی فراک کوٹ کا اثر دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے سفید شلوار اور پنجابی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ اس لباس میں بڑے سج رہے تھے۔ ان کے پیچھے بڑے احترام سے ان کے بھائی' سالے' بہنوئی اور بیٹے اسی ترتیب سے کھڑے تھے۔ ہم نے بھی ویسی ہی ترتیب بنائی۔ اپنے

دادا کی غیر موجودگی میں ہم نے دادا چچا کو اپنا سربراہ بنایا۔ جب دونوں جلوس آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تو دولہے کو تیل لگانے کی مختصر تقریب ہوئی۔ اس کے بعد ملنی شروع ہوئی۔ یہ دونوں خاندانوں کا رسمی تعارف تھا۔

دلہن کی طرف سے رائے بہادر آگے آئے اور ہماری طرف سے دادا چچا آگے بڑھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ رائے بہادر نے دادا چچا کے گلے میں پھولوں کا ایک ہار ڈالا اور اس کے بعد اپنی جیب سے زعفران لگا ہوا ایک لفافہ نکالا جس میں کچھ روپے تھے۔ اس لفافے کو میرے دادا چچا کے سر پر دو دفعہ وار کر انہیں پیش کر دیا۔ اس کے بعد رائے بہادر کے بھائی عمر میں اپنی بزرگی اعتبار سے آئے اور ہمارے والد اور چچاؤں سے ملاقات کی۔ ایک پیشگی معاہدے کے تحت چند منتخب لوگ ملنی کی رسم میں شریک ہوئے اور اپنی اہمیت کے تناسب سے انہیں روپے بھی ملے۔ اس وقت جب طرفین اپنی اپنی جگہ آمنے سامنے کھڑے تھے اور ہمارے چچا ابھی گھوڑے پر ہی تھے تو ایک سہرا پڑھا گیا۔ خاندان کا ایک دوست جسے اپنے آپ پر شاعر ہونے کا گمان تھا' چچا کے دولہا بننے کی شان میں ایک نظم لکھ کر لایا تھا۔ اسے سہرا کہتے ہیں۔ اس میں چچا کی تعریف' اس کے ساتھیوں کی طرف سے تہنیت اور ہر شخص کی طرف سے نیک تمنائیں اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے دعائیں تھیں۔ نظم سنہری حروف میں لکھی گئی تھی اور اس کے ارد گرد شاندار ایرانی حاشیہ تھا۔ یہ نظم چچا کو پیش کر دی گئی۔

ملنی کے بعد چچا گھوڑی سے اترے۔ گھوڑی پوری شان سے وہاں سے رخصت ہوئی۔ ساوتری جسے عورتیں سہارا دے کر لا رہی تھیں' سر جھکائے ہوئے' چہرے پر گھونگھٹ ڈالے آگے آئی اور دولہا کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دی۔ عورتیں اسے پھر اندر لے گئیں۔ اس کے بعد دولہے کو اندر بلایا گیا۔ عورتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہاں بجھارتوں کی رسم ہوئی جس سے دولہا کی ذہانت اور حاضر جوابی کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔ وہیں ان سے چھیڑ خانی بھی ہوئی۔ ساس' سالیوں اور دوسری خواتین نے اس سے سوال پوچھنے شروع کئے۔ ان کے جواب چچا کو شعروں میں دینے تھے۔ عموماً ایسے سوال جواب دولہے کو عورتیں پہلے سے ہی رٹا دیتی تھیں۔ کچھ سوال تو بڑے شوخ ہوتے تھے اور ان کے برجستہ جوابوں پر لڑکیاں ہنستی اور قہقہے لگاتی تھیں۔ ایسے دولہے بڑے ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ دلہن کو جلدی جلدی خبریں پہنچائی جاتی تھیں کہ دولہا کیسا جا رہا ہے۔ لڑکیاں دوڑ دوڑ کر دلہن کے پاس جاتی تھیں اور اسے مبالغہ آمیز باتیں بتاتی تھیں کہ وہ کیسا ہے'

کتنا ذہین ہے اور کتنا حاضر جواب ہے وغیرہ۔ اس سے فرصت ہوئی تو دولہا کے ہاتھ پر عورتوں نے کچھ پیسے رکھے اور اسے باہر لے آئیں۔

صحن میں بارات کھانا کھا رہی تھی۔ باراتی دو قطاروں میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے دھات کی تھالیاں اور پیالے رکھے تھے۔ کھانا پیشہ ور پکانے والوں یعنی جھیوروں نے پکایا تھا لیکن انہیں کھانا پیش کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ ان دنوں نوکروں کے ذریعے کھانا کھلانا توہین سمجھی جاتی تھی۔ خاندان اور برادری کے افراد خود کھانا کھلاتے تھے۔ لڑکی والے باراتیوں کے ساتھ نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ ہمیشہ باراتیوں کے بعد کھاتے تھے۔ پہلی یا دوسری دوپہر کو مٹھائی پیش کرنے کا رواج تھا۔ اسے کھرلی کہتے تھے۔ مہمانوں کے سامنے سفید چادریں بچھا دی جاتی تھیں اس کے ایک سرے سے دوسرے تک اس پر مٹھائیاں ڈھیر کر دی جاتی تھیں۔ جتنی مٹھائی کوئی کھا سکتا تھا یہ اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ ہر مہمان کو ایک رنگین ریشمی رومال دیا جاتا تھا کہ جتنی مٹھائی وہ کھا سکتا ہے کھا لے اور باقی حسب خواہش رومال میں باندھ کر لے جائے۔ کھرلی بڑی مہنگی رسم تھی اور بہت کم لوگ اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ یہاں اس نے ایک سنسنی پیدا کر دی جسے لوگوں نے برسوں تک یاد رکھا۔

رات کے کھانے کے بعد اکثر مہمان چلے گئے۔ شادی کی رسومات کی تیاریاں شروع ہو گئیں جنہیں آدھی رات تک ادا ہوتے رہنا تھا۔ پنڈت ایک تھالی میں گھی میں نچڑی ایسی چیزیں لایا جو جلنے پر خوشبو دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ گنگا جل' پھولے ہوئے چاول' گندم کا آٹا' شہد اور مقدس تاگہ بھی وہ لے آیا تھا۔ پنڈت ہون کنڈ کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہ لوہے کی ایک انگیٹھی نما برتن تھا جس میں قربانی کی آگ جل رہی تھی۔ آگ کے چاروں کونوں پر اس نے پھل اور جلانے والی خوشبوؤں کو ڈھیریوں کی صورت میں ترتیب دے دیا۔ وقت اب قریب آ رہا تھا اور قریبی رشتے دار فرش پر بچھی دریوں پر بیٹھ گئے۔ پنڈت آگ کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے والی جگہ پر دلہن اور دولہا کو بٹھایا گیا۔ سرخ پھلکاری میں لپٹی ہوئی اور سرخ گھونگھٹ کے پیچھے ساوتری مشکل سے ہی نظر آ رہی تھی۔

جب ساوتری کا ماموں رواج کے مطابق سہارا دے کر محبت سے اسے منڈپ میں لا رہا تھا تو حیا' تھکن اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ قربانی کا بکرا لگتی تھی۔ ہمارے چچا بھی وہاں آئے اور ان میں بھی خود اعتمادی کی کمی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں الٹی ٹوکریوں پر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ساوتری دولہا کی بائیں جانب تھی۔ اس کی پھلکاری کا ایک کونا

دولہا کی تلوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ دونوں کی قسمت کا علامتی بندھن تھا۔ دلہن کی عزت کی علامت اس کے سر کی چادر تھی اور اس کی حفاظت کی علامت دولہا کی تلوار تھی۔

ساوتری نے ابھی تک دولہے کو نہیں دیکھا تھا اور وہ جاننے کے لئے شاید پریشان ہو گی کہ وہ کیسا ہے۔ لیکن اس میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ صرف پاجامے میں لپٹے ہوئے دولہے کے گھٹنے اور پنڈلیاں ہی دیکھ سکتی تھی۔ وہ مضبوط نظر آ رہی تھیں اور انہیں دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ لمبا ہے۔ لیکن کیا وہ خوبصورت بھی ہے؟ کیا وہ بھی اس کے والد کی طرح اچھا ثابت ہو گا جو آج بھی اس کی ماں کو رانی کہہ کر مخاطب کرتا ہے؟ پہلے ہی اس کا بندھن اس سے بندھ چکا ہے اور وہ اب اسی کی ہے۔ کئی سال سامنے ہیں۔ شاید یہ خوشی کے سال ہوں کیونکہ اکثر شادی شدہ جوڑے خوش ہیں۔ کیا اس کے بہت سے بچے ہوں گے؟ وہ اپنے خیالات میں کچھ زیادہ ہی بیباک ہو گئی اور یہ سوچ کر وہ خود ہی شرما گئی اور اپنے آپ کو مجرم خیال کرنے لگی۔ اپنے خیالات کی دنیا سے وہ اس وقت باہر آئی جب پنڈت نے پہلا منتر ختم کیا اور "اوم سواہا" کے الفاظ لمبے لحن میں ادا کئے۔ ہم سب نے مٹھی بھر خوشبودار چیزیں اٹھا کر آگ میں ڈالیں جن کے ساتھ آگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔

پنڈت منتر پڑھتا رہا اور آگ ہر منتر کے اختتام پر بھڑکتی رہی۔ یہ رسم جو کئی گھنٹے چلی تین حصوں میں تھی: دولہا اور دلہن کی اگنی پوجا' ان کے عہد و پیمان اور اس ملاپ کی علامتی رسومات۔ عہد و پیمان کچھ اس طرح تھے۔

ساوتری کا والد دولہا کو مخاطب کر کے کہتا ہے: "میں اپنی بیٹی کو تمہیں تحفے کے طور پر دیتا ہوں۔ میں نے بڑی محبت اور شفقت سے اسے پالا پوسا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔

چچا جواب دیتے: "میں اسے قبول کرتا ہوں۔ یہ میرے جسم کا آدھا حصہ ہے میں اس کی حفاظت کروں گا"

ساوتری اپنے دولہا کو مخاطب کر کے کہتی ہے: "میں اپنا جسم' اپنا ذہن اور جو کچھ بھی میرا ہے' تمہیں سونپتی ہوں۔ میں تمہاری خدمت کروں گی۔ اب تم ہی میرے مالک ہو۔ تم ہی میرا سب کچھ ہو۔ میں کسی دوسرے مرد کی طرف کبھی بھی نہیں دیکھوں گی۔ تمہارے سوا تمام مرد میرے باپ' بھائی اور بیٹے ہیں۔"

ان عہد و پیمان کے بعد کئی گھنٹوں بے حرکت اور دوسروں کی نظروں کا مرکز بنے رہنے کے احساس کی تھکن اور اکڑے ہوئے جسم کے ساتھ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک

دوسرے کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے' میاں بیوی بن کر وہ اٹھے اور انہوں نے گھڑی کی حرکت کے مخالف سمت میں آگ کے دو چکرے لگائے۔ چچا آگے تھے اور ساوتری پیچھے۔ اس کے بعد انہوں نے دو چکر اور لگائے۔ اس دفعہ ساوتری آگے تھی اور چچا پیچھے۔ اس رسم نے ان کی برابری مسلم کر دی۔ دونوں نے آگ کے گرد چکر لگا کر ایک دوسرے کی قیادت کی۔ اس کے بعد وہ زندگی کے علامتی سفر پر روانہ ہوئے جو سات قدموں کی یاترا تھی: پہلا قدم صحت کے لئے' دوسرا خوشحالی کے لئے' تیسرا بچوں کے لئے وعلے ھذالقیاس۔

صبح ہو رہی تھی جب یہ ویدک شادی اختتام کو پہنچی۔ پر تکلف کھانے کے بعد کچھ گھنٹے آرام کر کے باراتی بھی پہنچ گئے تھے۔ رسم کے اختتام پر ساوتری کے بھائی نے اسے بھنے ہوئے چاول دیئے جو ساوتری نے اپنے شوہر کو دے دیئے جس نے ان کو آگ میں ڈال دیا۔ اب صرف دو پنڈتوں کا کام رہ گیا تھا کہ وہ شادی کی شہادت زبانی دیں۔ ہر پروہت نے اپنے اپنے خاندان والوں کا شجرہ سنایا: دوارکا پرشاد ولد مایا داس والد ساہو مل ـــــ۔

دوارکا پرشاد اور ساوتری جو ابھی تک اجنبی تھے پتی پتنی ہو گئے۔ ان کی شادی ویدک رسومات کے تحت ہوئی اور کوئی تحریری دستاویز تیار نہیں ہوئی۔ وہ پھر ان ٹوکریوں پر بیٹھ گئے اور لوگوں نے ان پر پھول برسائے۔ ہر شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور قریب جا کر ان دونوں کو اشیرواد دی۔ وہ دونوں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ جب وہ فارغ ہو کر اٹھے تو پھولوں کی پتیاں پورے فرش پر بکھر گئیں۔ ساوتری اندر چلی گئی اور چچا ہمارے پاس وہاں آ گئے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ اب یہ دونوں میاں بیوی ہو کر بھی اس وقت تک اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے جب تک ساوتری گجرات میں ہمارے گھر نہ پہنچ جائے۔ رسومات کا تھکا دینے والا یہ معرکہ ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچا تھا۔ ساوتری کے لئے مشکل ترین مرحلہ یعنی اپنے آبائی گھر کو خیرباد کہنا' ابھی باقی تھا۔

جب مہمان چلے گئے تو ساوتری کے والدین نے جو پورے ایک دن سے برت رکھے ہوئے تھے' اپنا برت توڑا۔ کنیا دان ختم ہونے کے بعد لڑکی کے باپ کو پینے کے لئے دودھ دیا گیا۔ دوسروں نے ان کو مبارک باد دی کہ انہوں نے اپنا فرض بڑے احسن طریقے سے ادا کر دیا۔ جو کچھ اس کے والد نے اس کے لئے کیا تھا' اس کے لئے بیٹی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

سب: باپ دودھ کا پیالہ پیتا ہے اور بھائی گنگا اشنان کرتا ہے۔

بیٹی: دھن واد بابا۔ تم نے اپنی کمائی سے میرے اوپر بہت خرچ کیا ہے۔
دھن واد اماں جسے نے مجھے جنم دیا۔

آخری دن ساوتری کے جہیز کی نمائش ہوئی۔ صحن میں چارپائیوں پر دریاں بچھا کر ان پر کپڑے، زیور، بستر، برتن اور نقد رقم رکھ دی گئی۔ اس کے نئے گھر کے لئے فرنیچر میں ایک بڑا پلنگ، ایک چھوٹی کرسی اور کچھ جدید قسم کی چیزیں تھیں۔ جہیز میں پھلکاریاں بھی تھیں جو ماؤں سے بیٹیوں کو منتقل ہوتی تھیں، اور وراثت میں ملے ہوئے کچھ کپڑے تھے۔ لیکن یہ محض علامتیں بن گئی تھیں، انہیں کوئی بھی نہیں پہنتا تھا۔ دلہن کی سہیلیاں، رشتے دار اور تقریباً آدھا پیرو شاہ ساوتری کا جہیز دیکھنے کے لئے آیا۔ بڑی عورتوں نے ہر ایک چیز کو بڑے ناقدانہ انداز میں دیکھا اور اپنے اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیا۔ ساوتری اور اس کے شوہر کے کپڑے کے جوڑوں کی تعداد، ان کا معیار اور قیمت، زیور پر کام کی تفصیلات ہر زیور کا وزن اور قیمت وغیرہ۔ ان پر وہ بعد میں گفتگو کریں گی اور دوسری لڑکیوں کے جہیزوں سے اس کا موازنہ بھی کریں گی۔ اہم چیزیں سونا اور برتن تھے۔

جب سب لوگ چل پھر کر جہیز دیکھ رہے تھے ساوتری کے والد اور والدہ بڑی سادگی اور انکسار سے تعریف کرنے والوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے "یہ تو کچھ بھی نہیں۔" ہمارے دادا چچا نے بڑے مناسب الفاظ میں رائے بہادر کا شکریہ ادا کیا اور کہا "آپ نے اتنا کچھ دے دیا ہے، ہم یہ سب کیسے لے جا سکتے ہیں۔" ساوتری کی ماں نے انہیں کچھ رقم داج دکھائی کے طور پر دی۔ عورتوں نے گانا گایا جس میں دولہا کے باپ کی طرف سے شکریئے کا اظہار تھا۔

"آپ نے ہمارا گھر اندر اور باہر، آگے اور پیچھے بھر دیا ہے اور خوبصورت بیٹی جو تم نے ہمیں دی ہے وہ ان کا زیور ہو گی"

اسی دن ایک جلوس ہماری طرف سے وری لے کر آیا جس میں ساوتری اور اس کے دولہا کے لئے زیور اور کپڑوں پر مشتمل تحفے تھے۔ وری گھر کے اندر چلی گئی۔ عورتوں نے اس کا بھی بغور معائنہ کیا۔ وری میں سے ساوتری کے لئے زیور اور کپڑوں کا انتخاب کیا گیا جو وہ پہن کر اپنے گھر سے اپنے سسرال کو روانہ ہو گی۔ اس کے بعد ہمارے ایک چچا نے سب چیزوں یعنی جہیز اور وری کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ تمام چیزوں کی ایک فہرست بنی اور پھر انہیں بند کر کے صبح روانگی کے لئے تیار کر دیا گیا۔ دس بجے صبح روانگی کا وقت طے پایا۔
جہیز بند کر کے روانہ کر دینا ساوتری اور اس کے والدین کے لئے پیغام تھا کہ رخصتی کا

وقت آن پہنچا ہے۔ کئی دنوں سے اس کے والد اور والدہ وقتی مسائل کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہ سکے تھے۔ اب شادی ختم ہو چکی تھی۔ جہیز جس کے لئے انہوں نے مہینوں کام کیا تھا، بند ہو کر جا چکا تھا۔ کل ساوتری بھی چلی جائے گی اور ان کے مہمان بھی چلے جائیں گے۔ موسیقی، شور، ہنگاموں، خوشیوں اور لوگوں سے بھرا ہوا گھر اچانک خاموش ہو جائے گا۔ کچھ دنوں سے رائے بہادر کی صحت کچھ اچھی نہ تھی لیکن گھر کے ہنگامے نے انہیں معروف اور سرگرم رکھا تھا۔ لیکن ان تمام چیزوں کے ختم ہو جانے پر وہ تھکے تھکے اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ بچوں کے بغیر زندگی خالی خالی محسوس ہو گی۔ ان کی آخری اولاد ساوتری تھی اور وہی ان کی منظور نظر بھی تھی۔

اس رات بارات نے اپنی عمومی زندہ دلی کے بغیر جلدی کھانا کھا لیا۔ اپنے کمرے میں رات کو اتنے دنوں کے بعد پہلی دفعہ جلدی آرام کرتے ہوئے ساوتری کے والد اور والدہ نے ایک دوسرے کو دلاسہ دینے کے لئے کہا ہو گا کہ انہیں تسلی ہے کہ تمام کام بخیر و خوبی ہو گیا ہے اور قرض بڑے احسن طریقے سے اتر گیا ہے۔ صبح رخصتی کے خیال سے ان کی زندگی انہیں بالکل خالی لگنے لگے گی۔ ساوتری کی ماں تمام ماؤں کی طرح اس موقعے پر بھی ہمت سے کام لیتے ہوئے ساوتری کے مستقبل کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ دوارکا پرشاد اچھا لڑکا ہے، خوبصورت ہے، جوان ہے اور وہ ہماری لڑکی کا بہت خیال رکھے گا۔ اس کے بچے ہوں گے۔ پھر ساوتری زیادہ دور بھی تو نہیں اور اکثر ہمیں ملنے آیا کرے گی۔ گھر میں پھر بچوں کی ہنسی سنائی دے گی۔ ہم خود بھی ساوتری کو ملنے گجرات جایا کریں گے۔ ان خیالات سے اپنی ہمت بندھاتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو کچی پکی نیند کے حوالے کر دیا۔

ادھر ساوتری اپنے بستر پر گٹھڑی بن کر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کمرے میں کئی دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ وہ سب تھکی ہوئی تھیں اور جلدی ہی سو گئیں۔ ساوتری بڑے سادہ ماحول میں بڑی ہوئی تھی۔ اس کی عمر گو اس وقت اٹھارہ سال تھی مگر زندگی کے بارے میں وہ ایک بچے سے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ کئی برسوں سے گھر کا اکلوتا بچہ ہونے کی وجہ سے وہ ماں باپ کے بہت قریب تھی۔ وہ باقی لڑکیوں کے ساتھ مل کر کھیلتی رہی تھی مگر جب تک وہ دو عورتیں گجرات سے نہ آئیں اسے شعور نہیں تھا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ اسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کے لئے آ رہی ہیں۔ اس وقت اس کی ماں نے بتایا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے اور گو انہیں اس بات سے بڑا دکھ ہو گا لیکن اب وہ زیادہ دیر ان کے ساتھ نہیں رہ سکے گی۔

اور اب وہ ایک اجنبی کی بیوی تھی۔ ایسا اجنبی جس کی شکل بھی اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔ کل صبح یہ گھر چھوڑ کر وہ چلی جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھی ایک مہمان کے طور پر یہاں آیا کرے گی۔

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ وہ اداس بھی تھی اور متجسس بھی۔ جوں جوں رات گھٹتی گئی اور اپنے گھر سے رخصت ہونے کا لمحہ قریب آتا گیا اس کی افسردگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ اگلے ہفتے وہ اپنے شوہر کے ساتھ واپس آئے گی اور اسے اپنے والدین اور سہیلیوں سے مل کر بڑی خوشی ہو گی۔ بطور ایک شادی شدہ خاتون کے اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور لوگ اسے تعجب اور تحسین کی نظروں سے دیکھیں گے۔ لیکن جلد ہی اس پر پھر اداسی اور خوف طاری ہو گئے۔

گھر جلد ہی جاگ اٹھا تھا۔ پچھلی رات کی اداسی شادی کے سب سے بڑے مرحلے یعنی دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر روانہ کرنے کی ہل چل سے دب گئی تھی۔ دوست اور پڑوسی دلہن کو جاتے دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ گاؤں کی دائی بھی جو ساوتری کو اس دنیا میں لائی تھی، موجود تھی۔ اسے دلہن کے ساتھ جانا تھا۔ ساوتری کو اس بامروت رواج سے کچھ ڈھارس بندھی۔ اگلے ہفتے واپسی تک دائی اس کے پاس رہے گی۔ "میری بچی ڈرو نہیں میں ہر وقت تمہارے پاس رہوں گی"۔ ان الفاظ سے اس نے ساوتری کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔ "میں نے تمہیں جنایا ہے اور میں ہی تمہیں نئی زندگی میں داخل کروں گی"۔

کہار ڈولی لے کر آ پہنچے تھے۔ ڈولی سرخ کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کا بارڈر سفید تھا۔ ڈولی کو صدر دروازے کے قریب ہی رکھ دیا گیا۔ ساوتری گھر کے اندر اپنے والدین اور دوسرے رشتے داروں سے گھری ہوئی الوداعی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ ان سب نے اسے دعائیں دیں اور اس کی ماں اور باپ نے اسے آخری نصیحت کی "بیٹا" اب تم اپنے نئے گھر چلی جاؤ گی۔ تم اگرچہ ہمیں بھولو گی تو نہیں لیکن تمہیں سب سے پہلے اپنے شوہر اور اپنے نئے گھر کا خیال رکھنا ہو گا۔ تمہیں اپنے آپ کو ایک فرض شناس بیوی ثابت کرنا ہے"۔ یہ رائے بہادر کے آخری الفاظ تھے۔ اس کی ماں نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اسے وہ ہرگز وہاں سے ہٹانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کچھ روپے ساوتری کی جھولی میں ڈالے اور پھر بہنوں، مامیوں اور دوسرے رشتے داروں نے ایک ایک کر کے اسے گلے لگایا اور ہر ایک نے اسے کچھ پیسے [illegible] ہے۔ بالاخر اس کے ماموں نے اسے اپنے پہلو میں لے لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدمو[illegible]ے وہ ڈولی تک پہنچی۔ اس سے پیشتر کہ وہ ڈولی کا پردہ گرے

اس کی ماں اور باقی عورتیں اسے آخری دفعہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھیں۔ ساوتری ایسے روئی جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کی ماں بھی ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی اور عورتوں نے ڈولی کا الوداعی گانا شروع کیا:

بابا، تم نے اپنی بیٹی کو ڈولی میں بٹھا دیا ہے
لوگ تمہیں دعائیں دیتے ہیں
بابا، خدا تمہیں سدا خوش رکھے
تم نے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا ہے
اماں، خدا تمہیں برکت دے، تم نے مجھے جنم دیا
ڈولی میں بٹھا کر مجھے اب وہ لے جا رہے ہیں۔

ہم دوسری طرف کھڑے ساوتری کے والدین کو دیکھ رہے تھے۔ تمام آنکھیں حتیٰ کہ ہماری آنکھیں بھی نم تھیں۔ دادا چچا تنے ہوئے اپنی قابل احترام داڑھی کے ساتھ آگے بڑھے اور مختصر الوداعی کلمات کہے۔ "رائے بہادر صاحب آپ کو اداس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ اداسی کا موقعہ نہیں۔ آپ نے اپنا فرض بڑے احسن طریقے سے ادا کر دیا ہے۔ اس بات پر آپ کو فخر کرنا چاہئے۔ ہم آپ کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جا کر بڑے خوش ہیں۔ وہ ہماری گھر کی روشنی ہو گی۔ آپ کا نقصان ہمارا فائیدہ ہے"۔ ان الفاظ پر رائے بہادر کا سر شکر سے جھک گیا اور دونوں بغلگیر ہوئے۔

"چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" دادا چچا نے کہا۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی اور جلوس نے چلنا شروع کر دیا۔ ساوتری کے لوگ بھی ڈولی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ عورتیں گانا گا رہی تھیں لیکن مرد خاموش تھے۔ وہ گلی کے اختتام پر رک گئے اور ہم گجرات کی طرف چل دیئے۔

ہم دوپہر کے وقت گجرات پہنچ گئے لیکن ڈولی اندھیرا ہونے تک یعنی جب تک وہ شام کا ستارہ نہ دیکھ لے، گھر نہیں جا سکتی تھی۔ شام کے وقت گجرات کی گلیوں سے ہوتی ہوئی ڈولی ہمارے گھر کے سامنے پہنچی۔ اسے تھڑے کے سامنے اتارا گیا۔ ہماری گلی میں ڈولی کے استقبال کے لئے برادری والوں اور رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ ہماری دادی چچی نے ساس کی حیثیت سے ساوتری کا استقبال کیا اور اس کے سر پر پانی وار کر پیا۔ پھر دلہن کو ڈیوڑھی میں لایا گیا اور دلہن کی منہ دکھائی کی رسم ادا کی گئی۔ عورتیں آتی تھیں، ساوتری کا گھونگھٹ اٹھا کر دیکھتی تھیں، سلامی دے کر پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔ ساوتری نے بہت جھک کے دادا

چچا کے پاؤں چھوئے۔ پھر اس کے نئے گھر کے زینے پر سے اسے اوپر لایا گیا۔ اسے کھانا دیا گیا جسے اس نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اسے اس کے شب عروسی کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ محبت بھرے الفاظ سے اس کا حوصلہ بڑھانے والی دائی اس کے کمرے سے جانے والے آخری عورت تھی۔

آج کل کی پنجابی شادیاں بڑی مختلف ہیں۔ زاپچے اور راجے' گانے' بہت ساری علامتی رسمیں اور پر شور فقرے بازی جو ہماری واحد تفریح تھی' سب رخصت ہو چکے ہیں۔ پھلکاریاں اور بھاری کلاسیکی زیور بھی رخصت ہو چکے ہیں۔ انجانے مستقبل کے اندیشے اور الوداعی اداسی بھی رخصت ہو چکی ہے۔

نواں باب

اس زمانے میں زچگی' خصوصاً پہلی زچگی بڑی خطرناک سمجھی جاتی تھی۔ زچگی کو شوہر کے گھر لڑکی کی دوسری واپسی خیال کیا جاتا تھا اور اسے خدا کا عطیہ تسلیم کیا جاتا تھا بشرطیکہ سب کچھ ٹھیک ہو اور اکثر سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ بچہ ہمیشہ گھر پر ہی پیدا ہوتا تھا اور گھرانی خاندان کی دائی کرتی تھی۔ دائیاں عموماً بوڑھی مسلمان عورتیں ہوتی تھیں۔ بطور دائی یا مڈ وائف کے ان کی بڑی شہرت ہوتی تھی۔ راجا کی طرح ہر خاندان کی اپنی دایاں ہوتی تھیں جو خاندان میں سالہا سال تک زچگیاں کراتی تھیں۔ اس احساس سے کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے ساوتری کی اس وقت بڑی ہمت بندھی جب میری ماں نے اسے بتایا کہ اس موقعے پر اس کی اپنی دائی کا بلایا جائے گا۔ راجا کو ایک دفعہ پھر بلایا گیا اور اسے پیرو شاہ بھیجا گیا کہ وہاں جا کر یہ خوش خبری دے آئے۔ ہمارے رشتے داروں کو ہمارے خاندانی پروہت سے اطلاع مل چکی تھی لیکن برادری والوں اور دوسروں کو راجا کے ذریعے اطلاع مل گئی تھی۔ آنے والے خوشی کے موقعے کے لئے پیرو شاہ سے کپڑوں کا نیا جوڑا اور کچھ تحائف آئے۔ ساوتری کی ماں بھی آگئی وہ بڑی خوش اور نازاں تھی اس نے ساوتری کو چند دنوں کے لئے پیرو شاہ لے جانے کے لئے کہا تاکہ وہ اپنی بیٹی کو جو امید سے تھی' سب کو دکھا سکے اور اس کے چاؤ چونچلے کر سکے۔ یہ ایک رواج تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ پہلی دفعہ حاملہ دلہن کو مانوس ماحول اور رشتہ داروں اور سہیلیوں میں رکھا جائے جو اس کا خاص خیال رکھ سکیں اور اسے مبارک باد دی جائے تاکہ اس کا ابتدائی خوف زائل ہو جائے۔

واپس گجرات آنے پر ساوتری کی زندگی بڑی پرسکون اور خوابوں سے معمور تھی۔ ہاتھی دانت کے چوڑے اور اپنے مخمل اور بروکیڈ کے عروسی جوڑے میں ملبوس وہ دوپہر میں میری والدہ کے ساتھ لوگوں کو ملنے چلی جاتی تھی تاکہ لوگ اس خوش نصیب دلہن کو دیکھ لیں جو ایک ہی مبارک سال کے اندر اپنی تکمیل کو پہنچنے والی ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتی تھی اسے مبارک باد اور دعائیں ملتی تھیں اور بہت ساری نصیحتیں بھی کہ جاتی تھیں۔ اتنی چھوٹی عمر کی دلہن بارور ہو رہی تھی۔ ساوتری کے چہرے پر دو شادمانیاں تھیں : دلہن

بنے کی شادمانی اور ماں بننے کی شادمانی۔ جسے دیوتاؤں نے دعائیں دی ہوں تمام لوگوں کو اسے دعائیں دینا چاہئے: "خدا تمہیں چاند سا بیٹا دے"۔ طوائفوں کے گلی میں سے گزرتے وقت میری ماں کسی سے بات کرنے کے لئے رکتیں تو تمام عورتیں بڑے رشک سے ساوتری کو دیکھتی تھیں۔ ضرورت سے زیادہ بھرے ہوئے جسموں کے ساتھ جن کو کبھی بچی محبت نصیب نہیں ہوئی تھی اور کبھی کبھار حاملہ ہونے کی صورت میں جس کا واحد مقصد ایک بے نام بچی کو پیدا کرنا تھا تاکہ وہ ان کے بڑھاپے کی سہارا بن سکے' وہ باحیا اور مسرور ساوتری کو اپنی مایوس آنکھوں اور بڑی اداس نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ساوتری جیسی خوشی ان کے نصیبوں میں نہیں تھی۔ پھر بھی وہ ساوتری کو دعائیں دیتی تھیں۔ میری ماں اسے آریا سماج لے کر گئیں اور گھر کو مقدس آگ کے ذریعے پاک کرنے کے لئے ہون کرایا۔ خوش نصیبی کی خاطر میری والدہ اسے مندر بھی لے کر گئی تاکہ شو اور پاربتی کا لافانی جوڑا بھی اسے خیر و برکت دے۔

ساوتری کی زچگی سے چند دن پہلے دائی بھی پہنچ گئی۔ اس نے ہر چیز کو سنبھال لیا اور بڑی کھلبلی مچائی۔ تمام تیاریوں کا اس نے معائنہ کیا اور امید ظاہر کی کہ اس کے شوہر نے ایک اچھے کھتری کی طرح اپنا فرض پوری طرح نبھایا ہو گا اور آنے والے بچے کو دلیر بنانے کے لئے اپنی بیوی کو بہادری کے قصے سنائے ہوں گے اور ساوتری نے بھکاریوں اور اپاہجوں کو نہیں دیکھا ہو گا۔ میری ماں نے تمام ہدایات سنیں اور بڑی فرض شناسی سے ان پر عمل بھی کیا۔ اس وقت انہیں اپنی دائی بھی یاد آ گئی۔

جب وقت آن پہنچا تو ہم بچوں کو ساتھ والے محلے میں والد کے ماموں کے گھر بھیج دیا گیا تاہم ہم گھر آتے جاتے رہے تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک صبح ہمیں جگا کر بتایا گیا کہ ساوتری کے ہاں رات کو لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ہم دوڑے دوڑے گھر گئے۔ ہم ابھی سیڑھیوں ہی میں تھے جب ہم نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ لڑکے کی پیدائش پر خوشیوں کے ہنگامے کی جگہ گھر پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہماری ماں نے ہمیں ایک طرف لے جا کر بتایا کہ لڑکا ٹھیک نہیں ہے اور ساوتری کو بھی بخار ہے۔ اس کے بعد ہمیں بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ہمارے ادھر ادھر منڈلانے کی کسی نے پرواہ نہیں کی۔

دن میں ساوتری کی والدہ اور والد بھی پہنچ گئے۔ راجا کو پیرو شاہ پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا کہ ساوتری کے والدین کو بڑی احتیاط سے اطلاع کر دے۔ دائی نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور

اس سے نپٹنے کی اہلیت کی کمی کا بھی اسے احساس ہو گیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ بڑے سرکاری ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔ چچا دوارکا پرشاد باہر بھاگا۔ جب وہ گلی میں سے گزرا تو پریشان پڑوسیوں نے اندازہ لگا لیا۔ چند گھنٹے بعد ڈاکٹر صرف اپنے چپڑاسی کے ساتھ نکلا' جو اس کا بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اکیلا ہی چلا گیا تو اس وقت سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

جب ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مزید کوشش بیکار ہے تو اس نے میری ماں کے کان میں خوفناک ہندو فارمولا دہرایا کہ "میرا خیال ہے کہ اب لڑکی کو فرش پر لٹا دینا چاہئے"۔ دوسروں کی مدد سے میری ماں نے ساوتری کو اٹھایا اور فرش پر لٹا دیا جس پر گائے کے گوبر اور پانی سے پوچا پھیر دیا گیا تھا۔ جس طرح ایسے موقعوں پر بے شمار نسلوں سے آریاؤں کو دھرتی ماتا کے محور کے متوازی لٹایا جاتا رہا ہے اسی طرح ساوتری کو بھی لٹا دیا گیا۔ اس کا سر شمال کی طرف تھا اور اس کے پاؤں جنوب کی جانب کیونکہ عقیدہ یہ تھا کہ سر سے روح نکل کر اپنے آبائی وطن قطب شمالی پہنچ جائے گی۔ اس کے منہ میں مقدس گنگا جل کے چند قطرے ٹپکائے گئے اور تلسی کے پودے کا جو ہر ہندو گھر میں ہوتا ہے' ایک پتہ اس کے ہونٹوں کے درمیان رکھ دیا گیا۔ زندگی آہستہ آہستہ ساوتری کے جسم کو چھوڑ رہی تھی۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کا بے جان بچہ اس کے پاس پڑا تھا۔ آٹے کا دیا جس میں پگھلا ہوا گھی اور روئی کی بتی تھی' جلا کر اس کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ اعتقاد یہ تھا کہ جب زندگی ایک جسم میں لرزنا بند کر دے گی تو وہ کسی اور بدن میں علامتی طور پر ایک چھوٹے سے شعلے کی صورت میں طلوع ہو جائے گی' روح اوپر چلی جائے گی یا شاید کسی اور جسم میں داخل ہو جائے گی اور شاید تمام گناہوں سے پاک ہو کر نروان حاصل کر لے گی اور اس کے بعد کبھی اس دنیا میں نہیں آئے گی۔ میری ماں نے سوچا کون جانے ساوتری کی روح پہلے کہاں پیدا ہوئی تھی اور کیا پتہ کہ اس روح کا آخری گھر ساوتری ہی ہو۔ کیا اس روح نے شانتی کی اپنی ابدی تلاش ختم کر دی ہے یا یہ تلاش ابھی جاری ہے؟ ساوتری کی روح کا ماضی یا مستقبل خواہ کچھ ہو' وہ رک جائے یا اپنا سفر جاری رکھے' ساوتری کے گناہوں سے پاک اور معصوم جسم میں اپنے ٹھکانے کی وجہ سے وہ اوپر ہی جائے گی۔ یہ نروان سے ایک قدم اور نزدیک ہو جائے گی۔ صدمے کے ابتدائی اثر کے تحت میری ماں کے خیالات اسی ڈھب پر دوڑتے رہے مگر وہ اپنی اس ادھیڑ بن سے اس وقت باہر نکلیں جب ساوتری کے والد اور والدہ کی پہلی سسکی ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ باہر دوڑیں تاکہ ہر قسم کا انتظام جس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی' فوراً کریں۔ باہر نکل کر انہوں نے چچا دوارکا پرشاد کو اندر

جانے کے لئے کہا اور ان کے کان کے قریب جا کر کہا "بچہ بالکل تم پر گیا تھا۔" پھر وہ ڈیوڑھی میں پہنچیں جہاں راجہ منتظر تھا۔ ماں نے اسے فوراً پنڈت کو بلانے کے لئے بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا وہ اچاریہ کو خبر کر دے کہ وہ تیار رہے۔

پنڈت آیا اور اس نے روح کے آئندہ پر امن سفر کے لئے شانتی ہتمہ کی رسم ادا کی بالکل ویسے ہی جیسے اپنی زندگی کے لئے نئے سفر کو خیریت سے طے کرنے کے لئے شادی کی صبح کو یہ رسم ادا کی گئی تھی۔ پنڈت نے کہا کہ کچھ گندم اور چاول خیرات کئے جائیں۔ ایک طشتری پر علامتی طور پر گندم اور چاول پنڈت کو دیئے گئے جنہیں پنڈت کے کہنے پر ساوتری نے چھوا۔ پھر ساوتری کو اس نے آخری دعا کے طور پر گائتری منتر پڑھنے کو کہا۔ ساوتری کے منہ سے آہستہ سے لفظ اوم نکلا اور اس کے بعد کوئی آواز نہ آئی۔ اس کی آنکھیں موند دی گئیں اور بڑی آہستگی سے اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ اس کے دونوں بازو اس کے سینے پر رکھ دیئے گئے۔ پنڈت نے کہا کہ ساوتری کی روح اس کے جسم سے نکل گئی ہے۔ اس کا کام اب ختم ہو گیا ہے اور وہ باہر چلا گیا۔ اس نے اچاریاؤں کو اندر بھیج دیا۔ اچاریہ وہ براہمن ہیں جو موت کے بعد کام سنبھالتے ہیں۔

اچاریہ کمرے میں داخل ہوا' اظہار افسوس کیا اور مرنے والی کی تعریف میں کچھ کلمات کہے۔ چونکہ ساوتری کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے کچھ رسوم ادا کرنے کے لئے میرے بڑے بھائی کا انتخاب کیا گیا۔ راجا نے اس کا سر مونڈا' اسے نہلایا گیا' اور اسے نئی ریشمی دھوتی جو ابھی تک دھلی نہیں تھی' پہنا کر تیل کے ایک دیئے کی قریب کونے میں بٹھا دیا گیا۔ دیئے میں سرسوں کا تیل تھا' اسے تمام رسومات کے ختم ہونے تک دس دن تک جلنا تھا' اس لئے اسے تیل سے بھرا رکھنا ضروری تھا۔ کھانا بھی اسے سب سے پہلے ملنا تھا اور اسے دیئے کے قریب ہی کھانا تھا۔ میرا بھائی بچہ ہی تھا اور اس کردار سے خوف زدہ تھا جو اسے ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے شہ بالا کا کردار یاد آیا جب وہ چچا دوارکا پرشاد کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر ساوتری کے گھر گیا تھا۔

خاندان کے ایک بزرگ کو تمام رشتے داروں کو موت کی اطلاع دینے کے لئے پوسٹ کارڈ لکھنے کو کہا گیا۔ پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی عبارت تھی : "فلاں وقت' فلاں دن' فلاں ماہ اور فلاں سال ساوتری سورگ باش ہو گئی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو بھی ساتھ لے گئی"۔ ہر کارڈ کا ایک کونہ پھاڑ دیا گیا تاکہ مکتوب علیہ کو پڑھنے سے پیشتر ہی پتہ چل جائے کہ موت کی خبر آئی ہے۔ قریب رہنے والے رشتہ داروں کو تار روانہ کر دیئے گئے تاکہ

جنازے کے لئے وہ بروقت پہنچ جائیں۔

جونہی ہی خبر پھیلی ہماری برادری کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ ہماری گلی سے گزرتے وقت پڑوسی بھی ساتھ ہو لئے۔ گھر کے سامنے تھڑے پر دریاں اور چٹائیاں بچھا دی گئیں تاکہ آنے والے بیٹھ سکیں۔ ہمارے بزرگ دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ہر آنے والا ہاتھ جوڑ کر کہتا "بڑا افسوس ہے' اتنا کہ بیاں نہیں ہو سکتا"۔ وہ ہاتھ پھیلا کر کہتے "خدا کی مرضی"۔ بڑی عمر کے لوگ دوارکا پرشاد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے "بیٹا صبر کرو۔ صبر کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ ہمت سے کام لو اور مردوں کی طرح برداشت کرو۔ اس سے دوسروں کی خاص طور پر مرحومہ کے ماں اور باپ کی ہمت افزائی ہو گی"۔

ایسے موقعوں پر برادری کا ایک رکن آگے بڑھ کر کہتا کہ جنازے کی رسومات کے سارے انتظام وہ کرے گا۔ دوسرے جو شادیوں اور موت پر ہاتھ بٹانے میں نمایاں تھے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر مطالبہ کرتے کہ انہیں بھی کوئی ایسا کام سونپا جائے جس کے وہ اہل سمجھے جا سکتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر برادری ایک ہو جاتی تھی۔ سوگوار خاندان سے تمام کام لے کر لوگ خود کرنا شروع کر دیتے تھے۔ بغیر کسی دقت کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے تھے۔ سوگوار خاندان کے لئے ایسے جذبات کہ آپ کی کوئی اہمیت ہے' کوئی آپ کا ہے' آپ کے لئے لوگوں کے دلوں میں مروت ہے' اور آپ کے دکھ میں کوئی شریک ہے' بڑی طمانیت کا باعث بنتے تھے۔ عورتیں اور مرد اپنے اپنے تجربے اور اہلیت کی بنا پر کام تقسیم کر کے سنبھال لیتے تھے اور ان میں سے ایک ان سب کا سربراہ بن جاتا تھا۔ کوئی تاریں دینے اور پوسٹ کارڈ ڈاک میں ڈالنے کے لئے دوڑ پڑتا تھا تو دوسرا رسومات کے لئے ضروری چیزیں گھی' ماؤلی' خوشبوئیں اور چاول اکٹھے کرنا شروع کر دیتا تھا' کوئی کفن اور ڈھانپنے کے لئے ہاتھ کا بنا ہوا سرخ' جامنی یا بیجنٹا رنگ کا کپڑا خریدنے نکل جاتا تھا تو دوسرا جلانے کے لئے صندل کی لکڑی کے گٹھے کا انتظام کرتا تھا' کوئی پھول لانے چلا جاتا تھا اور کوئی کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی' مٹکی اور رسیاں اور پیالے کا انتظام کرتا تھا۔ کفن اور مردے کو جلانے کے لئے بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ دیہاتوں میں تو ہاتھ سے کھینچی جانے والی ایک گاڑی گاؤں میں گھوم جاتی تھی اور برادری کا ہر شخص چتا کے لئے اپنے حصے کی لکڑی کا ایک لٹھا اس میں ڈال دیتا تھا۔

گھر کے اندر چار عورتوں نے ساوتری کو نہلایا۔ سر سے پاؤں تک اس کے جسم پر دہی ملا گیا۔ پھر اسے دھو ڈالا گیا۔ اس کی ماں نے کہا کہ اسے اس کا عروسی جوڑا پہنایا جائے۔

اس کے بالوں میں تیل اور ماتھے پر ٹیکا لگایا گیا۔ اس کی مانگ میں سندھور ڈالا گیا۔ اس کا چوڑا اتار لیا گیا کیونکہ اس کا جلانا بدشگونی تھی۔ ساوتری کو ایک سرخ شال میں لپیٹا گیا اور اس کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈالی گئی۔ اس کے سینے پر پھولوں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ جیسے وہ دلہن بن کر آئی تھی ویسے ہی اسے اب ڈیوڑھی میں لایا گیا۔ یہاں اسے بانس اور چٹائی سے بنے ہوئے ایک سٹریچر پر لٹا کر باندھ دیا گیا۔ جب سب تیاری ہو چکی تو جس طرح شادی پر آگے بڑھ کر سب عورتیں گھونگھٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتی تھیں ویسے ہی وہ چہرے سے کپڑا ہٹا کر اسے آج بھی دیکھ رہی تھیں۔ مرد پیچھے کھڑے خاموش سسکیاں لے رہے تھے۔ عورتوں بغیر جھجک کے اپنے دکھ کا اظہار کر رہی تھیں اور ایک مجموعی چیخ گھر کے کنویں میں سے ابھری۔ دادا چچا آگے بڑھے اور بڑے آرام سے ان عورتوں کو پیچھے ہٹایا جو ساوتری کو چوم رہی تھیں۔ انہوں نے کہا "دیر ہو رہی ہے اب چلنا چاہیے"۔ یہی الفاظ انہوں نے ساوتری کی شادی پر اس کی رخصتی کے وقت ڈولی کے پاس کھڑے ہو کر کہے تھے۔

مرد آگے بڑھے اور ارتھی اٹھا کر چلنے لگے۔ محلے سے گزرتے وقت وہ ارتھی کو نیچے کر کے چلتے رہے تاکہ محلے والے اور دوسرے جو گلی میں کھڑے انتظار کر رہے تھے، ساوتری کے آخری درشن کر لیں۔ گلی کے اختتام پر اس کا چہرہ ڈھانپ دیا گیا اور ارتھی کو کندھوں پر رکھ کر وہ تیز تیز چلنے لگے۔ ہر چند قدموں کے بعد کوئی سوگوار آگے بڑھتا اور ارتھی کو کندھا دیتا۔ ارتھی کو کندھا دینا برکت باعث ہے۔ "رام نام ستیہ ہے" کا ایک ہی سر پر ورد کرتے ہوئے، کوشا گھاس کے ایک گچھے سے پانی چھڑکتے ہوئے، ارتھی پر غریب غربا کے لئے پیسے پھینکتے ہوئے، گلیوں میں سے گزر کر ارتھی شمشان گھاٹ پہنچی۔ دروازے پر ارتھی کو نیچے کیا گیا اور اچاریہ نے پانی سے بھرا ہوا مٹی کا گھڑا توڑنے کی علامتی رسم ادا کی۔ گھڑے کو اس طرح توڑنا تھا کہ ساتھ ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ جائے۔ اس سے مراد تھی کہ اس خاندان میں موت دیر سے آئے۔ عورتوں کو واپس جانے کے لئے کہا گیا۔ راستے میں ایک کنویں پر رک کر انہوں نے اشنان کیا۔

اچاریہ نے آخری رسومات ادا کیں۔ اس میں جانے والی کے لئے ابدی امن اور پس ماندگان کے لئے خیر و عافیت کی دعائیں تھیں۔ کچھ لوگ چتا کا انتظام کرنے کے لئے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ بڑی اور بھاری لکڑیاں سب سے نیچے رکھی گئیں اور ان سے اوپر چھوٹی اور ان سے اوپر اور بھی چھوٹی۔ ان سے بھی چھوٹی لکڑیوں سے سر اور پیروں کے لئے سہارے بنائے گئے۔ چتا کے اطراف لوہے کے سریئے کھڑے کر دیئے گئے تھے تاکہ چتا کی لکڑیاں

گرنے نہ پائیں۔ جسم کو لکڑیوں پر رکھ دیا گیا اور ایسے صندل کی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ ان کے اوپر چھوٹی لکڑیاں رکھ کر پھر بڑی لکڑیاں رکھ دی گئی تھیں۔ خشک ٹہنیوں اور سرکنڈوں کا ایک تکیہ سا بنا کر اور اسے لکڑیوں میں سے گھسا کر ساوتری کے سر کے نیچے رکھ دیا گیا۔ پھر چتا پر خوشبودار بوٹیاں رکھی گئیں اور گھی چھڑکا گیا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو خاندان کے بزرگ آخری اور انتہائی اذیت ناک رسم کے لئے دوارکا پرشاد کو آگے لائے۔ انہیں اچاریہ کے پاس چھوڑ کر باقی سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ آچاریہ نے چند منتر پڑھے اور ایک لکڑی جلا کر ان کے ہاتھ میں دے دی اور خود وہاں سے ہٹ گیا۔

دوارکا پرشاد خالی آنکھوں سے چتا کو گھورتے کھڑے رہے۔ لکڑیوں کے نیچے وہ جسم بے حس و حرکت پڑا تھا جس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ دوارکا پرشاد نے اس کے سر کی بناوٹ دیکھی، اس کی چھاتیوں اور کولہوں کی قوسیں دیکھیں اور پاؤں کو دیکھا جو اوپر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک چادر کے نیچے اس کی جوانی کی نیند میں اتنا ہی بے حس و حرکت جسم دیکھا تھا جیسے کہ وہ اب تھا۔ جیسے جیسے ان کی قربت بڑھی انہوں نے اس کے متوقع جسم کو چادر کے نیچے لرزتے کئی بار دیکھا تھا لیکن اب وہ بالکل ساکن تھی۔ دوارکا پرشاد نے اپنے ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی کی حرارت محسوس کی لیکن وہ پھر بھی ساقط کھڑے رہے۔ ان کے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے۔ لکڑی ایک بہت بڑے شعلے میں بدلنے لگی پھر بھی دوارکا پرشاد میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ دادا چچا آگے بڑھے، اپنا ہاتھ ان کی کہنی کے نیچے رکھ کر انہوں نے کہا "دوارکا پرشاد، یہ کام صرف تمہیں نے کرنا ہے"۔

تکیئے والی خشک گھاس سے تھوڑا سا دھواں اٹھا اور لکڑی چٹخنے کی آواز آئی۔ پھر ایک شعلہ سا اٹھا جو سرخ رنگ کی شال کو چاٹنے لگا اور جلدی ہی آگ میں بدل گیا۔ گھی اور خوشبودار لکڑیوں کی وجہ سے شعلہ پوری چتا میں پھیل گیا۔ آگ تیزی سے جلتی رہی اور شعلے اونچے اونچے اٹھتے رہے۔ جب تند شعلوں نے تیزی پکڑ لی اور اپنے راستے میں ہر چیز کو جلانے لگے تو سوگوار پیچھے ہٹ گئے۔ "چلو اب چلیں" دادا چچا نے کہا۔

کچھ سوگوار لوگ بچے کو صرف چند میل دور دریائے چناب پر لے گئے تھے۔ سرکنڈوں اور بانس سے انہوں نے ایک سٹریچر بنایا اور اس پر پتے اور ٹہنیاں ڈال دیں۔ اس پر سرخ کپڑے میں لپٹا ہوا بچہ رکھ دیا اور پھر اس پر گیندے کے پھول ڈالے۔ یہ چھوٹی سی ارتھی پانی کے بہاؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے کی طرف تیرتی چلی گئی۔ چھوٹے اور نوزائیدہ بچوں

کو پانی میں بہا دیا جاتا ہے۔ دریا یا ندی دور ہو تو انہیں دفن کر دیا جاتا ہے۔ انہیں کبھی جلایا نہیں جاتا۔

واپس جاتے ہوئے سوگوار ایک کنویں پر نہانے کے لئے رکے۔ آخری دعائیں مانگتے وقت یہ سب لوگ اپنا رخ شہر کی جانب کئے ہوئے اچاریہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب نے تنکوں کو چنا اور اپنے اپنے کندھے سے اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے بعد سب اٹھ کھڑے ہوئے اور واپس گجرات چل دیئے۔

اپنے محلے میں پہنچ کر سب دریوں پر بیٹھ گئے اور آئندہ رسومات کا منصوبہ تیار کرنے لگے۔ چوتھے دن کی رسم کو چوتھ، دسویں دن کی رسم کو دسواں اور تیرھویں دن کی رسم کو کریا کہتے ہیں۔ ان سب کا تعین کرنے کے بعد ہمارے سب گھر والے اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "ضرور آنا"۔ جانے والے کے اتنی جلدی بعد کسی کو "اب جاؤ" کہنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ باقی لوگ بھی اٹھے، ہاتھ جوڑے، تھوڑا سا رکے اور پھر چل دیئے۔

اس دن گھر میں آگ نہیں جلی۔ ہمسائیوں اور برادری والوں نے ایک سادہ سا کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا اور رسمی الفاظ میں چند نوالے کھانے کو کہا۔ "تمہارے کھانا نہ کھانے سے جانے والی تو واپس نہیں آئے گی۔ تمہارا نقصان ناقابل تلافی ہے۔ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے۔ لیکن تمہیں جسم اور روح کا رشتہ قائم رکھنا ہے۔ اس دنیا میں موت اور زندگی تو ساتھ ساتھ چلتے ہیں"۔ ایسے تعزیتی الفاظ حوصلہ دلانے کیلئے رسمی طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔

چوتھے دن صبح سویرے ساری برادری شمشان گھاٹ پھول چننے کے لئے اکٹھی ہوئی۔ جلنے کے بعد ہڈیاں دونوں طرف سے پھولوں کی صورت میں تڑخ جاتی ہیں۔ اس لئے انہیں پھول کہتے ہیں۔ جسم کے ہر عضو کی صرف ایک ایک ہڈی اکٹھا کر کے ایک تھالی میں رکھی گئیں۔ پھر انہیں دودھ سے دھو کر مٹی کے ایک نئے برتن میں ڈال دیا گیا۔ اس کا منہ ایک سرخ رنگ کے کپڑے سے لپیٹ دیا گیا۔ اس پر ساوتری کا نام لکھ کر شمشان میں رہنے والے سادھو کے حوالے کر دیا گیا۔ تمام راکھ ایک تھیلے میں اکٹھی کر لی گئی تاکہ اسے نزدیک ترین ندی کے بہتے پانی میں ڈبو دیا جائے۔

دسویں اور کریا کی رسمیں ختم ہونے پر اچاریوں کو کپڑوں کا ایک ایک نیا جوڑا، بستر اور برتن دیئے گئے کیونکہ عقیدہ یہ تھا کہ یہ چیزیں مرنے والی کو پہنچ جاتی ہیں۔ آخری رسم کے

وقت ساوتری کے والدین نے دوارکا پرشاد کو ایک پگڑی بھیجی جس سے مراد رشتے کا قائم رہنا تھا اچاریہ نے خاندان کے لئے خیر و برکت اور شانتی کی دعا کیں۔ یہ سوگ کا اختتام تھا۔ دوسری صبح گھر کی ہر چیز دھوئی گئی یا دھوپ میں رکھی گئی اور اس کے بعد معمول کی زندگی شروع ہو گئی۔ سترھویں دن کچھ برہمنوں کو بلا کر کھانا کھلایا گیا اور کچھ پھل خیرات کئے گئے۔ ان اشیا کے بارے میں بھی یہ خیال تھا کہ مرنے والے کو پہنچ جاتی ہیں۔ اس دن گھر والے کچھ نہیں کھاتے۔

ساوتری کی آخری رسم ہردوار میں ادا کی گئیں۔ ساوتری کے پھول لے کر دوارکا پرشاد ہردوار پہنچے جہاں ہمالیہ سے نکل کر گنگا میدانوں میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں گھاٹ کی سیڑھیوں پر پانڈے کے ساتھ بیٹھ کے انہوں نے آخری رسومات ادا کیں۔ ایک کشتی کو عین منجدھار میں لے جا کر ساوتری کے پھول تیز رفتار ندی کی لہروں پر بکھیر دیئے گئے۔ اس سے چچا دوارکا پرشاد اور ساوتری کے رشتے کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی اور ساوتری محض ایک یاد بن کر رہ گئی۔ جب پہاڑوں اور دریا پر شام کی ہلکی تاریکی چھا گئی تو دوارکا پرشاد دوبارہ گھاٹ پر پہنچے۔ ڈھاک کے درخت کی موٹی چھال کی بنی ہوئی پیالہ نما کشتی کو انہوں نے گلاب اور چنبیلی کے پھولوں سے بھرا اور اس پر ننھا سا جلتا ہوا مٹی کا دیا رکھ کر اسے دریا کی لہروں پر چھوڑ دیا۔ چچا دوارکا پرشاد کی یہ کشتی اسی قسم کی دوسری کشتیوں کی طرح پانی کے بہاؤ کے ساتھ دریا پر تیرنے لگی۔ گنگا میا کی رو پہلی لہروں پر سینکڑوں کی تعداد میں لرزتے ہوئے شعلوں والی کشتیاں بذات خود زندگی کی ایک نازک سی علامت ہیں۔

خاندانی کتاب میں یہ افسوس ناک اندراج کرنے کے بعد چچا ہردوار سے واپس گھر پہنچ گئے۔

ہمارے سکول کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ ہم ساوتری کے بچے کی پیدائش کے انتظار میں گجرات رکے ہوئے تھے۔ اب گجرات میں کرنے کو کچھ نہیں تھا اور ماں خوش تھیں کہ چچا دوارکا پرشاد نے ہمارے کچھ دن اور رک کے ان کی دیکھ بھال کرنے کی تجویز کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ اکیلا رہنا چاہتے ہیں اور والدہ نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ ہم مزید وہاں رکیں۔ وہ گھر چھوڑنے پر خوش تھیں جہاں وہ ساوتری کی بتدریج کم ہوتی ہوئی کراہنے کی آوازیں سنتی رہتی تھیں۔ والد نے سوگ منانے کے

رسمی طریقوں سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ان طریقوں سے دکھ کی توہین ہوتی ہے۔ رائے بہادر اور ان کی بیوی بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ وہ واپس پیرو شاہ چلے گئے تھے اس کے بعد ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوئی ایک سال کے اندر اندر پہلے رائے بہادر کا انتقال ہوا اور اس کے بعد ان کی بیوی بھی چل دیں۔

منگنیاں اور شادیاں تو خیر پیچیدہ ہوتی ہی ہیں لیکن سوگ بھی کچھ کم پیچیدہ نہیں ہوتا۔ ہم شادیوں پر دل بھر کر خوش ہوتے ہیں تو سوگواری میں ہمیں ان کی پوری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ پنجابیوں خصوصاً ہماری عورتوں نے آدھا کام کبھی نہیں کیا۔ ان کے لئے ماتم بھی ایک فن تھا اور مہارت اور قوت برداشت کا امتحان۔ دکھ کو بڑی حوصلہ مندی سے برداشت کیا جاتا ہے۔ علامتوں سے بھرپور ماتم کی اصلی رسوم میں رونے پیٹنے کی کچھ بھونڈے رواج بھی شامل ہو گئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اپنی ان بھونڈی صورتوں کے ساتھ طویل ماتم صرف عورتوں کا حصہ تھا۔ جب مرد ماتم کے لئے اکٹھے ہوتے تھے تو ایسے اجتماع میں ایک پرسکون اور پروقار خاموشی ہوتی تھی جو کبھی کبھی فلسفیانہ جملوں سے ٹوٹ جاتی تھی جیسے "خدا ہی دیتا ہے اور وہی لے بھی لیتا ہے' ہم برا ماننے والے کون ہیں"۔ یہ مردوں کا عمومی مضمون ہوتا تھا۔ اپنے اپنے سر ڈھک کے وہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی آہیں بھرتے تھے' خدا کی تعریف اور جانے والے کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔

عورتوں کو موت میں ایک ذہنی اور جسمانی کیتھارسس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روتی ہیں' مقفیٰ بین کرتی ہیں' بڑی باقاعدگی سے تال پر سینہ کوبی کرتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ روایتی طریقے کے مطابق کرتی ہیں اور اس میں کچھ ابداع کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک گروپ کی صورت میں بیٹھ جاتی ہیں اور چہرے کو لمبے گھونگھٹ سے چھپا لیتی ہیں۔ اس گھونگھٹ کو پلا کہتے ہیں اور اسی سے پنجابی لفظ پلا پانا بنا ہے۔ وہ ایک لے میں روتے ہوئے اس پلے سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہیں اور اسی سے ناک بھی صاف کرتی ہیں۔ اس کی راہنما نوحے میں اختراعیں کرتی ہے اور پلا پانے والی عورتیں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ اظہار ہمدردی کے لئے ہر عورت سوگوار عورت کے پاس آئے گی' اپنے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے گی اور بڑی مانوس زبان اور طرز میں نوحہ کرے گی۔ اور کبھی کبھی سوگوار عورت کو کھینچ کر گلے بھی لگا لے گی اور اپنے پلو میں چھپا لے گی۔ اس بے چاری عورت کو جو رنج و غم میں پہلے ہی ڈوبی ہوتی ہے' آرام کا کوئی لمحہ نصیب نہیں ہوتا۔

ماتم کی سب سے ہیبت ناک صورت وہ تھی جسے سیاپا کہتے ہیں۔ جب ہم بچے تھے تو ہم

سیاپے سے بہت ڈرتے تھے۔ عورتیں ڈیوڑھی میں افسوس کرنے والیوں کا ایک ماتمی جتھا بنا لیتی تھیں۔ سب سے زیادہ تجربہ کار عورت ان کی لیڈر بن جاتی تھی۔ وہ اپنے جتھے کا انتخاب کر کے ان بیس پچیس عورتوں کو ایک یا دو دائروں میں ترتیب دیتی تھی۔ لیڈر ان کے درمیان کھڑی ہو جاتی تھی۔ سب عورتیں اپنے سینے ننگے کر لیتی تھیں اور شلواریں اتنی اونچی کر لیتی تھیں کہ ان کی رانیں بھی ننگی ہو جاتی تھیں۔ پھر اپنی لیڈر کے حکم پر پہلے اپنے سینے پر پھر اپنے چہرے اور پیشانی اور اس کے بعد اپنی رانوں پر باقاعدگی سے ہاتھ مار مار کر بین کرتی تھیں۔ بین اسی تال پر کئے جاتے تھے جس پر وہ پیٹتی تھیں۔ لے بڑی تیز ہوتی تھی۔ لیڈر اکثر وہ بین کرتی جو اس نے اپنے شوہر یا بیٹے کی وفات پر گھڑے تھے۔ باقی عورتیں انہی بینوں کو دہراتی تھیں۔ سیاپے کے دوران لیڈر اس جتھے پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ غلطی کرنے والی عورت کو جس کی تال صحیح نہ ہو یا کوئی اور بے جا حرکت کرے' جتھے سے فوراً نکال دیا جاتا تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر فرش پر بیٹھ کر پلا پانے والی عورتوں میں شامل ہو جاتی تھی۔ رونے پیٹنے یعنی سیاپا کرنے اور اس کے دوران عورتیں کے بیہوش ہو جانے کی وجہ سے یہ رواج بڑا ہیبت ناک بن گیا تھا۔ آخر کار ہمارے زمانے میں برادری نے اسے ممنوع کر دیا اور پھر یہ رواج بڑی جلدی ختم ہو گیا۔

دسواں باب

میرے والد کی نئی تعیناتی سرگودھا میں ہوئی اور ہم ان کے پاس چلے گئے۔ سرگودھا بمشکل بیس سال پرانا شہر تھا۔ یہ پنجاب کی ترقی کا مظہر تھا۔ دو دریاؤں کے درمیان زمین نہری نظام کے تحت آ گئی تھی۔ اس نظام کی خصوصی خدمت جنوب مغربی پنجاب کے صحرائی علاقے کو سیراب کرنا تھا۔ آخری صدی کے اختتام کے قریب یہ تمام علاقہ جھاڑیوں سے بھرا ہوا بیابان تھا۔ اس بیابان میں کچھ نیم خانہ بدوش قسم کے چرواہے رہتے تھے جو بھیڑ بکریاں اور بھینسیں پالتے تھے اور اپنے لئے تھوڑا سا اناج اگا لیتے تھے۔

نئی نہریں عرصے سے ان غیر مزروعہ زمینوں کے لئے پانی لائیں۔ غیر یقینی اور بہت کم بارش کی وجہ سے یہ ہمیشہ کاشت سے محروم تھیں۔ زمینیں کافی زرخیز تھیں کیونکہ ایک زمانے سے دریا اپنا راستے بدلتے رہے ہیں اور سیلاب کے دنوں میں اپنے بند توڑ کر زمین کی سطح پر نئی زرخیز مٹی بچھاتے رہے ہیں۔ اب نہروں نے سارا سال پانی فراہم کرنا شروع کر دیا تھا اور نہروں کے فوراً بعد مواصلات' ریل اور سڑکیں آ گئیں۔ نہریں کھودنے کے بعد حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس علاقے کو آباد کرنا تھا۔ حکومت نے لینڈ سیٹلمنٹ افسروں کی ایک بڑی فعال جمعیت قائم کی جس کا فرض لوگوں کو پرانے پنجاب سے لا کر اس علاقے میں آباد کرنا تھا۔ پہلے تو لوگ اس جنگل میں جانے کے لئے تیار ہی نہ تھے جہاں کے اصل باشندے گیدڑ' لومڑیاں' لگڑ بگڑ اور ہرن تھے۔ لیکن جو لوگ وہاں پہنچے انہوں نے بڑی امید افزا خبریں بھیجیں۔ غیر مزروعہ زمین میں جس کی توانائی صدیوں سے اکٹھی ہو رہی تھی اور ہل کے لئے ترس رہی تھی' جب بیج ڈالا گیا تو فصلیں اتنی اچھی ہوئیں کہ لوگ حیران رہ گئے۔ جتنی زمین کوئی چاہتا' لے سکتا تھا اور جتنی زیادہ وہ مانگتا تھا اتنا ہی صاحب خوش ہوتا تھا اور اپنے نقشوں پر مربعوں کو بھرتا جاتا تھا۔ ایک کہانی کے مطابق ایک منچلا آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر صاحب کے ساتھ پہلے ایک سمت گیا اور پھر دوسری سمت گیا۔ دونوں سارا دن گھوڑوں پر سوار ہو کر چلتے رہے اور شام کو واپس اس مقام پر پہنچے جہاں سے وہ چلے تھے۔ اس نوجوان نے کہا کہ اگر صاحب چاہے تو یہ ساری زمین میں لے

لوں گا۔ صاحب بڑی خوشی سے رضامند ہو گیا۔ اسے اپنے آباد کاری کے نقشے بھرنے میں ساری رات لگ گئی۔ یہ منچلا نوجوان شاہ پور کے قریب پہلا ٹوانہ تھا۔ یہ سکیم جس بندوبست افسر کی توانائی اور ہمت کی مرہون منت تھی' وہ سر مالکم ہیلی تھا۔ یہ بدنصیبی تھی کہ جس صوبے کی ترقی کے لئے اس نے اتنی محنت کی جب وہ اس کا گورنر بنا تو ہندوستانیوں کا سیاسی شعور اتنا بیدار ہو چکا تھا کہ وہ غیر مقبول ہو گیا۔

جہاں کہیں بھی چند خاندان اکٹھے آباد ہو جاتے وہاں گاؤں بن جاتا تھا لیکن حکومت نئے شہر بسانے کے لئے بے چین تھی تاکہ دیہاتی علاقے کی پیداوار کو منڈیوں میں لایا جا سکے اور وہ انتظامیہ اور تعلیم کے مرکز بھی بن سکیں۔ سرگودھا اسی قسم کا شہر تھا۔ کئی اور شہر بھی ایسے ہی تھے جیسے لایل پور اور منٹگمری۔ یہ بالکل نئے شہر تھے۔ کئی چھوٹے قصبے تحصیلیں اور ضلعے بن گئے۔ محکمہ بندوبست کے افسران واقعی لوگوں کو کھینچ کھینچ کر ان چھوٹے شہروں میں لے کر آئے۔ جب کوئی کسان زرعی زمین لیتا تھا تو اسے ترغیب دی جاتی کہ وہ تھوڑی سی جگہ شہر میں بھی لے لے۔ وہ شخص کہتا تھا "اچھا صاحب' مجھے یہاں بھی ایک کلا زمین دے دو جو گھوڑے کو باندھ کر چرنے کے لئے کافی ہو۔ جب میں مالیہ ادا کرنے آؤں گا تو شاید یہ کام آئے"۔ اس پر صاحب کہتا "نہیں' نہیں' ایک ایکڑ بلکہ دو ایکڑ یا اس سے بھی زیادہ لے سکتے ہو"۔

یہ شہر بالکل ابتدا سے آباد ہوئے تھے اور محکمہ بندوبست کی امتیازی صفات یعنی ترتیب' بے رنگی اور کاروباری ہونا ان شہروں میں منعکس ہوئے۔ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر شدہ شہر سرگودھا قرون وسطی کے گجرات سے مختلف نہیں تھا۔ یہ شہر مربعہ شکل میں تھا۔ اس کے ایک طرف نہر تھی اور دوسری طرف نئی ریلوے لائن جو نہر پر زاویہ قائمہ بناتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس کے تیسری طرف پھلوں کے باغوں' باغیچوں اور سبزیوں کے کھیتوں کے لئے جگہ تھی۔ ان میں سے پانی تقسیم کرنے والی چھوٹی نہر گزرتی تھی۔ شہر کی چوتھی طرف لیکن شہر سے علیحدہ تھوک کی منڈی تھی اور اس کے قریب ہی ریلوے سٹیشن بنایا گیا تھا۔ شہر کے دو حصے تھے۔ شہر اور منڈی ریلوے لائن کے ایک طرف تھے اور سول سٹیشن دوسری طرف۔ شہر سے باہر نئی نئی چیزیں مثلاً واٹر ورکس' بیجوں کی فارم اور فیکٹریوں کے لئے مختص علاقے تھے۔ آٹے اور تیل کی ملیں جننگ فیکٹریاں' اور ایک عیش کی چیز برف کا کارخانہ نمایاں تھے۔

منڈی بھی ایک مربع شکل میں تھی۔ اس کے چاروں طرف دکانیں تھیں۔ یہاں قریبی

علاقے کی پیداوار گندم' کپاس' جوار اور بنولہ برائے فروخت آتے تھے۔ کسان اپنی اپنی پیداوار بیل گاڑیوں میں جن میں کبھی بیلوں کی جگہ بھینسے بھی جوت لئے جاتے تھے' یا اونٹوں پر لاد کر لاتے تھے اور منڈی میں ڈھیر کر دیتے تھے۔ سب سے خوبصورت کپاس کے ڈھیر تھے۔ یہ برف کے گالوں کی طرح نرم اور سفید ہوتے تھے۔ کسان' تھوک کے خریدار جن میں بڑی یورپی فرمیں رالی برادرز' لوئی ڈریفس' والکرٹ برادرز اور ان کے جاپانی متبادل ٹویو مینکا کیشا' متسی بشی وغیرہ کے نمائندے' اور پیشہ ور نیلام کرنے والے ایک ڈھیر سے دوسرے کی طرف جاتے تھے۔ جب بڑی نرم آواز سے بولی لگ رہی ہوتی تھی تو یہ لوگ مٹھی بھر گندم اٹھاتے' اس پر نظر ڈالتے اور ہاتھ کی انگلیاں کھول دیتے تھے۔ گندم کے دانے انگلیوں میں سے گزر کر پھر ڈھیر میں جا ملتے تھے۔ یہ لوگ باتیں نہیں کرتے تھے۔ صرف سر کی جنبش پر بولی دینے والے کی آواز میں تبدیلی آ جاتی تھی اور وہ آواز لگاتا تھا: چار روپے دو آنے' چار روپے دو آنے' چار روپے دو آنے کے بعد چار روپے تین آنے پر آ جاتا تھا۔ سر کی ایک جنبش سے بولی تین آنے سے بڑھ کر چار آنے ہو جاتی تھی۔ نیلام کرنے والا فوراً رک جاتا اور وہ دوسرے ڈھیر کی طرف چل پڑتا۔ پورا مجمع خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ ایک نوٹ بک میں منشی سودے کا مکمل اندراج کرتا جاتا تھا۔ ایک دوسرے طریقے کے تحت بولی دینے والا اور دلال ایک تولئے سے اپنے ہاتھ ڈھانپ لیتے تھے اور بولی دینے والا دلال کی انگلیاں پکڑ پکڑ کر بولی لگاتا تھا۔ یہ پیچیدہ قسم کا طریقہ تھا اور جلد ہی متروک ہو گیا۔ اس کی جگہ کھلی نیلامی نے لے لی۔ مہینوں کی محنت' اندیشوں اور امیدوں کا تصفیہ چند منٹوں میں ہو جاتا تھا۔ کسان آڑھتی کی دکان پر واپس جاتا تھا جس نے کسان کو بیج بیچا تھا اور رقم بھی پیشگی دی تھی۔ اپنے بیل جوتنے سے پہلے وہاں کسان اپنا حساب صاف کرتا تھا۔ تمام پیداوار بوریوں میں بند کرنے کے بعد ریل کے ذریعے پنجاب میں مختلف مقامات کو' ہندوستان اور سمندر پار بھی روانہ کر دی جاتی۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سول سٹیشن ایک مستطیل کی صورت میں بنا ہوا تھا۔ بنگلوں کا سائز افسر کے عہدے کے مطابق ہوتا تھا۔ یہاں کچھ بنگلے بڑے زمینداروں کے بھی تھے۔ انگریزوں کی سوشل زندگی کا محور کلب' گرجا اور پولو گراؤنڈ تھے۔ یہاں ان کی ضروریات اور شراب کی دکان کا نام لنڈن ہاؤس تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ضلعے کے تمام افسر انگریز تھے لیکن ہندوستانی بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں سوشل تسویہ کے مسایل بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ اگر ضلعے کا ڈپٹی کمشنر ہندوستانی ہو تو ضلعے کا سربراہ ہونے کے ناتے وہ کلب کا ممبر

بھی ہوتا تھا۔ اگر وہ پرانی قسم کا ہو اور انگریزوں کی صحبت سے گریز کرتا ہو تو مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا تھا۔ لیکن اگر اس کا تعلق آئی سی ایس سے ہو اور اس کی تربیت آکسفورڈ یا کیمبرج میں ہوئی ہو تو مسایل ضرور پیدا ہو جاتے تھے کیونکہ سروس کی عزت تو بہرحال کرنی ہی پڑتی تھی۔ لیکن خود انگریزوں کے درمیان بھی مسایل تھے۔ آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر' اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر اور سیشن جج کا ایک قدرتی گروپ بنتا تھا جس میں ایس پی اگر وہ فوجی ہو تو خود بخود فٹ ہو جاتا تھا۔ عملی خوش اخلاقی کی بنا پر سول سرجن بھی کلب میں فٹ ہو جاتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کے ساتھ برابری کا سلوک ہی زیادہ سود مند تھا۔ اکثر وہ بھی فوجی ہوتا تھا جو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر ملازمت میں شامل ہوتا تھا۔ انجنیئر کا مقام اس کے پس منظر پر منحصر تھا اگر پس منظر درست ہو تو اسے قبول کر لیا جاتا تھا ورنہ بینک مینیجر اور پولیس افسر کی طرح اسے صرف برداشت ہی کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی سکاٹ لینڈ کا رہنے والا ہو اور اس کا لہجہ بھی نہ بدلا ہو تو یہ کافی مفید ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ڈاکٹر اور پادری کی طرح ایک سوشل غیر جانبداری اور قبولیت کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ لیکن آئرلینڈ کے باشندوں پر جو سکاٹس کی طرح ابتدائی ملازمتوں کی ریڑھ کی ہڈی تھے' یہ رعایت خود بخود نافذ نہیں ہوتی تھی۔ سرگودھے میں انگریز لوگوں کے درمیان مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے والا عامل فوج کا قریبی ریماونٹ ڈیپو تھا۔ یہ خچروں اور گھوڑوں کی افزائش کے لئے ایک سٹڈ فارم تھا۔ اس میں کئی انگریز افسر تھے۔ ان کا تعلق ادنیٰ سوشل گریڈ سے تھا۔ خوش قسمتی سے یہ ڈیپو سرگودھے سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ ابھی موٹر کاریں نہیں آئی تھیں اس لئے وہ روزانہ کلب نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن اختتام ہفتہ پر وہ اپنی پوری جماعت کے ساتھ آتے تھے۔ کرسمس اور نئے سال کی آمد پر یا جب گورنر کا دورہ ہو تو کلب ایک یک جان جماعت بن جاتی تھی۔ باہر سے دیکھنے میں تو کلب ہندوستانیوں کے لئے قطعی طور پر صرف اور صرف انگریزوں ہی کی تھی لیکن اس کے اندر انگریزوں کی بھی طبقاتی قسمیں موجود تھیں۔

ریلوے لاین کی دوسری طرف کمپنی باغ اور ہسپتال تھے۔ ان کے بعد شہر شروع ہو جاتا تھا جو باغیچوں اور سبزی کے کھیتوں تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر مربع ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔ ہمارے وقت میں اس کے سولہ بلاک تعمیر ہو چکے تھے۔ شہر ایک ہی طرف بڑھ سکتا تھا۔ اس کا سترھواں بلاک ابھی بن رہا تھا۔ دونوں طرف دکانوں والی بغلی سڑکیں تھیں اور دو سڑکیں عمودی تھیں اور ان کے پیچھے رہائشی بلاک تھے۔ ہر بلاک میں داخل ہونے کے دو راستے تھے اور اندر ایک کھلا چوک تھا۔ ہر چوک کے پیچھے ایک چوڑی گلی تھی جن کے

دونوں طرف گھروں کی دو قطاریں تھیں ایک ہائی سکول' ایک کٹڑ ہندو مندر' ایک آریا سماج' ایک مسجد اور ایک گردوارے کا اہتمام موجود تھا۔ شہر میں واٹر ورکس تھا اور گھروں میں پانی لوہے کی نالیوں سے آتا تھا۔ تمام بلاکوں کے نمبر تھے۔ کچھ بلاک خالصتاً ہندو' مسلمان اور سکھ تھے تو کئی دوسرے مخلوط تھے۔ طوائفوں' گانے اور ناچنے والیوں کے علاقے علیحدہ تھے۔

گجرات کے مقابلے میں سرگودھا بڑا صاف ستھرا اور صحت افزا شہر تھا۔ اس کی منصوبہ بندی بڑی اچھی تھی۔ یہ بہت روشن اور ہوا دار تھا۔ اس کی گلیاں اور کوچے سیدھے اور کشادہ تھے۔ صاف' ستھری' صحت افزا اور شخصیت سے محروم حد بندی اس کے شہریوں کو ایسے سانچے میں ڈھالتی دکھائی دیتی تھی جو وکٹورین عہد کے اختتام کے قریب محکمہ بندوبست کے افسروں کے ذہنوں میں تھا۔ سرگودھے میں سماجی اور سیاسی بیداری زیادہ تھی۔ اس کی میونسپل کمیٹی بہتر طریقے پر چلتی تھی۔ اس کی مختلف مذہبی جماعتوں نے نئے سکول کھول دیئے تھے۔ ناچنے اور گانے والیوں کو شہر سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ پہلے انہیں نہر کے کنارے اور پھر اس سے بھی دور آباد کیا گیا تھا۔ یہ سرگودھے کی نئی روح کے عین مطابق تھا کہ اس کی برادریوں نے شادیوں پر آتش بازی کو ممنوع قرار دے کر فضول خرچی بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے تو شاید وہ گانے بجانے اور دوسری تفریحوں کو بھی بند کر دیتے۔ سب چیزوں کے باوجود سرگودھے میں بے رنگی اور یکسانیت تھی۔ اس شہر یا اس کے شہریوں میں گجرات والے رنگوں جیسا کوئی رنگ نہ تھا۔ پورے مغربی پنجاب سے ہر قسم کے لوگ یہاں آ کر آباد ہونے لگے تھے۔ ان میں پیشہ ور رجحان رکھنے والے لوگ' تاجر' کاروباری اور تمام قوموں کے ہنر ور شامل تھے۔ پرانے رشتے ختم ہو گئے تھے اور نئے تعمیر ہو رہے تھے۔ جس بلاک میں ہم رہتے تھے اس میں ایسے لوگ آباد تھے جن کا تعلق مختلف پیشوں سے تھا۔ ان میں کھتری بھی تھے اور اروڑے بھی۔ ان میں ایک نیا رشتہ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ رشتہ مردوں سے شروع ہوا جو اکٹھا کام کرتے تھے اور پھر یہ خواتین میں بھی نفوذ کر گیا۔ سرگودھے میں ہماری والدہ کھتری اور اروڑہ پیشہ ور لوگوں کے علاوہ کہیں اور نہیں جاتی تھیں۔ تعلیم اور کام کے روابط نے ذاتوں کے پرانے رشتوں کی جگہ لے لی تھی اور چاروں ذاتوں کے ساتھ ایک نیا معاشرہ ابھرنے لگا تھا جس کے ممبر معاشرے کے روایتی نمونوں کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ یہ پیشہ ور تھے اور ان کا تعلق ساری ذاتوں سے تھا مثلاً تاجروں میں جو اکثر اروڑے تھے ایک آدھ کھتری بھی تھا۔ ہنر مند تھے اور اطراف کے دیہاتوں کے زمیندار بھی تھے جن میں اکثر خاصے امیر تھے۔ اس نئی گروہ

بندی نے ابھی تک شادی کے رواجوں پر اثر انداز ہونا شروع نہیں کیا تھا۔ کھتری اب بھی کھتریوں ہی میں شادی کرتے تھے اور اروڑے اروڑوں میں لیکن وہ اب ذیلی ذاتوں کی صحت کے متعلق اتنے سخت نہیں تھے۔ چنانچہ اب پیشہ ور دوسرے ہم مرتبہ اور تعلیم والے دوسرے پیشہ وروں کے ہاں' تاجر تاجروں کے ہاں اور زمیندار دوسرے کاشت کاروں کے ہاں شادیاں کرتے تھے۔ شدت پر مبنی پرانا ذات پات کا نظام رخصت ہو رہا تھا اور وسیع پیانے پر استوار رشتوں کا نیا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ہم میں پرانے برادری سسٹم کا مقام آریا سماج لے رہا تھا۔

ہم ابھی سرگودھے ہی میں تھے جب پورے پنجاب میں انفلوائنزا کی وبا پھیل گئی۔ ہر ہفتے چھپے ہوئے کونوں والے کارڈ آنے شروع ہو گئے تھے۔ والد کو بھی انفلوائنزا نے آ لیا اور وہ بھی کئی دنوں تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ شاید ان کی آہنی ساخت نے انہیں بچا لیا جو برسوں کھلی فضا میں رہنے کا نتیجہ تھی۔ ان کے دو بھتیجے اور دو بہنیں انفلوائنزا کی نذر ہو گئی تھیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ وبا کیا ہے گو ہم نے سن لیا تھا کہ یہ یورپ کی جنگ کے میدانوں سے آئی ہے۔ والد آہستہ آہستہ اپنی بیماری سے صحت یاب ہوئے۔ جب وہ گھر میں چلنے پھرنے لگے تو ماں نے گھر کو بیماری سے پاک کرنے کے لئے ہون کا انتظام کیا اور مٹھائی بانٹی۔ وہ امید کرتی تھیں کہ یہ عجیب غیر ملکی بیماری دوسری بار ہمارے گھر نہیں آئے گی۔ پچھلے سال موت کے فرشتے نے ہمارے گھر کے چکر کچھ زیادہ ہی کاٹے تھے۔

شاید والد کی صحت یابی کی خوشی میں یا شاید وقت آ چکا تھا جب ہمارے گھر پہلی میکانکی چیز آئی۔ یہ سنگر کی سلائی مشین تھی۔ اس پر چمکتا ہوا سیاہ رنگ تھا اور اس کے کچھ جگہوں پر کرومیم بھی کیا گیا تھا۔ اس کے لکڑی کے ڈھکنے پر بھی چمکدار پالش تھی۔ یہ مشین ابھی تک بہت کم لوگوں تک پہنچی تھی۔ اس کے ساتھ ایک رنگین کیلنڈر بھی آیا تھا جس میں دوسرے ملکوں میں اس کی مقبولیت کو دکھایا گیا تھا۔ گو تصویر ہی میں سہی لیکن دنیا کی دوسری اقوام سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ صحت اور زندگی میں والد کی دلچسپی بحال ہو رہی تھی۔ "گانے والے کو ہر ملک میں ترجیح دی جاتی ہے"۔ یہ نعرہ کیلنڈر پر لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کا بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کیا۔ انہوں نے ہمیں تعلیم کے ساتھ ساتھ گانا سیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ ان کی ہدایت تھی کہ مخصوص صلاحیت کے فقدان کے باوجود ہمیں محنت سے گانا سیکھنا چاہئے کیونکہ گانا بہت بڑا ہنر ہے۔ اپنے مزاج سے عاری مزاج کے مطابق

انہیں یقین تھا سنگر والے لوگ موسیقی کی بین الاقوامی محبت سے خوب فائیدہ اٹھا رہے تھے۔

دو سال سرگودھے میں رہنے کے بعد میرے والد کا تبادلہ مظفر گڑھ ہو گیا۔ یہ دریائے سندھ کے قریب جنوب مغربی کونے میں پنجاب کا آخری شہر تھا۔ پنجاب کا ایک اور شہر بھی ادھر ہی تھا یعنی ڈیرہ غازی خان لیکن یہ اور بھی دور مغرب میں دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر تھا۔ دریائے سندھ کے کنارے ڈیرا غازی خان' ڈیرا اسماعیل خان' موسے خیل' عیسیٰ خیل' میرم شاہ' شلوزان' پارا چنار اپنے گونج دار آوازوں کے باوجود پنجابی ہونے کی بجائے پٹھان شہر خیال کئے جاتے تھے ان میں رہنے والے ہندو پنجابی تھے۔ وہ تاجر تھے اور پنجابی بولتے تھے۔ ان کی اکثر شادیاں پنجاب میں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے پٹھان چہرے مہرے' سفید جلد' بھوری آنکھیں' ان کے لباس اور عادات و اطوار کی وجہ سے ہم انہیں اپنوں میں شمار نہیں کرتے تھے۔ لیکن فرنٹیئر میں شادیاں کرنا بڑا مقبول تھا۔ شاید اس کی وجہ نسل اور ورن کے لئے ہماری قدیم ترجیح ہو جو ہمارے آریائی آباو اجداد سے چلی آ رہی تھی۔

سفید رنگ کے لئے ہماری ستائش آریائی زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ خبط اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ میں نے انگریزوں کے ہاں بھی نہیں دیکھا کیونکہ ہندوستان میں نسلی علیحدگی کے پیش نظر ہمارا خیال تھا انگریز رنگ اور نسل کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ ہمارے ہاں پیدائش کے بعد بچے کی رنگت سب سے اہم وصف خیال کیا جاتا ہے۔ نوزائیدہ بچے کے بارے میں دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کا رنگ کیا ہے: وہ گورا ہے یا سانولا۔ نظر بد سے بچانے کے لئے گورے رنگ کے بچے کی پیشانی پر اس کی ماں ہر صبح کالا ٹیکہ لگاتی ہے اور اس کی کمر میں ایک کالی ڈوری باندھ دیتی ہے۔ ایک ہلکے سانولے رنگ کی چھوٹی بچی شروع سے ہی والدین کی پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ "اس کے لئے مناسب رشتہ کیسے ملے گا؟ اسے کون لے گا؟ ہمیں اس کے لئے خوبصورت گورا لڑکا نہیں ملے گا۔ اس لئے اس کے لئے زیادہ جہیز کا بندوبست کرنا چاہئے"۔ اور جب کسی کی شادی کا وقت آتا تھا تو پوچھا جاتا تھا: "کیا وہ گورا ہے؟ کیا وہ گوری ہے؟" گورا رنگ کئی عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ خواہ جوڑا لمبا ہو یا چھوٹا' سادہ ہو یا خوبصورت' ہوشیار یا غبی' گوری رنگت سب کی تلافی کر دیتی ہے۔ چاند سا چہرہ' چنبیلی سی رنگت' چہرے کی گلاب جیسی جلد اور بس۔ اگر وہ سینا پرونا اور گھر داری نہ بھی جانتی ہو تو بھی پرواہ نہیں۔ درمیانے طبقے کے اخبار ٹریبون میں شادیوں کے اشتہاروں میں ہمیشہ گورے

رنگ کی دلہن کا مطالبہ ہوتا تھا۔ تاہم سانولی لڑکیوں کی بھی تو آخر شادیاں ہوتی تھیں۔ اگر سفید رنگ والوں نے صرف سفید رنگ والیوں سے ہی شادیاں کرنی ہیں تو آئندہ کسی وقت ہم کالی اور گوری دو قومیں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے معاشرے پر اس وجدانی انکشاف کو کہ آخر کرشن بھگوان بھی تو کالے ہی تھے' ایک حیلہ بنا لیا تھا۔

ترک اور مغل مسلمان حملہ آوروں نے بھی رنگ کے متعلق ہمارے احساس کو مزید شدید بنایا ہو گا۔ "سمن عارض" اور "گل عارض" والی ان کی شاعری نے ہماری سفید رنگ کی ترجیح کو مزید تقویت دی ہو گی۔ تاہم گوری رنگت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب انگریز آئے تو ان کی گلابی رنگت اور بھورے بال ہمارے قابل قبول معیاروں سے باہر ہی رہے۔ وہ بہت زیادہ سفید تھے ہمارے لئے کالے بال' پیلی نہ کہ سفید جلد اور گالوں میں صرف سردیوں کے دنوں میں گلابی رنگت درکار ہے۔ یورپی گوری رنگت ہمارے لئے قابل قبول رنگت سے زیادہ گوری تھی۔ یورپی سفیدی دھوپ میں سرخی میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح کالی آنکھیں بہترین تھیں گو شربتی بھی پرکشش ہو سکتی تھیں لیکن ہلکے رنگ کی بھوری یا نیلی آنکھیں اور ہلکے رنگ کے بال بے وفائی اور بد اعتمادی کی نشانیاں تھیں۔ ہمارے مثالی حسن کو اختصار کے ساتھ یوں پیش کیا جا سکتا ہے: ساون کے بادلوں کی طرح گھنے سیاہ بال' غزالی آنکھیں اور گندمی رنگت۔

مظفر گڑھ کو بمشکل پنجاب کا شہر شمار کیا جائے گا۔ پہاڑوں سے دور اس کے ارضی منظر میں کھجور کے درختوں کے جھنڈ اور کلر سے سفید زمین کے ٹکڑے تھے۔ کلر ایسے نظر آتا تھا جیسے ابھی ابھی برف گری ہو۔ پکی اینٹوں کی بجائے گھر مٹی اور بھوسے سے بنے ہوئے تھے۔ لوگ چھوٹے قد کے تھے اور ان کے خد و خال تیکھے تھے۔ اکثر لوگ اروڑے تھے اور کھتری خال خال۔ یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے غریب اور منکسرالمزاج تھے اور اپنے آپ کو غریب کراڑ کہہ کر اپنی تحقیر خود کرتے تھے۔ یہاں کے مویشی بھی مختلف تھے۔ یہاں گھوڑوں کی جگہ گدھوں اور بیلوں کی جگہ اونٹوں کو جوتا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو ہمیں یہ لوگ اور علاقہ بڑے اجنبی لگے۔ ہم سرگودھے کے لوگوں' لہجے اور قدرے غیر پنجابی طریقوں میں تبدیلی پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ لیکن یہ لوگ تو ناقابل فہم تھے۔ جلد ہی ہم نے پنجابی ہندو معاشرے کے مانوس خد و خال کو پہچاننا شروع کر دیا ذاتیں' ذیلی ذاتیں' رواج' برت' میلے اور تہوار۔ نئے نئے شروع ہونے والے آریا سماج نے ہمیں برادری کی پیشکش کر دی۔

زمین کے کئی ٹکڑے کلر کی وجہ سے بڑے نمکین تھے جو زمین سے سفید سفوف کی صورت میں نکلتا تھا۔ یہ عمارتوں کی دیواروں پر چڑھ کر پہلے پلستر کو کھا لیتا تھا اور پھر اینٹوں کو چاٹ جاتا تھا۔ جتنا آپ اس کو زمین سے صاف کرتے تھے اتنا ہی یہ اور نکل آتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ پورے ایک کھیت میں پھیل جاتا تھا اور اکثر ٹکڑوں کی صورت میں بھی پھیلتا تھا۔ اس میں نہ تو کوئی چیز پیدا ہو سکتی تھی اور نہ کوئی چیز اس کو ختم کر سکتی تھی۔ لوگ اسے سفید بربادی کے طور پر قبول کرتے تھے۔ وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے' کچھ موسمی نہریں تھیں جو گرمیوں میں پانی لاتی تھیں۔ بارش بہت کم ہوتی تھی۔ گرمیوں کی مانسون کبھی کبھار ہی پہنچتی تھی لیکن بحیرہ عرب سے سردیوں میں آنے والی مانسون کچھ بارش لے آتی تھیں۔ چنانچہ جتنا پانی بھی نہریں لاتیں تھیں وہ غنیمت تھا۔ بارش کے بغیر اس آب و ہوا میں جو چیز بنات سے پیدا ہو سکتی تھی وہ کھجور تھی۔ یہاں کی معیشت کھجوروں پر مبنی تھی۔ کھجوروں کو تازہ اور سکھا کر بھی کھایا جاتا تھا۔ اس کی گٹھلیوں کو پیس کر آٹا بنایا جاتا تھا۔ ان کے خوشوں سے جن پر پھول لگتے تھے۔ جھاڑو بنائے جاتے تھے۔ اس کے چھلکے کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے پتوں کو چھپروں میں استعمال کیا جاتا تھا اور نئے نئے پتوں کو رنگ کر ٹوکریاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ جب درخت مر جاتا تھا تو اس کے تنے کو لمبی نالی بنا کر رہٹ میں لگا دیتے تھے۔ اس کی جڑوں سے رسیلا نباتاتی مسام دار مادہ نکلتا تھا جیسے خاصے کی خوراک سمجھا جاتا تھا۔ اسے بغیر پکائے بھی کھایا جاتا تھا اور اس کا اچار بھی ڈالا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی دولت ہی کھجور تھی اور یہ درخت کلر کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن ہم سکول کے طالب علم اس سے ناراض تھے کیونکہ ہمارے سکول کے ماسٹر اس کے بڑے پتے کے درمیانی تنے کو چاقو سے چھیل کر لچک دار بنا لیتے تھے جو ہماری ہتھیلیوں پر لگتے وقت انہیں زخمی کر دیتا تھا۔ پنجابی لڑکے روایتی طور پر ہتھیلیوں پر ہی مار کھاتے ہیں۔ دھند آلود ٹھنڈی صبحوں کو جب ہمارے کلاس رومز میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تھے اور ہمارے ہاتھ کی انگلیاں ٹھنڈ کی وجہ سے چلنے سے انکار کر دیتی تھیں تو ایذا پسند استاد ان چھڑیوں سے ہمارے ہاتھ گرم کرتے تھے۔

بکھور شہر کے مظفر گڑھ پنجابی شہروں سے مختلف تھا۔ اس میں دریائے سندھ سے پرے بلوچستان اور پھر اس سے بھی پرے ایران کا کچھ اثر نظر آتا تھا۔ گھر کے چاروں طرف سادی بلند دیواروں ہوتی تھیں۔ گھر کچی اینٹوں سے بنتے تھے۔ ہر گھر کے دو صحن تھے سامنے

والی دیوار میں داخلی دروازہ ہوتا تھا۔ گھروں کی تعمیر مسلمانوں کے طرز کی تھی۔ ہمیں کالونی میں جگہ نہ ملی۔ ہم نے شہر کی نواح میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کی بلند دیواریں سادہ تھیں اور سامنے والی دیوار میں ایک شتروں والا گیٹ تھا۔ باہر کا صحن انگریزی حرف ایل کی الٹی شکل کا تھا۔ اس کے بائیں طرف ایک استقبالیہ اور دو کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں والد کا دفتر بن گیا اور دوسرے دو کمرے ملاقاتیوں کے لئے رکھے گئے۔ دائیں جانب اوپر کی طرف ملازموں کی رہائش گاہ' اصطبل' مویشیوں اور تانگے کے شیڈ تھے۔ ایک اور دروازے سے جس کے سامنے ایک پردے والی دیوار تھی' گھر کے اندر داخل ہوتے تھے۔ اس اندرونی صحن کے دائیں جانب رہائشی کمرے تھے۔ اور ان کے سامنے والی دیوار کے ساتھ کچن اور پینٹریز تھی۔ رہائشی کمرے سے ایک دروازے کے ذریعے والد کے دفتر میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ ہمارے ہاں پردہ نہیں تھا اس لئے ہم دونوں صحنوں کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں تو زندگی دو مختلف دھاروں میں بہتی تھی اس لئے ان کے ہاں اندرونی صحن عورتوں کے لئے اور بیرونی مردوں کے لئے تھا۔ صرف خاندان کے فرد' قریبی رشتے دار' عورتیں اور خادمائیں اندر جاتے تھے۔ اس شہر میں ہمیں سخت پردے کا تجربہ ہوا۔ بالائی پنجاب میں خواتین باریک کپڑے کے گھونگھٹ سے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھیں۔ چونکہ اس کے آر پار نظر آتا تھا اس لئے یہ ایک رسمی قسم کا پردہ تھا۔ مسلمان خواتین برقعہ پہنتی تھیں جو انہیں سر سے پاؤں تک چھپا لیتا تھا اور دیکھنے کے لئے آنکھوں کے سامنے کپڑے کی جالی ہوتی تھی۔ لیکن مظفر گڑھ میں پردہ بہت سخت تھا۔ ہندو عورتیں برقعہ تو نہیں پہنتی تھیں مگر وہ اپنے آپ کو چادر میں چھپا لیتی تھیں اور چہرے پر ایک موٹا نقاب ڈال لیتی تھیں۔ دریائے سندھ کے دوسری طرف ہندو عورتیں بھی برقعہ پہنتی تھیں۔

مظفر گڑھ صحرا کے ایک کنارے پر تھا جو شہر کے مغرب میں صرف ایک میل کے فاصلے سے شروع ہو جاتا تھا۔ اس صحرا میں ریت کی پہاڑیاں اور وادیاں تھیں۔ کچھ پہاڑیاں تو پچاس فٹ سے بھی اونچی تھیں۔ تیز ہوا کے چلنے کے ساتھ یہ اپنی شکل بھی بدل لیتی تھیں۔ ریت روز اپنی جگہ بدلتی رہتی تھی اور اس طرح ان ٹیلوں کے خطوط بھی بدلتے رہتے تھے۔ زمینی منظر بڑا حسین تھا جس میں ننگی' نرم اور خمدار ریتیلی پہاڑیوں میں بڑی شہوت انگیز گولایاں تھیں اور ان کی سطح پر ریت سے ہی بنی ہوئی سلوٹیں تھیں۔ گرمیوں کے دن تو جھلسا دیتے تھے لیکن رات کو ٹھنڈی ہوا چلتی تھی اور راتیں ٹھنڈی اور تازہ ہو

جاتی تھیں۔ سردیوں میں دن ٹھنڈے اور راتیں یخ ہو جاتی تھیں۔ زمینی منظر کے مزاج میں بھی بڑا تنوع تھا جس کا اظہار رنگوں میں ہوتا تھا۔ رنگ وقت اور موسموں کے ساتھ ساتھ بدلتے تھے۔ صحرا کا خاکستری رنگ چاند اور سورج کی گردش کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ یہ سورج کے طلوع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروب ہونے کے ایک گھنٹہ بعد یعنی دن اور رات کے درمیانی وقفے میں انتہائی حسین ہوتا تھا۔ پورے چاند کی چاندنی میں صحرا اس دنیا کا حصہ نہیں لگتا تھا۔

ہمارے دوروں کے لئے یہ بہترین علاقہ تھا۔ اپنے والد کے ساتھ جانے کے لئے ہم ہر دفعہ انتظار کرتے تھے۔ اس علاقے میں سارا سال چلنے والی نہروں کی زرخیز ہموار زمینوں والی ہریالی بہت کم تھی لیکن یہ علاقہ ایک نئی چیز پیش کرتا تھا ریت کا صحرا اور دریائے سندھ کا علاقہ۔

صحرا سے ہم اپنا پہلا تعارف کبھی نہیں بھولے۔ ایک شام کو میں اور میرا بھائی اپنے ڈاک بنگلے سے نکل کر ریت کے ٹیلوں میں گھومنے لگے اور راستہ بھول گئے۔ ہم ٹیلوں پر چڑھتے تھے اور نرم ریت پر چلنے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے تھے جو ہمارے پیروں کے نیچے دھنس جاتی تھی اور ہمارے پیچھے ایک لکیر چھوڑ دیتی تھی۔ ہم لکڑی کے لٹھوں کی طرح دوسری طرف لڑھک جاتے تھے۔ وادیوں اور ٹیلوں میں ہم اونٹوں کے پیچھے بھی بھاگتے تھے جو ہمارے کیمپ کا سامان لے کر آئے تھے اور جنہیں اب چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہم ان کے بے ہنگم طریقے سے دوڑنے پر ہنستے تھے۔ جب سورج ڈھلا تو ہم اپنے لمبے سائیوں کو دیکھ کر بڑے محظوظ ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم بانس کے طوالوں پر کھڑے ہو کر چل رہے ہیں اور اونٹوں جتنے لمبے ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی ہم پتلے پتوں والی جھاڑیوں سے رس بھرے پیلو توڑ کر کھاتے تھے۔ یہاں صرف یہی ایک پودا پھل دار ہے۔ جب ہم تھک گئے اور ہمارا دل اونٹوں اور ٹیلوں سے بھر گیا تو ہم نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس وقت سب ٹیلے ایک سے دکھائی دیتے تھے کیونکہ جب سورج ڈھلا تو تیز ہوا چل رہی تھی اور ہمارے راستے کے سارے نشان ریت کی نئی لہروں کے نیچے دب گئے تھے۔ ہم ڈر گئے کیونکہ ہمیں احساس ہوا کہ ہم کھو گئے ہیں اور گھر سے بڑی دور نکل آئے ہیں۔ ہم ادھر ادھر پھرتے رہے۔ خوش قسمتی سے ساربانوں نے ہمیں دیکھ لیا جو اپنے اونٹوں کی تلاش میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلے تھے۔ انہوں نے ہمیں ڈاک بنگلے تک پہنچایا جہاں ہری کین لالٹینیں لے کر پارٹیاں ہماری تلاش میں نکلنے والی تھیں۔ ہمیں اس کی سزا اس

وقت ملی جب ہمارے کانوں میں جو کل ریت پر لوٹنے سے ریت سے اٹ گئے تھے' شدید درد اٹھا۔

تھوڑی دور جا کے صحرا کا یہ حصہ ڈھلوان بن کر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے۔ سڑک اور ریلوے لائن ایک چھوٹے سے سٹیشن غازی گھاٹ پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ دریائے سندھ کا مشرقی کنارا ہے۔ گرمیوں میں یہ دریا بیس میل چوڑا ہو جاتا ہے۔ کئی جگہوں پر اس کی گہرائی پچاس فٹ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی یہ مٹیالا اور کیچڑ بھرا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ اس میں پرانی قسم کا پیڈلوں والا دخانی جہاز چلتا تھا۔ سردیوں میں سکڑ کر یہ دریا چند ندیاں رہ جاتا تھا جن پر کشتیوں کے پل بنا دیئے جاتے تھے۔ دوسری جگہوں پر لوگ مشکوں پر اس دریا کو عبور کرتے تھے۔ مشک کسی جانور کا سلا ہوا چمڑا ہوتا تھا جن میں ہوا بھر کر گردن کے قریب اس کا منہ بند کر دیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک پر ملاح اور دوسرے پر مسافر پیٹ کے بل سوار ہو جاتے تھے اور اپنا راستہ تیر کر طے کرتے تھے۔ ملاح ہاتھوں کو چپو اور پیروں کو پتوار بنا لیتا تھا۔ مسافر اس کے ساتھ کھنچا چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی صبح کے وقت دریا کے کنارے مگرمچھ دھوپ سینکتے نظر آ جاتے تھے۔ دریا کے کنارے سرکنڈوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان میں کافی شکار ملتا تھا۔ ان میں جنگلی سور' لومڑی' گیدڑ اور سیہ شامل تھے۔ سیہ کے کانٹوں کے آگے نبیں لگا کر ہم اپنی قلمیں بناتے تھے۔

مظفر گڑھ میں اونٹوں کی لڑائی ایک بڑا کھیل سمجھی جاتی تھی۔ یہ خاصا غیر معمولی کھیل تھا۔ لڑائی اونچے اونچے ٹیلوں سے گھری ریت کی وادیوں میں ہوتی تھی۔ وادی ایک بیضوی سا اکھاڑا نظر آتی تھی۔ ایسی لڑائیاں اتوار کو دوپہر کے بعد ہوتی تھیں۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ کھیل مفت تھا۔ اونٹوں کی زد سے بچ کر لوگ ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ دو لڑنے والے اونٹوں کو میدان میں لا کر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ان کی ظاہری اطاعت پذیری اور حلم لوگوں کے لئے گمراہ کن ہیں کیونکہ لڑنے والے اونٹ بڑے سفاک ہوتے تھے اور بڑے غصے سے لڑتے تھے۔ پہلے وہ ایک دوسرے کی گھات میں ادھر ادھر پھرتے تھے اور بڑی عجیب و غریب آوازیں نکالتے تھے۔ پھر وہ بڑے وحشیانہ طریقے سے ایک دوسرے کو ٹانگیں مارتے اور کاٹتے تھے۔ زیادہ دیر وہ اپنی لمبی گردنوں سے ہی لڑتے تھے۔ ان کے سروں سے خون بھی نکلنا شروع ہو جاتا تھا۔ لڑائی اس وقت تک جاری رہتی تھی جب تک ان میں سے ایک میدان چھوڑ کر بھاگ نہ نکلا۔ غصے میں بھرا ہوا اس کا مالک اونٹ کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ جیتنے والا اونٹ میدان میں فاتحانہ طور پر بھاگتا تھا اور خوشی سے

غراتا تھا۔ اس کا مالک اسے کھینچ کر باہر لے جاتا تھا تاکہ میدان اگلی لڑائی کے لئے خالی ہو جائے۔ لوگ شرطیں لگاتے تھے اور ہارنے والے کا تمسخر اڑاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے چھوٹے کھیل تھے جیسے مرغوں کی لڑائی' بٹیوں کی لڑائی اور کشتی پرندوں کی لڑائیاں صاف ستھری ہوتی تھیں اور ان بھیانک لڑائیوں سے مختلف ہوتی تھیں جو میں نے بعد میں ملایا میں دیکھیں تھیں۔ وہاں مرغوں کی ٹانگوں پر استرے کی طرح تیز لمبی مہمیزیں لگا دیتے تھے اور ایک مرغا منٹوں میں مر جاتا تھا۔ ہمارے پرندے صرف ننگے پنجوں سے لڑتے تھے اور لڑائیاں بھی لمبی ہوتی تھیں۔ یہ اس وقت تک چلتی تھیں جب تک ہارنے والا بھاگ نہ جائے ان لڑائیوں میں کوئی مرتا نہیں تھا۔

مظفر گڑھ میں زندگی ہمیشہ ہموار نہیں تھی۔ شہر میں اس وقت بڑا ہنگامہ ہوا جب ہمارا ایک ہم جماعت قتل ہو گیا۔ وہ میونسپل کمیٹی کی ایک بیوہ دائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دائی ایک نوجوان عورت کا بچہ پیدا کرانے گئی لیکن عورت زچگی میں ہی مر گئی۔ لڑکی کے والد نے جس کی وہ اکلوتی اولاد تھی' اس معاملے پر مریضانہ طریقے سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ سارا قصور دائی کا ہے۔ لوگوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن سب ناکام رہے۔ اس کے شک نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی۔ ایک دن سکول بند ہونے کے بعد وہ دائی کے لڑکے سے ملا اور اسے بتایا کہ اس کی ماں نے اسے لانے کے لئے بھیجا ہے۔ لڑکا خوشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ مٹھائی کا لالچ دے کر وہ شخص لڑکے کو ریت کے ٹیلوں میں لے گیا۔ وہاں پانی کے ایک گڑھے کے پاس ذہنی طور پر مجبور اس شخص نے لڑکے کے منہ اور ناک میں کیچڑ بھر کر اس کی سانس روک دی اور وہ وہیں مر گیا۔ ایسا المناک اور ظالمانہ قتل اس شہر میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ جس دن مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا ہم سب اکٹھے ہو کر سیشنز جج کی عدالت میں چلے گئے۔ پنجابیوں میں ایسے عہدے پر پہنچنے والا سیشنز جج اپنے بند گلے کے سیاہ کوٹ اور سفید پگڑی میں بڑا رعب دار آدمی لگتا تھا۔ جب وہ فیصلہ سنانے کے لئے آیا تو اس نے اپنی پگڑی پر سیاہ رنگ کا کپڑا اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے "بھائی امیر چند" کے الفاظ سے ملزم کو مخاطب کر کے بڑی شستہ اردو میں تمام شہادت کا موثر تجزیہ کیا' فیصلہ سنایا اور اسے سزائے موت دی۔ امیر چند پر نہ سزا کے صدمے کا اثر ہوا اور نہ ہی اس نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ شاید وہ مقتول لڑکے کو بھول کر اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جج شاید اس بات سے متاثر ہوا اور اس نے بڑی نرمی سے امیر چند سے معافی مانگی۔

انگریزوں کو ایک جماعت کی صورت میں میں نے پہلی دفعہ مظفر گڑھ میں دیکھا۔ انگریز کبھی کبھار ہی نظر آتے تھے اور جماعت کی صورت میں تو شاید ہی کبھی نظر آئے ہوں۔ ان دنوں ایک انگریز رجمنٹ نے شہر سے باہر کیمپ لگایا ہوا تھا۔ پہلی شام کو انگریز سپاہیوں کو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اپنی سفید براق باہر جانے والی وردیاں پہنے' بھورے بالوں والے سروں پر اچھی طرح استری شدہ بڑے بانکپن سے ٹوپیاں رکھے اور چڑا چڑھی چھوٹی چھوٹی بیدوں کو بغلوں میں دابے' جب ہم نے پہلے دن دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہم بڑی احتیاط سے ان کے راستے سے ہٹ کر سکول کے احاطے کی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ نئی نئی پکی اینٹوں کی رنگت والے ان کے چہرے اور جلد کے وہ حصے جو نظر آ رہے تھے ہمیں بڑے عجیب لگے۔ زیادہ عجیب یہ تھا شکل و صورت میں وہ سب ایک جیسے لگتے تھے اور ہمیں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے افسران کو کیسے پہچانتے ہوں گے۔ کسی نے کہا کہ اس مقصد کے لئے ان کے نمبر ہوں گے۔ رفتہ رفتہ ہم نے ہمت کی اور ان سے انگریزی چھانٹنے کی کوشش کی لیکن طرفین میں سے کسی کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ ان کا لب و لہجہ اس انگریزی سے بڑا مختلف تھا جو ہمیں سکولوں میں سکھایا جاتا تھا۔ ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ان کی پرورش لندن کے غریب علاقے میں خاص طور پر فوج کے لئے ہوئی ہے۔ فوج کو بڑی تعداد میں ان کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ انگریزوں کی حرامی اولاد ہیں اور ان کو فوج کے لئے اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ جب ہم ذرا قریب ہوئے تو ہم نے ان کے ساتھ ہاکی اور فٹ بال کے میچ کھیلنے شروع کر دیئے۔ ہاکی میں ہم اچھے رہے لیکن ان کے ساتھ ننگے پاؤں فٹ بال کھیلنا مشکل تھا کیونکہ وہ بوٹ پہنتے تھے۔ بعد میں ان سے ہمارا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ طرفین نے ایک دوسرے کی انگریزی تھوڑی تھوڑی سمجھنی شروع کر دی تھی لیکن یہ دوستانہ اچانک ہی ختم ہو گیا۔ وہ طوائفوں کے بازار بہت جاتے تھے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے ایک نوجوان غیر رضامند لڑکی کو چاقو مار دیا۔ پھر ان کے لئے شہر جانا ممنوع ہو گیا۔ بعد میں وہ ہمیں کبھی نظر نہیں آئے۔

مظفر گڑھ میں والد کی تین سال کی تقرری کی مدت ختم ہو چکی تھی اور ہم تبادلے کا انتظار کر رہے تھے۔ حکم کسی دن بھی آ سکتا تھا۔ آئندہ تقرری کے بارے میں ہم دلچسپ اندازے لگا رہے تھے۔ کیا یہ تقرری جنگل میں کسی مقام پر ہو گی یا کسی شہر میں؟ اب ہم بڑے ہو رہے تھے چنانچہ ہماری تعلیم کے پیش نظر یہ ایک اہم سوال تھا کہ ہم کس مقام پر جائیں گے۔ حال ہی میں والد کا امپیریل سروس آف انجینئرز کے لئے انتخاب ہوا تھا۔ اس

سروس کی نگرانی سکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس ٹک دار آواز والے گاڑر میں میرے والد اپنی نئی تقرری کے انتظار میں تھے کہ ہمیں بہاولپور جانے کا حکم ملا۔ یہاں ان کی تقرری بطور سٹیٹ انجینئر کے پرسنل سیکریٹری کے ہوئی۔ یہ سٹیٹ انجینیر سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا جس کے تحت میرے والد پہلے بھی کام کر چکے تھے اور اسی نے میرے والد کی خدمات خود طلب کی تھیں۔ اگر مظفر گڑھ پنجاب کا برائے نام حصہ تھا تو بہاولپور تقریباً غیر ملک تھا۔ یہ بلوچستان' سندھ اور پنجاب کی سرحدی ریاست تھی۔ چنانچہ پنجاب چھوڑنے کے خیال سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ جب میرے والد نے جو تقرری کے مقام پر ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے' یہ اطلاع دی کہ ہمارے نئے گھر میں بجلی ہے تو ہم اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔ ہم نے بجلی ابھی تک صرف ریل گاڑیوں میں یا جب ہم کبھی کبھار لاہور جاتے تھے تو دیکھی تھی۔ پنجاب میں بہت کم شہر ایسے تھے جنہیں ۱۹۳۱ء سے پہلے اس جدت کے استعمال کا اعزاز حاصل تھا۔ بہاولپور میں ایک کالج بھی تھا اور باغات اور محلات تھے۔ بہاولپور میں ایک مال روڈ بھی تھی۔ پنجاب میں مال روڈ صرف لاہور' امرتسر اور راولپنڈی میں تھی۔ انگلستان میں اس سڑک کا مخرج اساطیری تھا لیکن ہمارے لئے یہ شہری زندگی کی عیاشی کی علامت تھی۔

بہاولپور ایک دلچسپ جگہ تھی جس میں برطانوی پنجاب کے برسوں پہلے ختم ہو جانے والے ماضی کی ایک جھلک موجود تھی۔ یہ غیر ترقی پذیر دنیا تھی جو سازشوں اور سفاکیوں سے معمور تھی جبکہ دوسرے علاقوں میں ان کی جگہ اصلاحات اور انصاف نے لے لی تھی۔ لیکن بہاولپور میں رنگ بھی تھا اور دھوم دھام بھی تھی۔ ہمارے لئے سنسنی خیز امر یہ تھا کہ یہاں اصل حکمران اس کا دربار اور اس کے محلات تھے۔ کئی صدیاں پہلے عباسی خاندان دور مغرب سے یہاں آیا تھا۔ نواب کا دربار اور خاندان ایک بہت بڑا دائرہ تھا جس کا مرکز خود نواب تھا۔ نواب کے خاندان کے افراد اور درباری کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ نواب کے والد کی کئی بیویاں تھیں اور ہر بیوی کے خاندان والوں نے لڑکی کی شادی کے بعد کام کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہ شاہی افتخار کا تقاضا تھا کہ وہ کام چھوڑ کر نواب کی سرپرستی میں آ جائیں۔ پھر نواب کے دادا کی متعدد بیویوں کے کئی خاندان تھے جن کے افراد ابھی زندہ تھے۔ نواب خود نوجوان تھا اور اٹھارہ سال کا ہونے سے پہلے ہی وہ کئی شادیاں کر چکا تھا۔ اس کی پہلی شادی اس کے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ مسلمانوں میں ماموں زاد سے شادی کا رواج ہے۔

نواب کے بہت قریبی خاندان کا ایک فرد ہمارے ساتھ سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ ہمارے

لئے خاصی دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا۔ اسے پڑھنے کے لئے سکول بھیجنا ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ استاد اس کو خوشامد کے طور پر نظر انداز کرتے تھے۔ امتحانوں اور تعلیم سے وہ بالکل بری الذمہ تھا۔ کام کو وہ شاہانہ نفرت سے دیکھتا تھا مگر کام کی کٹھنائیوں سے خوب واقف تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی کرتا تھا کیونکہ ہمیں امتحان پاس کرنے پڑتے تھے۔ وہ خود افسر تحصیل یعنی ایڈی کانگ بننے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس دوران وہ گاڑی چلانا سیکھنے' شکار کرنے اور لمبے وقتوں تک کام نہ کرنے کی اہلیت کے حصول پر بڑی محنت کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی جنسی اسرار اور جنس کی لامحدود مختلف صورتیں سیکھنے میں معروف تھا جسے وہ ذاتی لطف اندوزی کے علاوہ قابلیت کی شرط قرار دیتا تھا۔ باندیوں سے اپنی عشق بازی کے قصے وہ سکول کے بڑے لڑکوں کو سنا چکا تھا۔

باندی کے لغوی معنی ہیں بندھی ہوئی۔ یہ حرم کی خادمائیں تھیں جو عموماً خادماؤں ہی کی اولاد ہوتی تھیں۔ نوجوانی میں ہی وہ اپنے آقاؤں کی ہوس کا نشانہ بن جاتی تھیں۔ وہ ابتدائی جنسی مہم جوئی کی تلاش میں نوجوانوں اور ذائقہ بدلنے کے لئے بوڑھوں کے تر نوالے کی خواہش کا شکار ہو جاتی تھیں۔ وہ خاندان والوں ہی کے بچے پیدا کرتی تھیں اور ان کی شادیاں ان خادموں سے کر دی جاتی تھیں جو خود باندیوں کی اولاد ہوتے تھے۔ اس رواج کو برداشت کرنے کی بیگمات کے پاس کئی وجوہات تھیں۔ اس سے انہیں بلا معاوضہ خدمات حاصل ہو جاتی تھیں کیونکہ گھر کے ساتھ بندھے ہونے کی بنا پر باندیاں کہیں اور نہیں جا سکتی تھیں۔ اضافی فائدہ یہ تھا کہ اپنی عم زادیوں کے ساتھ جنسی تجربات کرنے سے اور طوائفوں کے پاس جانے اور وہاں سے بیماریاں لا کر اپنی ان نوجوان عم زادیوں تک جن کے ساتھ بالآخر ان کی شادیاں ہوتی تھیں' پہنچانے سے یہ رواج نوجوانوں کو روک سکتا تھا۔ باہر کا خون خاندان والوں کے خون سے مل کر باندیوں کو عموماً توانا اور خوبصورت بنا دیتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ باندیاں طویل المدت روابط کی قائل نہیں تھیں اور نہ ہی خاندان کے افراد پر انہوں نے کوئی اثر ڈالا۔ کئی ایسے واقعات نظر آتے ہیں جہاں خواتین یہاں تک کہ طوائفیں بھی حکمرانوں پر اثر انداز ہوئیں لیکن کسی باندی کا کسی امتیازی مقام پر پہنچنا کبھی سننے میں نہیں آیا۔

کوئی منتظمہ کسی عقلمند معمر باندی کی مدد سے ایک نوجوان کے راستے میں کسی نوجوان عورت کو کھڑا کر سکتی تھی۔ ہمارے سادہ ہم مکتب نے ایک غیر رضامند باندی سے اپنی پہلی واردات کو بڑے معرکے کے طور پر پیش کیا۔ لیکن جب اس نوجوان نے جو اب خاصا دلیر

ہو چکا تھا' معرکے سر کرنے شروع کئے اور اس کا اپنی جاگیر پر جانا ہوتا تو گاؤں والے اپنی لڑکیوں کو اس کے خوف سے گھروں میں چھپا دیتے تھے۔ اگر اس کا کسی لڑکی پر دل آ جاتا تو قوی امکان ہوتا تھا کہ وہ شادی کر کے اسے محل کی اونچی چار دیواری میں ڈال دیتا اور اگر اس کا دل بھر جاتا تو وہ اسے کچھ رقم دے کر والدین کو واپس کر دیتا۔ اس صورت میں اس لڑکی کے والدین صرف دانت ہی پیس سکتے تھے اور اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی سادگی اور غربت کی بنا پر وہ راضی برضا اور خوش رہتے تھے کہ ان کی لڑکی حرم میں رہ رہی ہے۔ کبھی کبھی کوئی رئیس تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے گھر کی کسی خاتون میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا تھا۔ ایسی توہین کا بدلہ خفیہ سازش عموماً زہر خورانی سے لیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر سازش کے پرزے بڑی تیزی سے مگر بڑی خاموشی سے حرکت کرتے تھے کیونکہ اگر دوسری پارٹی کے کان میں ذرا بھی بھنک پڑ جائے تو اس طرف سازش کے پرزوے پہلے پرزوں سے بھی زیادہ تیز حرکت میں آ سکتے تھے۔ بڑے پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک رئیس نے اپنے ایک نوجوان ساتھی کو چوری چھپے اپنے حرم سے نکلتے دیکھ لیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ابھی تک تو وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرتا رہا ہے لیکن اگلے دن اپنی اس روش کو تبدیل کرنے والا ہے۔ اب وہ آدمی کا شکار کرے گا۔ تمام خادموں کو حکم مل گیا کہ وہ حاضر رہیں اور اس منظر کو دیکھیں۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ متعلقہ شخص کو زمین میں کمر تک گاڑ کر وہ اس پر کتے چھوڑ دے گا۔ متعلقہ شخص نے خطرے کو فوراً بھانپ لیا اب یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اپنی ناامیدی کی وجہ سے وہ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ دھمکیوں اور رشوت سے وہ اور اس کے دوست وہاں پہنچے جہاں نفرت اور محرومی کی آگ برسوں سے سلگ رہی تھی۔ اگرچہ گہرا زخم بظاہر مندمل ہو چکا تھا اور لوگ اسے بھول بھی گئے تھے' لیکن موقعہ ملنے پر زخم پھر کھل گیا اور بہہ نکلا۔ مدتوں سے انتقام کے پیش نظر سنبھال کر رکھے ہوئے زہریلے تیر نے رئیس کو زخمی کر دیا۔ کہانی بتاتی ہے کہ رات کے پہلے پہر چوکیداروں کے ڈیوٹی پر حاضر ہونے سے پہلے یعنی اپنے اعلان کے صرف چھ گھنٹے بعد وہ رئیس زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا اور پانی کے لئے التجا کر رہا تھا۔ لیکن ہر قسم کی مدد بے رحمانہ طریقے سے روک دی گئی تھی۔ اس کا وارث' اگرچہ اس معاملے میں بالکل معصوم تھا' دوسرے دن بغیر کسی جھجک کے جاگیر کا مالک بن گیا۔ طاقت کی غیر مترقبہ نعمت نے معاملے کو چھان بین اور تفتیش اور انتقام کے تمام خیالات پس پشت ڈال دیئے۔ دانائی بھی واقعہ کی محتاط قبولیت کی متقاضی تھی کیونکہ معاملے کی چھان بین شاید

بے جگری سے پانسہ پھینکنے کی کوشش کو پھر ابھار سکتی تھی اور ساتھ ہی اقتدار بھی داؤ پر لگ سکتا تھا۔ حرم کی اونچی اونچی دیواروں اور زبردست پہرے کے اندر رہتے ہوئے ایسے موقعوں پر مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ مکاری اور دلیری سے مردوں کا ساتھ دیتی تھیں۔

حرم کی خواتین زبردست پردے میں رہتی تھیں۔ ہمارے بہاولپور میں آمد کے بعد جلد ہی ہم نے سنا کہ حرم کی بیگمات بہاولپور سے اپنے پرانے خاندانی مقام پر جانے والی تھیں۔ ایسے موقعوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے برسوں کی ڈرل نے پولس کی بڑی اچھی تربیت کر دی تھی۔ منادی کرنے والے جہاں کہیں بھی ڈھول بجاتے لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مقررہ دن کو بعد دوپہر کوئی شخص اس سڑک پر نظر نہ آئے جو محل سے ریلوے سٹیشن کو جاتی ہے اور نہ ہی ان سڑکوں پر جو اس سڑک سے آکر ملتی ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے کوئی آدمی نظر نہیں آنا چاہئے۔ یہ حکم عورتوں پر بھی نافذ ہوتا تھا تاکہ حیلہ سازی کا ہر قسم کا امکان ختم ہو جائے۔ ان لوگوں کو بھی جن کے گھر دور تھے مگر وہاں سے سڑک نظر آ سکتی تھی' یہی ہدایت تھی کہ وہ اپنے اپنے گھروں کی پہلی منزل پر ہی رہیں۔ یہ سارے انتظامات اور احتیاطیں اس امر کے باوجود کی جاتی تھیں کہ بیگمات تو ایسی پردے والی کاروں میں سفر کرتی تھیں جن سے سڑک بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔

مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے پولیس حرکت میں آ جاتی تھی اور لوگوں کو سڑکوں پر سے ہٹا دیا جاتا تھا۔ جن گھروں کے دروازے یا کھڑکیاں سڑک سے نظر آ سکتی تھی' وہ بھی بند کر دی جاتی تھیں۔ پولیس والے سیٹیاں بجاتے تھے اور جو کوئی بھی دور سے نظر آ جائے اسے ڈانٹتے تھے۔ جلد ہی سڑک پر ناقابل تصور خاموشی چھا جاتی تھی۔ ہم دونوں بھائی اپنے تجسس کو قابو میں نہ رکھ سکے اور دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ہم چھت پر چلے گئے اور منڈیروں کے پیچھے چھپ کر سوراخوں سے دیکھنے لگے۔ ہماری والدہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ہمیں نیچے بلایا لیکن ان کو کھلی سیڑھیوں سے اوپر آنے کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہی انہوں نے زور سے آواز دینے کی جرات کی۔ خطرہ تھا کہ کہیں پولیس والے ان کی آواز نہ سن لیں کیونکہ بیگمات کے سفر کا مقررہ وقت آن پہنچا تھا۔

اچانک پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ سیٹی بجانے کے بعد ہر پولیس والا سڑک کی طرف پیٹھ کر کے اور سر جھکا کھڑا ہو جاتا تھا۔ مخصوص سیاہ شیشوں والی موٹر گاڑیوں کا قافلہ جس میں سامنے والے شیشے کو چھوڑ کر ہر گاڑی کے گرد موٹی چادریں تانی ہوئی تھیں' سڑک پر

تیزی سے سفر کرنے لگا۔ ڈرائیور اور گاڑی کے پچھلے حصے کے درمیان جہاں خواتین بیٹھی ہوئی تھیں' پارٹیشن پر بھی پردہ لگا ہوا تھا۔ اسی طرح گاڑی کے پچھلے شیشے پر بھی پردہ لگا ہوا تھا۔ جب یہ جلوس نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پولیس والوں نے دوبارہ سیٹیاں بجائیں اور زندگی نے پھر سڑکوں پر رینگنا شروع کر دیا۔ ریلوے سٹیشن پر یہ گاڑیاں باپردہ ریلوے پلیٹ فارم پر رکیں جو اسی مخصوص مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں بھی بڑی اونچی تھیں۔ کاریں پلیٹ فارم پر منتظر نجی سیلوں تک پہنچیں جن کی کھڑکیوں پر جھلمل پردے لگے ہوئے تھے۔ اگلی گاڑیوں سے کچھ بوڑھی باندیاں نکلیں اور کاروں اور ریل کے ڈبوں کے درمیان دونوں طرف چادروں سے پردہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ اس اثنا میں ڈرائیور گاڑیاں چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ بیگمات بحفاظت ریل کے ڈبوں میں پہنچ گئیں تو ڈبوں کے دروازے بند کر دیئے گئے اور پولیس والے اپنی پشتیں ڈبوں کی طرف کر کے پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ جلد ہی ایک ریلوے انجن آیا اور ان ڈبوں کو لے گیا۔ دوسری طرف بھی جو بیگمات کی منزل تھی' ایسے ہی انتظامات کئے گئے تھے۔ جب یہ بیگمات محل میں پہنچ گئیں تو ان کی واحد سالانہ سیر بھی اختتام کو پہنچی۔ صرف یہی ایک سیر تھی جو بیگمات کو میسر تھی۔

رواج کے مطابق نواب کی بہنوں کو شادی کی اجازت نہیں تھی۔ شمالی ہند میں بیوی کے بھائی کو سالا کہا جاتا ہے۔ کسی وجہ سے یہ گالی بن گیا ہے۔ چنانچہ نوابوں کے لئے کسی کا سالا کہلانا بہت بڑی توہین تھی اور اس لئے وہ بہنوں کی شادی نہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ان کو محل میں رکھ کر وہ کسی بدنامی کے امکانات کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں صحرا میں ایک ناقابل رسائی قلعے میں بھیج دیا جاتا تھا۔ سخت حفاظتی پہرے میں وہ قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتی تھیں۔ وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھیں اور اپنے بچپن کی یادوں پر زندہ رہتی تھیں۔ ان کی زندگیوں میں خوشی کے وہی لمحات تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ان کے رشتے دار بھی کم ہی آتے تھے۔ یوں ناکارہ ہو جانے کے بعد قلعے کے کارندے بھی انہیں کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ اس قلعے میں زندہ درگور خواتین کے متعلق عجیب و غریب افسانے سننے میں آتے تھے۔

دراوڑ کے قلعے کو بنے صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہ قریبی شہر سے چھبیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے چاروں طرف لق و دق صحرا ہے جس میں کوئی سڑک نہیں۔ ہرنوں کے ریوڑوں اور خانہ بدوش اونٹوں والوں کے علاوہ یہاں زندگی کا کوئی نشان نہیں۔ ہم ایک

دفعہ وہاں گئے تھے۔ ہمارے پاس نئی ماڈل کی فورڈ گاڑی تھی۔ اپنے ہلکے وزن اور اونچے جسم کے ساتھ صرف یہی گاڑی یہ سفر کر سکتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کے پہیے ریت میں دھنس جاتے تھے اور ہمیں باہر نکل کر دھکا لگانا پڑتا تھا یا اوپر اٹھا کر انہیں ریت سے باہر نکالنا پڑتا تھا۔ ہرن بڑی معصومیت سے ہمیں دیکھتے تھے اور ہماری کسی حرکت پر اپنے خوبصورت جسموں اور مضحکہ خیز دبلی ٹانگوں کے ساتھ ٹیلوں اور جھاڑیوں پر سے چھلانگیں لگا کر بھاگ جاتے تھے۔ اونٹوں اور دبلے انسانوں کے اس ویران علاقے میں ان کا موٹاپا بڑا عجیب لگتا تھا۔ جب ہم ایک پہاڑی کے کنارے پہنچے تو دراوڑ اچانک ہی صحرا سے ابھر آیا۔ یہ ایک شاندار قلعہ تھا جسے پتھر اور پکی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی دیواریں ریت میں سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ لکڑی کے بڑے دروازے سے گزر کر آپ ایسے منظر پر پہنچ جاتے تھے جو صدیوں پرانا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر' تنگ بل کھاتی گلیاں' لوگ اپنے لدے ہوئے گدھوں یا اونٹوں کے پیچھے پیچھے ایسا منظر تھا جو پنجاب میں نظر آنے والی قدیم شے سے بھی قدیم تر تھا۔ مرد لمبے تڑنگے تھے۔ ان کے نقوش تیکھے اور چہروں پر گھنی داڑھیاں تھیں۔ وہ ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں سروں پر لپیٹے ہوئے تھے اور سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلواریں اور لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی عورتیں پتلی اور لمبی تھیں اور مردوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے بڑی نمایاں تھیں۔ کچھ مردوں کے پاس تلواریں تھیں اور کچھ کے پاس توڑے دار بندوقیں۔ ہم ایک خاندان کے قریب سے گزرے جو بہت ہی دلکش تھا۔ مرد لمبا اور سیدھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی' ایک بچہ اور اونٹ تھے۔ اس کی پگڑی پر سرخ اور سفید رنگ کا ہاتھ کا چھاپا تھا۔ وہ سفید قمیض پہنے ہوئے تھا جو اس کے گھٹنوں تک آتی تھی اور اس پر سرخ پھندنوں اور سفید بٹنوں والی زنجیر تھی۔ اس نے سرخ مخمل کی واسکٹ پہنی ہوئی تھی جس کی جیبوں اور کناروں پر سنہری بارڈر تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں میں تلے دار جوتی تھی۔ سرخ مخمل کے نیام میں اس کی تلوار اس کی کمر سے لٹک رہی تھی۔ اس کی گود میں شاندار کپڑوں میں ملبوس اس کا بیٹا تھا۔ بچے کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ اس کے بال اپنے باپ کی طرح کالے' لمبے اور گھنگریالے تھے اور اس کے شانوں تک پہنچتے تھے۔ ان کو کنگھی کرنے کے بعد کانوں کے پیچھے سے گزار کر پگڑی میں سے ایک کلغی کی شکل کی میں باہر نکالا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کا محراب دار منہ سرخ تھا' آنکھوں میں کاجل تھا اور بالوں کو اس نے مینڈھیوں کی صورت میں گوندھا ہوا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے چل رہی

تھی۔ اس نے اپنی اونٹنی کی نکیل پکڑی ہوئی تھی۔ جو رنگ برنگے پھندنوں سے سجی ہوئی تھی ان کے اونٹ کا پالان بھی رنگین اور سجا ہوا تھا۔ وہ شاید کسی شادی پر جا رہے تھے۔

دراوڑ کی آبادی بہت تھوڑی تھی کیونکہ یہاں پانی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سال میں کبھی کبھار ہونے والی بارش کا پانی زمین دوز جوہڑوں میں اکٹھا کر لیتے تھے۔ شاہی دوشیزاؤں سے علیحدہ قلعے میں کئی ایسے لوگ بھی رہتے تھے جنہوں نے نواب کو وقتی طور پر ناراض کر دیا تھا۔ انہیں یہاں بند کر دیا گیا تھا اور یہاں رہتے ہوئے انہیں کئی سال گزر چکے تھے اور شاید لوگ انہیں بھول بھی چکے تھے۔ قلعے کا گورنر جو قلعے میں رہنے والوں کی نسبت کسی طور بھی بہتر حالات میں نہیں تھا' اپنے آپ کو انہی ناکارہ لوگوں میں سے سمجھتا ہو گا۔ یہ کوئی خوش گوار تعیناتی نہیں تھی۔ ممکن ہے یہ اس کی کسی کوتاہی کا نتیجہ ہو یا پھر کسی مخالف کی سازش کا شاخسانہ ہو۔ تو یہ تھا دراوڑ جو بہاولپور اور مغربی راجستھان کے خوبصورت قلعوں میں سے تھا۔

نواب محمد صادق خان ترشے ہوئے خد و خال والا خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ اپنے لوگوں کی طرح کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے بال بھی لمبے اور گھنگریالے تھے اور اس کی پگڑی میں سے لٹوں کی صورت سے باہر نکلتے تھے۔ وہ ذہین اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور شاید اپنی خاندانی روایات کے خلاف وہ لڑا بھی تھا۔ توانائیوں کے استعمال کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے وہ قدرے بے چین اور تنک مزاج تھا مثلاً وہ اس شخص کو ڈانٹتا تھا جو اس کے گزرنے پر تانگے سے نہیں اترتا تھا۔ اس کی موٹر گاڑیوں میں ایک خاص قسم کا ہارن لگا ہوتا تھا۔ یہ ربڑ کے ایک بڑے گولے' ایک کروم شدہ لمبی نالی جو گاڑی کے باہر فٹ ہوتی تھی اور گاڑی کے مڈگارڈ پر لگے ہوئے ایک مگرمچھ کے منہ کی شکل کے ہارن پر مشتمل تھا۔ اس سے گہری مترنم آوازیں نکلتی تھیں اور حکم یہ تھا کہ اس کی آواز سنتے ہی ہر شخص اپنی سواری سے اتر کر سڑک کے کنارے مؤدب کھڑا ہو جائے۔ بعض اوقات اس کی تیز رفتار گاڑی اپنے پیچھے گرد کے اتنے بادل چھوڑتی ہوئی جاتی تھی کہ اس کا پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔ تاہم یہی احسن خیال کیا جاتا تھا کہ حکم کی تعمیل کرنا ہی بہتر ہے کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں پیچھے دیکھنے والے شیشے سے اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ ایک دفعہ اس نے اس معمولی قسم کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہ کرنے پر ایک شخص کی بید سے پٹائی کر دی تھی۔ وہ خود بڑا پرکشش اور خوش اخلاق تھا اور دوسروں میں اس کی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے اپنی والدہ کو تانگے سے واقعی کھینچ کر اتارا اور اپنی عین وقت کامیابی پر

خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے پاس بڑی شاندار گاڑیاں تھیں: آرمز سٹرانگ سڈلے' ڈیملر اور رولز رائس اور سب کی سب اس کی فرمائش پر بنائی گئی تھیں لیکن لوگوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ بڑی تیز رفتار اور بے آواز تھیں اور چونکہ نواب اپنے مضافاتی محل اور بہاولپور کے درمیان دن میں اکثر گھومتا رہتا تھا اس لئے بڑا ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ لوگوں کے آداب میں اس کی دلچسپی جلد ہی کم ہو گئی اور پھر اس نے پرواہ نہیں کی کہ اس کے گزرنے پر لوگ مودب کھڑے ہوتے ہیں کہ نہیں۔

جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اسے گدی دینے پر حکومت ہند رضامند ہو گئی۔ اسے گدی پر بٹھانے کی رسم ادا کرنے کے لئے وائسرائے ہند خود بہاولپور آیا۔ اس موقعے پر بڑی تیاریاں کی گئیں۔ ریلوے سٹیشن کو جہاں وائسرائے کو اپنی سپشل ٹرین سے پہنچنا تھا' رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا۔ وہ راستہ بھی جس پر سے اسے گزرنا تھا' بڑی محنت اور احتیاط سے صاف کیا گیا اور اسے محرابوں' پودوں' جھنڈوں اور پھولوں کے ہاروں سے سجایا گیا۔ مہمان خانے کو بھی نئے سرے سے آراستہ کیا گیا۔ بڑے دربار کے لئے تیاریاں کی گئیں جہاں وائسرائے نے حکمران کو پورے اختیارات تفویض کرنے کی رسم ادا کرنی تھی۔ رات کو ایک بڑی ضیافت کی تیاریاں ہونے لگیں جس میں وائسرائے' انگریز افسر اور ان کی بیویاں مدعو تھیں۔ اس ضیافت کے لئے گوآ کے خانسامے' بیرے اور کھانے کا سامان اڑھائی سو میل دور لاہور سے منگوایا گیا تھا۔ کھانا انگریزی تھا جس میں سوپ' ڈبے کا پیٹ اور ڈبوں میں بند سامن مچھلی' سفید ساس' کئی قسم کے بھنے ہوئے پرندے' کارمل کسٹرڈ' کیمپ کی بوتل بند کافی اور ٹوسٹ پر سیوری تھے۔ ہندوستانی مہمان گوآئی کھانے سے بڑے ناامید ہوئے اور اسے بے مزہ قرار دیا۔ یہ سفید ساس کے ساتھ ابلی ہوئی مچھلی جس میں ابلے ہوئے انڈے ڈالے گئے تھے' نمک اور مسالوں کے بغیر گوشت اور بیکڈ پڈنگ پر مشتمل تھا۔ انہیں غیر مانوس چھریوں اور کانٹوں سے پیش کیا گیا۔ اس قسم کا کھانا ایسے اوزاروں سے کھانا واقعی مشکل تھا۔ ان کا دل محل کے خانساموں کے ہاتھ کے پکے ہوئے مسالے دار پیلے رنگ کے کھانوں میں تھا۔

دربار تہنیت اور اپنی وفاداری کے اظہار کا موقعہ تھا۔ نواب کو اعزازات عطا کئے گئے اور وہ ہز ہائنس نواب سر صادق محمد خان' کے سی آئی ای وغیرہ' ریاست بہاولپور کا حکمران بن گیا اور پندرہ توپوں کی سلامی کا حق دار قرار پایا۔ ریاست کے چالیس لاکھ سالانہ محصول سے تین لاکھ اس کا نجی خرچ طے پایا۔ مراعات اور ٹیکس سے چھوٹ کی مراعات بھی حاصل

ہوئیں۔ وائسرائے نے نوجوان نواب کے ترقی پسند نظریات کا بھی ذکر کیا۔ ایک دن پہلے اس نے لائبریری کا سنگ بنیاد بھی رکھا مگر اس کی تکمیل برسوں تک موخر رہی۔

اگلے دن مرغابیوں کا شکار تھا۔ بہت پہلے ہی تمام انتظامات پوری تفصیل سے کر لئے گئے تھے اور شکار ہونے والے پرندوں کی تفصیلات طے کر لی گئی تھیں۔ وائسرائے کے شکار کی تعداد سب سے زیادہ ہونا طے پایا۔ ان کی تعداد کئی سو مرغابیاں مقرر ہوئی۔ اس کے بعد نواب کی باری تھی جس کا شکار وائسرائے سے ذرا کم ہونا ضروری تھا تاکہ شکار میں وائسرائے کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت مہیا ہو سکے۔ یوں حفظ مراتب کی ترتیب انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہوئی شکاریوں کی فہرست کے اختتام تک پہنچتی تھی۔ لیکن اتنے بڑے شکار کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریوں کی ضرورت تھی۔ جھیلوں میں بڑے بڑے جال ڈال کر پرندوں کو پکڑا گیا اور بڑے آرام سے ان کے پر کاٹ دیئے گئے تاکہ کچھ دنوں تک وہ باآسانی اڑ نہ سکیں۔ سارے انتظامات ٹھیک تھے۔ شکار والے دن بڑی خونریزی ہوئی۔ ہزاروں پرندے شکار کئے گئے۔ مردہ پرندوں کی ڈھیریاں لگا کر شکاری کپڑوں میں اپنے اپنے شکار کی ڈھیری کے پاس اپنی بندوقوں پر جھکے ہوئے وائسرائے' نواب اور دوسرے شکاریوں کی تصویریں اتاری گئیں اور فلمیں بنائی گئیں۔ بمبئی سے فلم بنانے والوں کی ایک پارٹی منگوائی گئی تھی تاکہ گدی سنبھالنے کی تقریبات کی فلم بنائی جا سکے۔

یہ تھی حکمران خاندان کی دنیا۔ یہ ماضی کی دنیا تھی جس میں حال کا عنصر صرف رولز رائس گاڑیاں' کبھی کبھار یورپ کی سیر' اور محلات کے لئے چند نمائشی چیزوں کی خریداری تھے۔ منظور نظر آتے تھے اور منظور نظر چلے جاتے تھے۔ وہ راتوں رات اقتدار حاصل کرتے تھے اور راتوں رات فارغ بھی کر دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بڑا قابل احترام بزرگ جو ان پڑھ تھا مگر تھا بڑا زیرک' بڑا طاقتور ہو گیا۔ چھوٹی سے چھوٹی ملازمت کے لئے بھی اسی کی سفارش چلتی تھی۔ ہر معاملے کا فیصلہ وہی کرتا تھا اور اس کے حکم کے بغیر کوئی ہل نہیں سکتا تھا۔ لیکن ایک دن بعد دوپہر اسے حکم ملا کہ وہ آنے والے چند گھنٹوں میں ریاست سے باہر نکل جائے۔ آدھی رات کو مفلسی اور ناداری میں وہ ملتان پہنچا اور پھر جلد ہی بھلا دیا گیا۔

لیکن تقدیر کا چکر کبھی رکتا نہیں۔ ایک دن کوئی شخص بلندیوں پر ہوتا تھا اور اگلے دن عین زمین پر نظر آتا تھا۔ جنہیں اقتدار ملتا تھا وہ اس کا انجام بھی جانتے تھے اور اسے بڑے

فلسفیانہ انداز میں قبول کرتے تھے۔ جو اقتدار سے محروم ہو جاتے تھے وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کی جی جان سے کوشش کرتے تھے۔ اور جو اقتدار کی بلندیوں پر پہنچ جاتے تھے وہ تقدیر کے اس چکر کو روکنے کی جان توڑ کوشش کرتے تھے۔ سازشوں کے کھیل ہارنے یا جیتنے کے لئے نہیں کھیلے جاتے تھے۔ یہ کھیل برائے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ ریاست کے ایک اکاؤنٹنٹ جنرل کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص لینا چاہتا تھا۔ یہ ایک علیحدہ معاملہ تھا کہ امیدوار اس مقام پر فائز ہونے کی ضروری شرائط پوری نہیں کرتا تھا۔ موجودہ شخص بڑا ایماندار اور راستباز تھا۔ اس کے خلاف چپکے سے یہ بات اڑا دی گئی کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ ایک دن بڑا مصروف دن گزارنے کے بعد جب وہ دفتر سے جانے لگا تو چیکوں کا ایک بڑا بنڈل اس کے توثیقی دستخطوں کے لئے آ گیا۔ ڈیوٹی پر موجودہ کلرک نے جو سیاہی چوس لئے کھڑا تھا' بڑی چالاکی سے ان تمام چیکوں پر اس سے دستخط کرا لئے۔ ان میں ایک چیک ایسا بھی تھا جو بڑی ہوشیاری سے اتنی کثیر رقم کے لئے بھرا گیا تھا کہ اگر وہ خزانے سے نکل جاتی تو خزانہ آئندہ کئی برسوں کے لئے خالی ہو جاتا۔ افسر خزانہ نے وہ چیک فوراً واپس کر دیا۔ نواب کو اطلاع دی گئی کہ مالی معاملات شدید خطرے میں ہیں اور مذکورہ چیک شہادت میں پیش کر دیا گیا۔ وہ چیک ثبوت تھا کہ متعلقہ بوڑھا افسر از کار رفتہ ہے اور اسے اتنے ذمہ دار عہدے پر رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس بیچارے کو فوراً سبکدوش کر دیا گیا۔

ایسا ہی معاملہ ایک وزیر کا تھا۔ وہ کورا ان پڑھ تھا لیکن اس نے الٹے سیدھے دستخط کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ صاف انکار کر دیتا تھا کہ ایسی ہدایات اس نے صادر کی تھیں۔ ایک دفعہ کوئی غلطی ہو گئی اور اسے اس کا تحریری حکم نامہ دکھایا گیا جس پر اس کے دستخط موجود تھے۔ اس نے وہ حکم نامہ دیکھنے کے لئے کاغذ طلب کیا۔ کاغذ لے کر اس نے اسے اپنے چہرے کے سامنے رکھا اور اپنی زبان سے سیاہی چاٹ کر اپنے دستخط صاف کر دیئے۔ اس کے بعد اس نے کلرک کو سرزنش کی کہ اس نے ایسا حکم کبھی جاری نہیں کیا۔ پھر سکولوں کا ایک انسپکٹر تھا جس کی تعلیم صرف اتنی تھی کہ اس نے بھی الٹے سیدھے دستخط کرنے سیکھ لئے تھے۔ ایک شخص ہسپتالوں کا انسپکٹر جنرل ہونے سے پہلے جیل خانوں کا انچارج تھا۔ کسی ملازمت کے لئے اس کا اہل ہونا یا ضروری شرائط پوری کرنا بے معنی تھا۔ ضروری شرائط کی عدم موجودگی کسی ملازمت کے حصول میں کبھی حائل نہیں ہوتی تھی۔ ضروری چیز ہمت اور اثر و رسوخ اور یہ یقین دہانی

تھی کہ امیدوار سب کچھ کر سکنے کا اہل ہے۔

پنجاب کے مقابلے میں کم از کم کاغذ پر ریاست کا نظم و نسق بڑے ترقی یافتہ خطوط پر استوار تھا اور برسوں آگے تھا۔ اگر اس قسم کا گروہ کابینہ کہلا سکتا ہے تو ریاست کے وزرا کی ایک کابینہ بھی تھی۔ ہر شخص نواب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا تھا اور ہر شخص دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا تھا اور سازشیں کرتا تھا۔ داخلی معاملات' مال' قانون' رفاہ عامہ' اور ایسے ہی چند اور محکمے تھے۔ لیکن کسی محکمے کا ضابطہ یا طریق کار متعین نہیں تھا اور نہ ہی مشترکہ ذمے داری کا اصول کبھی نافذ ہوا۔ ان محکموں کے سیکریٹری بھی تھے جن میں ایک محکمہ خارجہ کا سیکریٹری بھی تھا جو ریاست کے بیرونی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا اگرچہ یہ معاملہ خالصتاً انگریز ریذیڈنٹ کی اقلیم تھی جس میں خود نواب بھی دخل نہیں دے سکتا تھا۔ ریذیڈنٹ آئرلینڈ کا خوش باش آدمی تھا جسے مارشل لا کے دنوں میں ڈپٹی کمشنر کا مکروہ نام ملا تھا۔ اس کی دلچسپیاں بھنے ہوئے بٹیر کھانا' وہسکی پینا اور اپنے گھٹیا کا خیال رکھنا تھا لیکن اس کا اصلی فرض حکمران کی نگرانی کرنا تھا' ریذیڈنٹ عموماً انتظام کی وافر صلاحیتوں کے مالک ہوتے تھے اور ایک دو مشیروں کے ساتھ وہ بڑا تعمیری اثر ڈال سکتے تھے۔ پنجاب میں ان کے رفقائے کار نسبتاً محدود اختیارات کے ساتھ ملک کی تعمیر نو کر رہے تھے لیکن یہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریذیڈنٹ ریاست کو محض بہاولپور میں نور محل جیسا ایک قدیم عجائب گھر ہی رکھنا چاہتا ہے۔ نور محل میں قرآن کا ایک مذہب نسخہ' ایرانی قالین' صدیوں پہلے دفن ہو چکے اجداد کی زرہ بکتریں اور تلواریں' موروثی چیزیں جن کے لئے خونریز لڑائیاں لڑی گئیں تھیں' نمائش کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ برطانیہ کے شاہی خاندان کے افراد کی روغنی تصویریں اور ریس کے گھوڑوں اور انعام یافتہ کتوں کی تصویریں بھی تھیں جو سکیچ اور ٹیٹلر جیسے جرائد سے کاٹ کر سنہری فریموں میں لگا کر لٹکائی گئی تھیں۔

وقت آنے پر ہم سارے بچے بہاولپور چھوڑنے پر بڑے اداس تھے۔ نواب صاحب' ان کی ہمیشہ تبدیل ہوتی ہوئی موٹر گاڑیاں' محلات' دربار' جلوس' ہاتھی اونٹ اور پولو' نیزہ بازی اور پھر محلاتی سازشوں کی کہانیاں' ان سب کو چھوڑ کر والد کے ساتھ ہم انگریزی تنظیم پر استوار کسی اور ضلع میں جانے والے تھے۔ زمانہ تو حرکت میں تھا۔ ہم نے اپنا تانگہ اور گھوڑی جس کا نام بجلی تھا بیچ دیئے تھے۔ یہ گھوڑی موسیقی پر مارچ کرتی تھی' دایاں پاؤں اٹھا کر سلام کرتی تھی اور ایک سٹول پر اپنے چاروں پاؤں رکھ کر کھڑی ہو سکتی تھی۔ ہم نے اپنی نئی تعیناتی کے لئے ایک نئی شیورلے کار کا آرڈر دے دیا تھا۔ اور امید تھی کہ شاید

ہم جہاں کہیں بھی جائیں گے ہمیں بجلی میسر ہوگی۔

میں بہاولپور سے گجرات چلا گیا جہاں میں نے نئے نئے قایم شدہ انٹرمیڈایٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو سال بعد میں لاہور چلا گیا اور اپنی ڈگری حاصل کرنے تک دو سال وہاں رہا۔

گیارھواں باب

داستان کے مطابق لاہور شہر رام کے بیٹے لو نے بسایا تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کش نے لاہور سے تیس میل دور قصور آباد کیا تھا۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لاہور شہر ہے بڑا پرانا۔ ہمارے دنوں میں دو لاہور تھے۔ ایک لاہور تو لاہوریوں کا تھا یعنی جو شہر کی فصیل کے اندر رہتے تھے اور دوسرا وہ لاہور تھا جو امن و امان کے رد عمل کے طور پر مضافات کی صورت میں پرانے لاہور کے اردگرد پھیل رہا تھا۔ یہ نیا لاہور پنجاب کا لاہور تھا اور یہی صوبے کی زندگی کا مرکز تھا۔ دونوں لاہور اپنی اپنی خصوصیات اور صورتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

پرانا لاہور تو ہو بہو گجرات ہی تھا مگر ذرا زیادہ وسیع اور ہموار۔ اس کی ایک فصیل تھی جس میں کئی دروازے تھے۔ اس فصیل کے اندر ایک قلعہ تھا اور اس کے محلے بھی فوجی لحاظ سے مستحکم تھے۔ ان کے لکڑی یا لوہے کے دروازے رات کو بند کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے کئی بازار تھے جو مختلف اشیائے فروخت سے مخصوص تھے۔ اس کے کپڑے، زیور، کشیدہ کاری، دھات کے برتنوں، گھریلو سامان، مچھلی، سبزی، خشک سامان خورد و نوش کی معروف اور پر ہجوم مارکیٹیں زندگی اور اس کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں۔ راوی کے پتن پر دہلی کو جاتی ہوئی بڑی سڑک پر واقع لاہور نے موج در موج لاتعداد حملہ آوروں کی پیش قدمیوں اور پسپائیوں کے صدمے سے ہوں گے لیکن مغلوب ہونا اس شہر نے کبھی نہیں سیکھا۔ شہر کے رہنے والے بھی انکسار اور تحکم کا ملغوبہ بن چکے ہیں۔ وہ طاقتور حملہ آوروں کے سامنے مسکین اور پسپا ہو کر اپنے زخم چاٹتے ہوئے واپس جانے والوں کے سامنے بڑے دلیر ہو جاتے ہوتے تھے۔

باقی پنجابیوں کی طرح اہل لاہور میں بھی کافی لچک تھی۔ دیہاتوں کے لوگ تو تتر بتر ہو جاتے تھے اس لئے اصلی نشانہ لاہور ہی ہوتا تھا جس نے صدمہ سہنا اور سہہ کر پھر کھڑے ہونا خوب سیکھ لیا تھا۔ اپنے اوپر ترس کھانا پنجابی سرشت کا حصہ کبھی نہیں بنا اور لاہوریوں کا تو قطعاً نہیں۔ کسی لاہوری کو لڑتے ہوئے دیکھنا اسے صحیح طرح سے جاننے اور درست

طریقے سے سمجھنے کا عمل ہے۔ جب تک لڑائی اس کے حق میں جا رہی ہوتی ہے وہ بڑا دلیر اور حملہ آور رہتا ہے لیکن جوں ہی اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی دیکھتا ہے تو وہ فوراً موقع شناس اور مجسم معقولیت بن جاتا ہے۔ "او بادشاہو آپ سنتے کیوں نہیں' ناراض کیوں ہو رہے ہو' میں تو آپ کے بھلے کی بات کر رہا ہوں"۔ اور اگر ہوا ذرا سی بھی اس کے حق میں بدلے تو "دیکھو بھائی دیکھو' اندھیر ہو گیا ہے۔ میں تو اس کے بھلے کی بات کر رہا ہوں اور یہ میرے سر پر سوار ہو رہا ہے۔ مجھے غصہ چڑھ رہا ہے۔ مجھے پکڑ لو"۔ وہ حملہ آور کے سامنے جھک جاتا تھا اور اسے سرہند تک جانے دیتا تھا۔ حملہ آور کے ساتھ وہ بڑا اچھا سودا کر لیتا تھا۔ لیکن اگر دفاع کرنے والوں کی چوٹ کھا کر حملہ آور لڑکھڑاتا ہوا واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوتا تھا تو یہ اس کی جیب بھی کاٹ لیتا تھا۔

شہر کے اندر لاہور کی زندگی خود کفیتی تھی۔ لاہوری اپنے محلے میں پیدا ہوتے تھے' وہیں بڑے ہوتے تھے اور وہیں شادیاں کرتے تھے۔ مرنے پر وہ راوی کے کنارے رامو باغ کے شمشان گھاٹ چلے جاتے تھے۔ وہ دیہاتوں سے منقطع ہو چکے تھے اور یہ ضرب المثل تھی کہ لاہور کے بچے پوچھتے تھے کہ گندم کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے۔ مصیبت کے وقت شہر اپنے خول میں بند ہو جاتا تھا۔ ہر گھر میں گندم' گھی اور شکر کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ہر محلے کا اپنا کنواں تھا۔ محلوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے اور ان میں بڑے مضبوط ارل ڈال دیئے جاتے تھے محلے کے محافظ ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ ہر گھر میں ابلتا ہوا تیل اور پانی موجود رہتا تھا۔ مصیبتیں لاہور کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ ان ساٹھ برسوں میں یعنی جب سے انگریزوں نے سکھوں کے ہاتھ سے لاہور چھینا اور ۱۹۱۹ء میں مارشل لا لگنے تک لاہور میں مسلسل امن رہا۔ اس کے بعد وہی مصائب والی زندگی شروع ہو گئی: پہلے مارشل لا' پھر فرقہ وارانہ فسادات جو ۱۹۴۷ء میں وسیع رستا خیز پر ختم ہوئے۔ اس وقت ہمارا جانا پہچانا محبوب لاہور ختم ہو چکا تھا۔

اگرچہ لاہوریوں کی اور ہماری ذاتیں اور ذیلی ذاتیں ایک ہی تھیں لیکن لاہوری بڑے مختلف تھے۔ وہ باہر شادیاں نہیں کرتے تھے۔ ان کے رسم و رواج پر شہری چھاپ تھی۔ شادیوں پر لاہور میں دعوتیں نہیں ہوتی تھیں۔ جب لڑکی کے گھر بارات پہنچتی تھی تو ملنی کے بعد لڑکی والے باراتیوں کو جھک کر کہتے تھے "اچھا مہاراج"۔ اس پر سارے باراتی دروازے پر ہی سے واپس چلے جاتے تھے۔ دولہے اور اس کے قریبی رشتے داروں کو اندر بلا لیا جاتا تھا۔ لاہور والوں نے یقیناً سیکھ لیا تھا کہ ایسی ضیافتوں پر خوراک ضائع نہ کی جائے۔

لاہور کے امیر ترین لوگوں میں کچھ لوگ اپنے بخل کے لئے بڑے مشہور تھے۔ ایک خدمت خلق کرنے والے نے سرائے بنائی اور وہ کوڑھیوں اور بھکاریوں سے بھی آنے آنے اور پائی پائی تک کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ وہ اس بخل کے لئے بڑا مشہور تھا۔ لاہور سے باہر رہنے والے پوچھتے تھے کہ کیا آپ ایسے لوگوں میں شادی کریں گے' اگر اندرون شہر رہنے والوں سے تمہاری بیٹی کی شادی ہو گئی وہ تو بھوکی مر جائے گی۔ لیکن لاہور میں ایسے لوگ بھی تھے جو مختلف اضلاع سے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو کئی نسلوں سے اپنے اپنے رسم و رواج پر قائم تھے اور اپنے جیسے باہر کے خاندانوں میں یا اپنے آبائی اضلاع میں ہی شادیاں کرتے تھے۔ لاہوریوں اور غیر لاہوریوں میں شادیاں کرنا نیا نیا شروع ہوا تھا۔

گجرات کی طرح لاہور بھی پچھلے ایک ہزار برسوں میں بدل نہ سکا۔ اگر ہم بجلی کی سہولت کے نشانات کو نظر انداز کر دیں تو لاہور ویسا ہی لگے گا جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب بینٹنک نے رنجیت سنگھ سے اپنی ملاقات پر اسے دیکھا تھا یا جب بابر ابراہیم لودھی سے "ملاقات" کرنے کے لئے یہاں سے جلدی میں گزرا تھا۔ آگ سے جلنے اور گھروں کے گرنے' حملہ آوروں کی تباہی اور گھروں کی تعمیر میں آہستہ رو اور نظر نہ آنے والی تبدیلی سے قطع نظر یہ شہر ہمیشہ ایک جیسا ہی نظر آتا ہو گا۔ اگرچہ اس کا اسلوب گجرات والا ہی تھا مگر گجرات کے مقابلے میں یہ زیادہ گنجان تھا۔ ہوا اور روشنی کے ناکافی ہونے کی وجہ سے لاہوریوں کے چہروں پر ایک واضح پیلاہٹ نظر آتی تھی جو پنجابیوں کے لئے ایک غیر معمولی بات تھی۔ صرف مارکیٹیں ہی شہر میں کھلی جگہیں تھیں۔ یہ کشادہ اور وسیع تھیں اور انہی میں ایک مارکیٹ ہیرا منڈی تھی۔ یہ طوائفوں کا علاقہ تھا اور اسے خوش فکری کے پیش نظر ہیروں کی منڈی کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی تھی۔

گجرات میں تو طوائفوں کی صرف ایک گلی تھی لیکن یہاں تو پورا ایک محلہ تھا جس کے اپنے چوک' اپنی گلیاں اور اپنے کوچے تھے۔ دن کے وقت تو ہیرا منڈی سوتی رہتی تھی اور ویران لگتی تھی۔ لیکن سورج غروب ہونے کے بعد اس میں زندگی کی ایک خیرہ کن چمک آ جاتی تھی۔ پنجابیوں کی یہ پرانی روش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ ساری قوموں کے درمیانے طبقے کے کچھ لوگ طوائفوں سے ملحق گلیوں میں رہتے تھے۔ دوپہر ڈھلنے کے خاصی دیر بعد یہ لڑکیاں نیند سے بیدار ہوتی تھیں۔ گھر میں ادھر ادھر گھومتی تھیں' سارے مردوں کو گالیاں دیتی تھیں اور کبھی کسی مرد

کی تعریف بھی کر دیتی تھیں۔ اپنے کپڑوں اور سنگار کی چیزوں پر ایک نظر ڈالتی تھیں۔ کچھ اتر کر بازار میں اپنے بے سلیقہ چلنے کے ساتھ انہی کپڑوں میں بے مقصد گھومتی تھیں جن میں وہ سوئی تھیں۔ کچھ پان کی دکان پر کھڑے ہو کر پان کھاتی تھیں اور سگریٹ کے کش لگاتی تھیں۔ میراثی گویے اور کنجر بھی بازار میں گھومتے پھرتے تھے۔ ہوا خوری کے درمیان وہ ان لڑکیوں پر ایک آدھ جملہ بھی کس دیتے تھے جس کا جواب دینا یہ لڑکیاں خوب جانتی تھیں۔ آخر روٹی بھی تو وہی کما کر کھلاتی تھیں۔ بننے سنورنے کے لئے وہ آہستہ آہستہ واپس ہونے لگتی تھیں۔ بننا سنورنا بڑا محتاط اور لمبا کام تھا۔ جسم کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنا' نہانا اور کبھی کبھی پورے جسم کے بال صاف کرنا' جیسے کہ مسلمانوں کا رواج تھا' مہندی اور سرخی پاؤڈر لگانا' عطر لگانا' کنگھی چوٹی کرنا' کپڑوں کا اچھا انتخاب کرنا اور آخر میں چاندی کی سلائی سے آنکھوں میں سرمہ لگانا۔ اس طرح تیار ہو کر وہ اپنی ماں یا نائیکہ کا انتظار کرتی تھیں۔ مایوسی کے باوجود وہ اپنے گھر سے دور کسی آدمی کے گھر یا اس سے بھی زیادہ ہیجان افزا کسی خفیہ مقام پر ملاقات کی منتظر رہتی تھیں۔ لیکن ان کے لئے بہترین صورت یہ تھی کہ وہ ان کو کہیں دور کشمیر جیسے مقام پر چھٹیوں پر لے جائے جہاں وہ بظاہر گھریلو خاتون کی طرح نظر آئیں۔ اپنی کٹھن زندگیوں کے باوجود وہ بڑی بھولی تھیں اور جب تک انہیں امید رہتی تھی وہ محبت کے ایسے موقعے کے لئے دعا کرتی تھیں جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں نکلے۔ گو ایسا ہونا ناممکن تھا لیکن کبھی کبھی ایسا ہو بھی جاتا تھا اور جب ہو جاتا تھا تو یہ بڑی اچھی بیویاں ثابت ہوتی تھیں۔ ایک کالج کے پرنسپل نے جن کا لڑکا ہمارے ساتھ پڑھتا تھا' ایسی ہی شادی کی تھی۔ وہ اشراف میں سے تھا اور اس میں دہلی کے کلچر کی اسلامی کشش تھی۔ اس خاتون کا ابھی آغاز تھا اور وہ ابھی کالج میں ہی پڑھتا تھا جب اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ خاتون بڑی وفا شعار نکلی کیونکہ بیس برسوں کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں اپنے شوہر کے لئے پرستش کی جھلک نظر آتی تھی جو شاید اس کی اپنی تشویش کی غماز تھی۔ وہ خاتون غیر معمولی طور پر خوبصورت اور بڑی طرح دار تھی۔ دوپٹے قمیض اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس پھولوں والی جوتی پہن کر وہ واقعی اٹھارویں صدی کی مغل شہزادی لگتی تھی۔ ان کا لڑکا اپنے باپ کی طرح اونچا پورا تھا اور ان کی بیٹی ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ ان دونوں کی تربیت دلی والوں کی روایت پر ہوئی تھی۔ یہ بڑا دلکش خانوادہ تھا۔ ان کے ماضی کا علم ہونے کے باوجود سب لوگ ان سے ملتے ملاتے تھے۔ ہماری والدہ بھی ان سے ملنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھیں۔ ان کا بیٹا ہمارے ساتھ کھیلتا تھا۔ میرے

خیال میں ہماری والدہ سوچتی تھیں کہ ان کے گھر کھیلنا ہمارے اوپر اچھا اثر مرتب کرے گا۔ وہ اتنے مہذب تھے کہ اتنے مہذب ہم پنجابی کبھی نہیں ہو سکتے تھے۔

جیسے ہی شام کا اندھیرا گہرا ہوتا' گھروں میں روشنیاں ہونے لگتیں اور لڑکیاں اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر آ بیٹھتی تھیں۔ ان گھروں کے چار طبقے تھے۔ پہلا طبقہ تو مشہور و معروف گانے والیوں کا تھا۔ دوسرا ناچنے والیوں کا' تیسرا خصوصی طوائفوں کا اور چوتھا عام رنڈیوں کا۔ پھر ہر طبقے کے اندر بھی اپنے اپنے ذیلی طبقے تھے۔ مشہور گانے والیاں بڑے پر تکلف گھروں میں رہتی تھیں۔ ان کا کچھ احترام بھی کیا جاتا تھا۔ ان کے ناموں کے ساتھ بیگم یا بانو اور اگر وہ ہندو ہوں جیسے کہ بعض اوقات ہوتا تھا' تو بائی کا لاحقہ ہوتا تھا۔ ان کو شادیوں اور ایسے دوسرے خوشی کے موقعوں پر بلایا جاتا تھا۔ وہ ریکارڈنگ کمپنیوں اور بعد میں ریڈیو سے نغمے نشر کرتی تھیں۔ بعد میں انہوں نے فلموں میں پس پردہ گانا شروع کر دیا۔ ان کے گھر آنا جانا قطعاً معیوب نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں جو قدرے لمبا ہوتا تھا' آپ کا استقبال کرتی تھیں۔ کمرے کی چھت مزین اور دیواریں مصور ہوتی تھیں۔ فرش پر ایک موٹے گدے پر سفید چاندنی بچھی ہوتی تھی۔ دیواروں کے ساتھ رنگین مخملیں گاؤ تکیے رکھے ہوتے تھے۔ ساتھ پیتل کے چمکتے ہوئے اوگالدان اور منقش چھوٹی تپائیاں رکھی ہوتی تھیں۔ آپ آرام سے تکیے کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ گانے والی خود چاندی کے منقش پاندان سے آپ کے لئے پان تیار کرتی تھی۔ اسے روئی کی ایک معطر پھریری کے ساتھ چاندی ہی کی ایک خوبصورت طشتری میں رکھ کر اس کی خادمہ آپ کو پیش کرتی تھی۔

استقبال کے تکلفات اور تھوڑی سی دوستانہ گفتگو کے بعد اس کے سازندے آ جاتے تھے۔ ان میں ایک ہارمونیم' دوسرا سارنگی اور تیسرا طبلے والا ہوتا تھا۔ نغمے میں ان سب کی سربراہ مغنیہ خود ہوتی تھی۔ سارنگی اور طبلے کو باہم سر کرنے کے بعد سازندے اپنے اپنے ساز چھیڑتے تھے اور ساتھ ہی مغنیہ کے پھیلے ہوئے دائیں ہاتھ اور اس کی باہر نکلی ہوئی انگلی کو بڑے غور سے دیکھتے رہتے تھے۔ برسوں کی بے انتہا محتاط تربیت اس کو الفاظ کی ادائیگی کی بڑی ماہر بنا دیتی تھی اور اس کا تلفظ بھی بڑا خوبصورت ہوتا تھا۔ الاپ دس منٹ یا اس سے بھی زیادہ عرصے پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ اس دوران وہ نغمے میں استعمال ہونے والے سروں اور ان کی مخصوص ترکیبوں اور ان کی بار بار تکرار سے نغمے کے مکھڑے کا تعین اور نغمے کا خاکہ بڑے آرام اور سہولت سے پیش کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ اور اس کے سازندے نغمے کی لہروں کے ساتھ ساتھ بہنا شروع کر دیتے تھے۔ جس وقت وہ کچھ دیر کے لئے کسی

سر پر قیام کرتی تو ہارمونیم بھی وہیں ٹھہر جاتا تھا۔ طبلے کی آواز بھی ہلکی ہو جاتی تھی لیکن سارنگی اس کے اردگرد پھرتی رہتی تھی اور اسے متبادل سروں کی ترکیبوں کی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی یا پھر اسے نغمے کی درت لے کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی تھی۔ تیز تانوں اور میںڈوں کے دوران مغنیہ اور سارنگی والا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرخوشی میں کھو جاتے تھے۔ طبلے والا آہستہ آہستہ ان کو متوجہ کرتا تھا اور انہیں لے تبدیل کرنے کے لئے اکساتا تھا۔ سارنگی پس منظر میں چلی جاتی تھی، طبلے والا اس پر اپنی آنکھیں گاڑ دیتا تھا اور اسے نغمے کے طلسم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا تھا جسے خیال کہا جاتا ہے۔ ایک عظیم خیال (نغمہ) مغنی یا مغنیہ کا اپنا ہی عظیم خیال (تصور) ہوتا ہے جو اس کا نجی معاملہ ہوتا ہے اور دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ اسے سمجھنا سازندوں کے بس کی بات نہیں۔ جب وہ اپنے نغمے میں کھو جاتی تھی تو سازندوں کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس سر پر اور کس وقت واپس آئے گی۔ چنانچہ وہ پس منظر میں چلے جاتے تھے اور مداخلت نہیں کرتے تھے لیکن اسی کی واپسی کے لئے تیار رہتے تھے۔ طبلے والے کے چہرے پر مسکراہٹ لرزتی تھی اور وہ تال کے ہر سم پر اپنا سر بھی ہلاتا تھا۔ طبلے پر ہر ضرب پہلی ضرب سے بلند تر ہوتی تھی اور یوں وہ اسے اس طلسم سے باہر لے آتا تھا۔ سارنگی خوشی سے جھوم اٹھتی تھی کہ اس نے مغنیہ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ پھر خوشی سے لرزاں وہ مغنیہ سے گفتگو کرتی تھی اور نغمے کے اردگرد چکر کاٹتی تھی لیکن جب خیال اختتام کے قریب درت تانوں میں تحلیل ہونا شروع ہوتا تو مغنیہ کی تحسین میں وہ بھی تحلیل ہو جاتی تھی اور سازندے ایک تعطل میں پھنس جاتے تھے لیکن وہ جب ان کی طرف تھکی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھتی تو انہیں اطمینان ہوتا اور وہ بھی خوش ہو جاتے اور اس کی داد دیتے تھے۔

سامعین بھی جب نغمے کی رفعتوں سے اتر کر زمین پر آتے تو وہ بھی اپنے اپنے خوابوں سے بیدار ہو کر واہ واہ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ چاندی کے سکے گانے والی پر سے وار وار کر اسے پیش کرتے تھے۔ پھر نغمے کا شستہ تجزیہ اور اس پر تبصرہ شروع ہو جاتا تھا۔ نغمے پر گفتگو اردو زبان میں کی جاتی جس میں فارسی کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ پورے نغمے پر بڑی احتیاط سے تبصرہ ہوتا تھا۔ مغنیہ کی گائیکی کا انداز زیر بحث آتا تھا۔ نغمے کے الفاظ اور ان کی ادائیگی پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ وہ بولوں کے ایک مصرعے یا کسی غنائی ترکیب پر ماہرانہ گفتگو کرتے تھے اور مغنیہ کی ان ترکیبوں کی پیش کی ہوئی تعبیر پر اسے داد دی جاتی تھی۔ اسی اثنا میں خادم شربت اور وہسکی لے کر آ جاتا تھا۔ اگر بہت سردی ہو تو راجپوت۔ مغل شراب بھی آ

جاتی تھی جو زعفران، کبوتروں اور تیتروں کے خون اور دوسرے کئی مسالوں سے تیار کی جاتی تھی۔ اسے انگشتانے جیسے پیالوں میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے چند قطرے ہی جسم میں آسودگی اور حرارت کا احساس پیدا کر دیتے تھے جو جلد ہی پورے جسم میں پھیل جاتا تھا۔ سرد راتوں میں بھی اس کی حرارت انسان کو گرم رکھتی تھی۔ بڑے شستہ الفاظ میں گفتگو جاری رہتی تھی اور بحث اس پر ہوتی تھی کہ اگلی فرمائش دادرا ہو، ٹھمری، کجری یا کوئی اور خیال۔ راگ دن کے مختلف اوقات، صبح شام اور رات اور مختلف موسموں کے ساتھ منسوب تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کو دن کے کسی بھی حصے میں گایا جا سکتا تھا۔ ان کی خوبیوں اور کمزوریوں پر گفتگو ابھی جاری ہوتی تھی کہ طبلے پر آہستہ آہستہ تھاپ لگنی شروع ہو جاتی تھی اور مغنیہ کا داہنا ہاتھ پھر آہستہ آہستہ مرتعش ہونے لگتا تھا۔

ناچنے والیوں کے ہاں گانا بجانا اور خوب ہنگامہ ہوتا تھا اور شراب چلتی تھی۔ اگر یہ ناچنے والیاں نہ ہوتیں تو ہندوستانی رقص کا فن کبھی کا مر چکا ہوتا۔ وہ بڑی زندہ دل اور چالاک لڑکیاں ہوتی تھیں اور زندگی سے لطف اندوز ہونا خوب جانتی تھیں۔ وہ ناچتی تھیں اور عشق بازی کرتی تھیں کیونکہ ان کے مرتعش جسم سکون کے متقاضی ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بہت مشہور ہو گئی تھیں اور انہوں نے مشہور گانے والیوں کی طرح علیحدہ اڈے بنا لئے تھے لیکن وہ ان کے مقام تک پہنچ نہ پائیں۔

ان سے کمتر درجے کی طوائفیں، وقت سے پہلے ہی اپنی بھرپور جوانی میں اتنی تھکن کے باوجود خوبصورت تھیں۔ وہ اپنی اپنی بالکنیوں میں تیز روشنی میں بیٹھ کر نیچے گلی میں مردوں کے ہجوم کو دیکھتی رہتی تھیں۔ وہ یاسمین کے رنگ کی کشمیرنیں، گندمی رنگ کی پنجابنیں بھوری آنکھوں والی پہاڑنیں، بڑی نازک دلی والیاں، کسی ہوئی اور مغرور راجستان کی رہنے والیاں، شکرے کے حلئے والی بلوچنیں اور نیلی آنکھوں والی پٹھانیاں ہوتی تھیں۔ وہ قراقرم کے دروں سے لے کر کماؤں کی پہاریوں تک اور سری نگر کی تنگین سے لے کر اودھے پور کی جھیلوں تک سے آتی تھیں۔ وہ مختلف لباسوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔ ان کے بال بنانے کے انداز مختلف ہوتے تھے گلی میں چلتے مرد سر اٹھا اٹھا کر ان کو دیکھتے تھے اور انتخاب کرنے کی تذبذب میں مبتلا رہتے تھے۔ کوئی شخص فیصلہ کرنے کے بعد ہجوم کو چھوڑ کر بالا خانے کے زینے میں غائب ہو جاتا تھا جس میں صرف ایک چراغ جل رہا ہوتا تھا۔ جب وہ استقبالیہ کی تیز روشنی میں پہنچ جاتا تھا تو وہ لڑکی بالکنی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ کچھ جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا جبکہ خادمہ ایک کونے میں بیٹھی انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھتی

رہتی تھی۔ لڑکی اندازہ لگاتی تھی کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے اور اس سے کیا طلب کرنا چاہئے۔ یہ غیر دلچسپ معمول تھا جس میں کبھی کبھی دھونس جمانے والے اور اکھڑفوں قسم کے لوگ بھی ہوتے تھے، کمزور اور بوڑھے مرد بھی اور مطالبے کرنے اور ٹٹولنے والے جوان بھی، بناوٹی شرم والے، کینے اور مطلبی بھی، یعنی ہمہ قسم کے مردوں کا لامتناہی سلسلہ جنہیں دیکھتے ہی لڑکی پہچان لیتی تھی۔ کبھی کبھی ایک سادہ اور مہربان مرد بھی ان میں ہوتا تھا جس کے جذبات تو بڑے گہرے ہوتے تھے لیکن وہ تذبذب کا شکار ہوتا تھا۔ اس میں مطالبہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان باتوں کو جبلی طور پر محسوس کر کے اٹھ جاتی اور خادمہ کو بالکنی کی کھڑکی بند کرنے اور دروازے کو کنڈی لگا دینے کے بعد چلے جانے کے لئے کہتی۔ سمجھدار ماں یا نائکہ ایسی فطری کوتاہیوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں ایسے تجربے سے لڑکی دوبارہ تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ تنہائی میں لڑکی آزادی سے گفتگو کرتی تھی تاکہ وہ اس آدمی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔ وہ اس کے لئے کچھ کھانے پینے کو لاتی اور یہ تصور کرتی کہ سارے دن کے بعد اس کا مرد گھر واپس آیا ہے اور اب اس کی توجہ کا متمنی ہے۔ شرماتی ہوئی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے جاتی تھی اور دونوں اپنے آپ کو بھولنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ فراموش کر دیتے کہ دوسرا کون ہے۔ لڑکی یہ بھی سوچتی تھی کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنے بچے کے بارے میں بھی کچھ سوچے کیونکہ کبھی نہ کبھی تو اسے یہ سوچنا ہی پڑے گا۔ اگر اس کی شادی نہیں ہوئی اور شادی کے امکانات واقعی کم ہوتے تھے، تو اسے ایک لڑکی کا سہارا تو لازماً درکار ہو گا۔

اس علاقے کی عورتیں توہم پرست تھیں اور انہیں اپنے پیشے کے لئے جواز کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ اکثر عورتیں شیعہ ہو جاتی تھیں۔ اس فرقے میں ایک سادہ سی دعا سے وہ ہر اس شخص سے شادی تصور کر سکتی تھیں جو ان کے پاس ٹھہرے اور اس کے بعد وہ اس شادی کو ختم بھی کر سکتی تھیں۔ شیعہ فرقے میں اس قسم کی عارضی یا وقتی شادی کی اجازت ہے۔

عام رنڈیوں کے گھر مسرور اور مصروف ہوتے تھے۔ مرد ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے۔ مردوں اور لڑکیوں کے درمیان پھکڑپن بھی ہوتا تھا۔ یہ لڑکیاں عام طور پر چار آنے اور آٹھ آنے والیاں کہلاتی تھیں۔ اپنے تھکے ہوئے جسموں اور قبل از وقت مرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ وہ مردوں کی تسکین کا وسیلہ بنتی تھیں۔ جب وہ یہ کرنے سے بھی رہ

جاتی تھیں تو وہ خادماؤں میں شامل ہو جاتی تھیں سوائے ان کے جو اتنی زیرک ہوتی تھیں کہ ایک دن وہ آزاد ہو جائیں۔

یہ تھی ہیرا منڈی۔ اسے ٹبی بھی کہتے تھے۔ یہ لاہور کا اتنا ہی اہم حصہ تھا جتنا کہ لاہور پورے پنجاب کا۔ ان پر کبھی کوئی اخلاقی انگلی نہیں اٹھائی گئی اور نہ ہی کسی مصلح نے اسے بند کرنے کے لئے کہا۔ یہ ان کے لئے تھی جو ضرورت مند تھے اور ہر طبقے سے ضرورت مند یہاں آتے تھے۔

لاہوریئے گنجان علاقوں میں دڑبوں میں بند تھے تاہم لاہور میں ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں وہ چھٹیوں، تہواروں اور میلوں پر جا سکتے تھے۔ شمالی دروازے کے قریب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سنگ مرمر کی سادھی تھی۔ جہاں اس عظیم سکھ حکمران کی خاک دفن تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں میں اسے ایک درگاہ کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے قریب ہی جامعہ مسجد تھی جس کے مینار بڑے خوبصورت اور صحن بڑا کشادہ تھا۔ یہاں عید کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ دریا کے پار مغرب کی طرف جہانگیر کا مقبرہ تھا۔ اس کی کشادہ پارک اور باغ پکنک کے لئے بڑی اچھی جگہیں تھیں سڑک کے پار سنگ مرمر سے جڑے ہوئے اس شاندار مقبرے کے بالمقابل اس کی ملکہ نورجہاں اور اس کی اکلوتی بیٹی کا مقبرہ تھا جو ویران حالت میں تھا۔ اس مقبرے کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ اس عظیم مغل خاتون کی المناک پیشین گوئی جو اس کے اپنے ہی شعر میں ہے کہ

برمزار ما غریباں نے چراغ نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے سرائید بلبلے

پوری ہو گئی۔ شہر کے مشرقی سمت شالا مار باغ ہے جسے جہانگیر نے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر کشمیر کے مشہور نشاط اور شالیمار باغوں کے نمونے پر ہوئی ہے۔ اسی طرف حقیقت رائے کی سادھی بھی ہے۔ اس نوجوان شہید کو ایک دیوانے قاضی نے دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ پھر شاہو دی گڑھی ہے جہاں ایک مسلمان صوفی کی درگاہ ہے۔ یہیں کمپنی باغ ہے جسے لارڈ لارنس کے نام پر لارنس باغ کہا جاتا تھا۔ اس میں وسیع پارکیں، چڑیا گھر ہے اور ایک پہاڑی تھی جسے خوب سجایا گیا تھا۔

اپنی سادگی اور کفایت شعاری کے باوجود لاہور زندگی سے لطف اندوز ہونا خوب جانتا تھا۔ پنجابی تہواروں کے ساتھ ساتھ لاہور کے اپنے بھی مخصوص تہوار تھے جیسے حقیقت

رائے کی ساوھی کا میلہ۔ ایک اور بڑا خوبصورت تہوار میلہ چراغاں تھا۔ یہ چراغوں کا میلہ تھا اور جہانگیر کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ یہ میلہ شالامار باغ میں منعقد ہوتا تھا۔ اس کی دیواروں' شامیانوں اور نہروں کے کنارے پر مٹی کے ہزاروں دیئے جلائے جاتے تھے اور پورا باغ ایک پری خانے میں بدل جاتا تھا ہر مذہب کے لوگ اس میں حصہ لیتے تھے۔ اس میلے کا خصوصی پہلو مینا بازار تھا۔ یہ صرف خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ اس بازار میں صرف عورتیں دکانیں لگاتی تھیں اور عورتیں ہی خریداری کرتی تھیں۔ اس میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ہر سال کوئی نہ کوئی نڈر آدمی برقعہ پہن کر اس میں گھس جاتا تھا اور ہمیشہ پکڑا جاتا تھا۔ پھر عورتیں اسے خوب جوتے مارتی تھیں اور اس کی اچھی درگت بنا کر میلے سے باہر نکال دیتی تھیں۔ وہ لوگ جو اپنی عورتوں کے باہر آنے کے منتظر ہوتے اس کا خوب تمسخر اڑاتے تھے۔

لاہوریوں کے محبوب ترین مشغلے اکھاڑے جانا' پتنگ بازی اور کبوتر بازی تھے۔ نوجوان پیشہ ور اور شوقین ہر شام کو مشہور پہلوانوں کے اکھاڑوں میں جاتے تھے' مالش اور ورزش کرتے تھے اور کشتی لڑنا سیکھتے تھے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے پیشہ ور پہلوان بھی کشتی لڑنے لاہور آتے تھے۔ ان کے شاگرد اور مداح جلوس کی صورت میں ہر پہلوان کو بازاروں میں گھماتے تھے۔ پھولوں کے ہار پہنے پہلوان آگے آگے ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے ڈھول والا ہوتا تھا اور یوں یہ جلوس بازاروں سے گزرتا تھا۔ شہر والوں سے پہلوان کا تعارف کرایا جاتا تھا۔ کشتی والے دن شہر میں بڑا جوش و خروش ہوتا تھا۔ ان کی کشتی دیکھنے کے لئے لوگوں کا بہت بڑا مجمع شہر سے باہر اکٹھا ہو جاتا تھا۔ پہلوان طاقت کے پہاڑ ہوتے تھے اور اپنی روزمرہ کی زندگی اور اکھاڑے میں بڑی پیچیدہ رسومات ادا کرتے تھے۔

موسم بہار کے تہوار بسنت سے پتنگ بازی کا آغاز ہو جاتا تھا۔ چھوٹے بڑے ہزاروں پتنگوں سے آسمان ڈھک جاتا تھا۔ اپنے اپنے چھتوں سے لوگ پتنگیں اڑاتے تھے۔ اس ہیجان میں ہر سال کچھ جانیں ضائع ہو جاتی تھیں۔ جس ڈور سے پتنگ اڑائی جاتی تھی اسے پسے ہوئے کانچ اور گوند کے محلول میں ڈبو کر سخت اور تیز کیا جاتا تھا۔ ایک پتنگ باز اپنے پتنگ کو اونچا اڑا کے کسی دوسرے کو للکارتا تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک پتنگ دوسرے کے نیچے لڑکھڑانے لگتی تھی اور جب اسے اور اونچا کیا جاتا تو ایک جھٹکے سے دوسرے پتنگے کی ڈور کٹ جاتی اور کٹی ہوئی پتنگ بڑی بے بسی سے ہوا پر تیرتی ہوئی زمین کی طرف آنے لگتی تھی۔ بڑے بڑے بانسوں اور ڈنڈوں سے لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔

کبوتر بازی رئیسانہ کھیل تھا۔ کبوتروں کو پالنے اور سدھانے کے لئے کلیجہ درکار ہے۔ ایک لمبے بانس پر کبوتروں کے لئے ایک چوکور چھتری بنائی جاتی تھی اور اسے گھر کی چھت پر نصب کر دیا جاتا تھا۔ کبوتر اس چھتری پر بیٹھتے تھے اور بلیوں سے محفوظ رہتے تھے۔ شام کے وقت کبوتر باز کبوتروں کو ہوا میں چھوڑ دیتے تھے۔ کبوتر ہوا میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان کا مالک سیٹیاں بجا بجا کر انہیں ہدایات دیتا تھا اور ان کے مطابق کبوتر کبھی تنگ اور کبھی بڑا کھلا دائرہ بنا کر اڑتے رہتے تھے۔ پھر وہ انہیں واپس اپنی چھتری پر بلا لیتا تھا۔ بعض اوقات دوسرے کبوتر بازوں سے مقابلہ بھی ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے کبوتر اڑا کر دوسرے کبوتر باز کے کبوتروں میں ملا دیتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ سارے کبوتر اپنی چھتری پر لے آئے۔ اس طرح دام میں آنے والے سارے کبوتر اسی کے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک اسی کے رہتے تھے جب تک کہ ان کا اصل مالک ان کو واپس نہ بلا لے۔

لاہور کے باہر وسیع پارک' باغات اور مضافات بن چکے تھے۔ شہر کے دو بڑے خوبصورت پہلو تھے: لاہور کا انارکلی بازار جو خریداری کا بڑا مرکز تھا اور لاہور کے سکول اور کالج۔

سکول اور کالج سب سے پہلے لاہور میں شروع ہوئے۔ اگرچہ تعلیم کی سہولتیں پورے پنجاب میں میسر تھیں لیکن آرٹس' سائنس' ڈاکٹری' قانون' انجینئرنگ اور بیطاری سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز لاہور ہی تھا۔ میرے دادا چچا' میرے والد اور خود میں اور میرے بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی۔ جب آپ کسی پیشے میں داخل ہوتے تھے تو آپ کے اکثر رفقائے کار لاہور ہی کے پرانے دوست احباب ہوتے تھے۔ شادیاں بھی آپ انہیں خاندانوں میں کرتے تھے جن کے لڑکے لڑکیاں لاہور ہی کی پڑھی ہوئی ہوں۔ رفتہ رفتہ ملازمتوں سے سبکدوش ہونے کے بعد لوگ لاہور میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے میں لاہور ایک خاص مقام بن گیا تھا۔ پنجابی پیشہ ور لوگوں کی ایک خاص جماعت تھی جس نے لاہور میں تعلیم پائی تھی اور اب یہ وراثت یا ذات کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا جس کا تعین پیدائش سے ہی ہو جاتا تھا۔ کئی کالجوں میں خصوصاً وہ جو مخیر اوقاف کے تحت چلتے تھے' دیہاتی اور نچلی ذاتوں والے طالب علموں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ پنجابی والدین میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی خواہش جذباتی ہونے کی حد تک زیادہ تھی۔ اس طرح لاہور یونیورسٹی سطح تک کی تعلیم کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا جس میں پچیس کالج اور آج سے تیس سال پہلے پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی۔

لاہور کے شاپنگ سنٹر نے لاہور کو پنجاب کا مرکز بنا دیا تھا۔ یہاں خریداری کے لئے بڑے زیادہ مواقع تھے۔ شہر کے اندر بازار تھے جو مختلف اشیا کی خرید و فروخت کے لئے مخصوص تھے۔ ڈبی بازار میں تمام دکانیں صرف کپڑا بیچتی تھیں۔ یہاں دنیا بھر کے ریشمی، سوتی اور اونی کپڑے ملتے تھے۔ ہر کپڑے کا موازنہ اور قیمت کا مقابلہ کر کے سینکڑوں میں سے کسی ایک دکان سے آپ کپڑا خرید سکتے تھے۔ اگر بانس درکار ہوں تو آپ بانسوں والے بازار میں چلے جاتے تھے جہاں ہر سائز اور ہر قسم کے بانسوں سے دکانیں بھری ہوتی تھیں۔ انارکلی ان سب سے مختلف تھی۔ انارکلی کا نام ایک کنیز کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ جہانگیر کی پہلی محبوبہ تھی۔ داستان کے مطابق اسے اکبر نے قتل کرا دیا تھا تاکہ شہزادہ سلیم اسے بھول جائے۔ یہ بازار اس کے مقبرے کے قریب ہی بنا تھا۔ یہ عام سا بازار نہیں تھا۔ یہ پورے پنجاب کا بازار تھا۔ مالیر کوٹلے، مظفر گڑھ یا میانوالی میں بیٹھ کر اگر کوئی کہتا تھا کہ یہ چیز اس نے انارکلی سے خریدی ہے تو یوں لگتا تھا کہ انارکلی بازار اسی شہر میں ہے۔ کالجوں کے طالب علموں کی کئی نسلیں انارکلی جاتی رہیں تھیں اور ان کی یہ عادات ساری زندگی قایم رہی۔ ہفتے کے اختتام پر خریداری کرتے ہوئے آپ کی ملاقات پرانے دوستوں اور ان کے گھر والوں سے ہو جاتی تھی۔ بیویاں بھی آپس میں متعارف ہو جاتی تھیں اور ایک دوسرے کو بہن جی کہہ کر مخاطب کرنے لگتیں تھیں۔ آئندہ چل کر اکثر ان کی رشتے داری بھی ہو جاتی تھی۔ طالب علمی کے زمانے سے دوکاندار آپ کو جانتے تھے اور مذاق میں آپ ان سے کہتے کہ آپ اب بھی زیادہ قیمت لے رہے ہیں یعنی اس وقت بھی جب بل ادا نہ کرنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پھر آپ اچھے پنجابیوں کی طرح ایک اچھے سے ریسٹورانٹ میں چلے جاتے تھے۔ پرانا کیسری جو ہمیشہ تازہ ترین رنگین فرنیچا تھا اور جو دوسرے ریسٹورانٹوں کا پیش رو تھا اس زمانے میں بھی بڑا اچھا چل رہا تھا۔ آپ نالی کے کنارے کھڑے ہو کر گیس اور مائع کے ملغوبہ کا مزہ لیتے۔ پھر سٹفلنز، کیلاش اور سٹنڈرڈ نامی ریسٹورانٹ تھے جو کھانے پینے کی جگہوں میں نمایاں تھے۔ یہ شاہ عالمی دروازے کے باہر پنجابیوں کی ناقابل تسکین خوش خوراکی کی تسکین کرتے تھے۔ جب آپ اپنی پسند کی چیز کھانے میں مصروف ہوتے تھے تو عورتیں اپنے اپنے گھروں کے متعلق جہاں سے ان کا تعلق تھا، باتیں کرتی تھیں۔ وہ بچوں اور شادی کے قابل بہن بھائیوں کے متعلق بھی تبادلہ خیالات کرتی تھیں۔ مرد اپنے کالج کے زمانے کو لوٹ جاتے تھے اور ان جگہوں اور مقامات کا ذکر کرتے جہاں اس زمانے میں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔

تقدیر کی ستم ظریفی ہے کہ ایک کنیز کے نام پر جسے اس لئے قتل کرا دیا گیا تھا کہ وہ شہزادہ سلیم سے شادی کے بعد کہیں ملکہ نہ بن جائے، ایک روشن اور بارونق بازار مشہور ہے اور نور جہاں جو نہ صرف ہندوستان پر بلکہ جہانگیر پر بھی حکومت کرتی تھی، دریائے راوی کے کنارے سرکنڈوں میں گھری ہوئی ایک ویران اور سنسان جگہ پڑی ہے۔ گیدڑ اور چمگادڑیں اس کے ساتھی ہیں۔

خریداری کے لئے دوسرا مقبول مقام مال روڈ تھی۔ یہ گورنمنٹ کالج کی ایک چھوٹی سی پہاڑی سے شروع ہو کر ایک شاندار قوس میں گول باغ سے گزر کر بھنگیوں کی توپ تک جاتی تھی۔ وہاں سے یہ بڑی سڑک بن جاتی تھی۔ اس کے دونوں طرف آرٹس کالج، سائنس کی تجربہ گاہیں، سینٹ ہال اور عجایب گھر تھے۔ ان کے بعد یہ خریداری کا مرکز بن جاتی تھی۔ دو میل تک یہ ایک خوبصورت بولیوارڈ کی طرح چلتی تھی۔ اس کے دونوں طرف مغربی طرز کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ یہاں پنجاب کے سارے انگریز خریداری کے لئے آتے تھے۔ سڑک کے مغربی سرے پر موٹر گاڑیوں کے شو رومز، ہوٹل اور ریسٹورانٹ تھے۔ ان کے بعد مال روڈ لارنس باغ میں جا ملتی تھی اور اس باغ کے درختوں، جھاڑیوں اور ہریالی میں مدغم ہو جاتی تھی۔

میں ۱۹۲۷ء میں لاہور آیا اور کسی نہ کسی طرح گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ حصول اقتدار کی طرف پنجاب کے درمیانے طبقے کا یہ پہلا قدم ہوتا تھا۔ دوسرا قدم انڈین سول سروس میں شمولیت تھی۔

گورنمنٹ کالج میں داخلہ دفتری منصوبہ بندی کا شاہکار بن چکا تھا۔ کچھ لڑکوں کو داخلہ امتحانوں میں اول آنے کی بنیاد پر مل جاتا تھا۔ یوں اعلیٰ صلاحیتوں کو ان کا انعام مل جاتا تھا۔ کچھ لڑکے کھیلوں میں اپنے نمایاں مقام کی بنا پر داخل ہو جاتے تھے۔ بشرطیکہ وہ کالج کی مختلف ٹیموں میں شمولیت کے قابل ہوتے۔ پھر ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا تھا۔ پڑھائی اور کھیلوں میں نمایاں لڑکوں کے بعد داخلے کے لئے انتخاب کا پیچیدہ عمل شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے ذریعے کئی لوگوں کو ممنون کرنا ہوتا تھا جیسے ریاستوں کے حکمران خاندانوں کے افراد، برطانیہ کے وفا دار اور خدمت گزار خطاب یافتہ خاندانوں کے لڑکے، بڑے افسروں اور بڑے زمینداروں کے بیٹے، پولیٹیکل محکمے کے سفارشی، چند عیسائی اور اینگلو انڈین اور ایک آدھ پارسی۔ پرنسپل ایک ایک درخواست کو بڑے غور سے دیکھتا تھا اور اگر امیدوار یا اس کے خاندان کی سیاست میں دلچسپی کے متعلق پولیس کی رپورٹ پہنچی ہو تو

اسے بھی مد نظر رکھا جاتا تھا۔ داخلہ لینے والے تمام لڑکوں سے ایک عہد لیا جاتا تھا کہ وہ سیاست میں کسی قسم کا کوئی حصہ یا دلچسپی نہیں لیں گے۔ سب سے آخر میں مندرجہ بالا کوئی شرط پوری نہ کرنے والے چند لڑکوں کو جن میں میں بھی شامل تھا' محض اس لئے داخل کر لیا جاتا تھا کہ اوسط درجے کی صلاحیت میں بھی شاید کوئی جوہر پوشیدہ ہو جس کا صحیح اندازہ شاید نہ لگ سکا ہو۔ گورنمنٹ کالج آکسفورڈ اور کیمبرج کے خطوط پر استوار تھا جس میں انگریز یا انگلستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانی استاد پڑھاتے تھے۔ اس کا مقصد طالب علموں کی جامع تربیت تھا اس کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا۔ اس کی وجہ کڑے معیار تھے جن پر اساتذہ کو منتخب کیا جاتا تھا۔ ان کی تنخواہیں اچھی تھیں اور یہ حکومت کی تعلیمی سروس میں اونچے کاڈر میں تعینات ہوتے تھے۔

لڑکوں کو سیاست سے دور رکھنے کے لئے گورنمنٹ کالج کی تمام کوششوں کے باوجود اس میں ہماری دلچسپی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کئی کوششیں تو واقعی قابل رحم تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد ایک دفعہ پرنسپل نے دو لڑکوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور کچھ کاغذات ان کے سامنے رکھ دیئے۔ یہ وہ اقرار نامے تھے جو انہوں نے داخلے کے وقت دیئے تھے کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے۔ پرنسپل نے ان کو بتایا کہ ایک خاص دن انہوں نے ایک سیاسی میٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ لڑکوں کو بڑی مشکل سے یاد آیا کہ ایک دن جب وہ سیر کے لئے نکلے تو انہوں نے کسی گلی میں لوگوں کا ہجوم دیکھا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وہ وہاں رک گئے تھے۔ یہ مزدوروں کی ایک چھوٹی سی احتجاجی میٹنگ تھی۔ یہ دیکھنے کے بعد یہ طالب علم وہاں سے چلے گئے تھے۔ چنانچہ اس کڑی نگرانی نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ گاندھی جی کی آزادی اور خود مختاری کی تعلیم تو لڑکوں میں سرایت کر رہی تھی۔ ہمیں یہ باتیں سیاست میں حصہ لے کر نہیں سیکھنی تھیں کیونکہ یہ سب کچھ تو انگریزی فکر و ادب کے مطالعہ سے ہم پہلے ہی سیکھ رہے تھے۔ اور جن لوگوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا ہی تھا تو وہ کالج سے نکالے جانے کی دھمکیوں سے کب ڈرنے والے تھے۔ سیاست تو ہمارے گھر اور اس کے باہر گفتگو کا حصہ بن چکی تھی۔ یہی چیز اہم تھی نہ کہ طالب علموں کی دہشت گردی کی تحریک جس سے حکومت زیادہ خائف تھی۔ ویسے بھی سوائے ایک شخص کے پنجابی خاصے بودے دہشت گرد تھے۔

بارھواں باب

ایک دن شاید ۱۹۲۸ء میں میرے والد نے مجھ سے پوچھا کہ میں تعلیم ختم کر کے کیا کرنا چاہتا ہوں۔ پنجابیوں کا تین پشتوں سے صرف ایک ہی مقصد تھا : انڈین سول سروس۔ اور میں نے فرض کر لیا تھا کہ میرے والد بھی مجھ سے یہی توقع کرتے ہیں۔ لیکن میں اس وقت ششدر رہ گیا جب انہوں نے دوسرا سوال پوچھا : کیا تمہیں آئی سی ایس یا کسی دوسری ملازمت کا مستقبل نظر آتا ہے؟ میں فوراً اس نکتے کو سمجھ گیا لیکن میں حیران ہوا کہ میرے والد کے ذہن میں سیاسی شک و شبہات داخل ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کی نسل سے اس قسم کی توقع نہیں تھی۔ میرے والد جیسے لاتعلق شخص کے ذہن میں سرکاری ملازمت کے مستقبل کے متعلق یہ سوال کسی تبدیلی کی علامت تھے۔ میرے ذہن میں تو ابھی تک یہی تھا کہ وہ یہی سوچیں گے کہ اس خطے میں امن و امان اور ترقی انگریز ہی لائے ہیں اور اگرچہ کہیں کہیں انتظامیہ میں مراعات اور اصلاح کی گنجائش تھی لیکن آزادی اور خود مختاری بے معنی الفاظ تھے۔ مگر ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ گو موجودہ احتجاج بلاشبہ جلد ختم ہو جائے گا لیکن انگریز کتنی دیر اور یہاں رہ سکتا ہے۔ اگرچہ وہ قبول تو نہ کرتے لیکن ان کی یہ سوچ ذاتی نا امیدیوں کا نتیجہ تھی۔ یہ صرف میرا اندازہ ہے۔

یہ شکوک و شبہات کسی سیاسی عقیدے کی وجہ سے ان کے ذہن میں نہیں آئے تھے کیونکہ تعلیم یافتہ گھروں کی بائیبل یعنی روزنامہ ٹربیون کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی سیاسی چیز نہیں پڑھی تھی اور نہ ہی اس موضوع پر کبھی گفتگو کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ان خیالات کا سرچشمہ وہ تعلقات تھے جو ان کی نسل اور محکمے میں انگریزوں کی نئی نسل کے درمیان تشکیل پا رہے تھے۔

میرے والد کے ہمعصر ہندوستانی بلاشبہ کافی لمبے عرصے تک کام کر چکے تھے اور کافی کچھ سیکھ چکے تھے۔ چونکہ پہلے ان کو نئے نئے مواقع ہاتھ لگے اس لئے ممنون تھے لیکن وقت کے ساتھ وہ خود بھی اپنے اپنے پیشوں میں اتنے ہی ماہر ہو گئے تھے جتنے کہ انگریز تھے۔ انہوں نے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جو بھی موقعہ انہیں ملا اس سے پورا پورا

فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ فطری امر تھا کہ تشکر کے جذبات رفتہ رفتہ معدوم ہوتے چلے جائیں اور وہ اپنے آپ کو اپنے معیاروں پر پرکھیں۔ ساتھ ہی نوجوان انگریزوں کو بھی ان کی نگرانی میں دے دیا گیا اور اب وہ ان انگریزوں کے استاد بن گئے۔ انگریزوں کو خود مخصوص تعلیم کی ضرورت تھی کیونکہ پنجاب سے مخصوص انجنیئرنگ کے کام کی نوعیت ایسی تھی جس کی تعلیم انگلستان کے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نہیں دی جاتی تھی۔ اگرچہ انگریز وہاں کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل انجینئروں کو بڑی احتیاط سے منتخب کرتا تھا لیکن رڑکی کے پنجابی نوجوان پہلے سے کہیں بہتر ہو گئے تھے کیونکہ یہاں داخلے کے لئے مسابقت بہت سخت ہو گئی تھی اور صوبے کے صرف انتہائی قابل طالب علم یہاں داخلہ لینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

مزید براں پچاس سال پہلے کے انگریزوں کی طرح نو وارد انگریز افسر پہل کاری کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ جیسے جیسے ہمارا انگریزی کا علم آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے ہندوستانی اور پنجابی میں نو وارد انگریزوں کی دسترس کم ہوتی چلی گئی۔ سفر کی آسانیوں اور سہولتوں کی افراط سے ان نو وارد انگریزوں کی اس ملک سے دلچسپیاں اور بھی کم ہونے لگیں۔ بیس سال پہلے جب انگریز دورے پر آتے تھے تو وہ کئی کئی دن گھوڑوں پر اور تانگوں میں سفر کرتے تھے' ہر ڈاک بنگلے میں قیام کرتے تھے اور یوں قریب رہنے والے کسانوں کو ان سے طویل ملاقاتیں کرنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ لیکن جب موٹر کار آ گئی تو اپنے پورے سرکل میں جس کا نصف قطر کم سے کم ایک سو میل ہوتا تھا' سپرنٹنڈنگ انجینئر دو دن میں اپنا دورہ پورا کر لیتا تھا۔ ضلعی مقامات پر سہولتوں اور آسائشوں' کلب' بجلی' برف اور پنکھوں کی موجودگی کی وجہ سے انگریز اب دورے بے دلی سے کرتے تھے۔ نئی نسل کے انگریزوں نے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنی بیویوں کو بھی واپس انگلستان بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ یوں بھی اس ملک سے ان کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

میرے والد کے تین یا چار انگریز چیف انجنیئروں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی مسوری میں بنگلے خرید کر ان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ سوائے فرلو کے برسوں میں یہ حضرات گرمیوں میں اپنی بیویوں کو وہاں بھیج دیتے تھے۔ فرلو یعنی طویل چھٹی بھی تو محدود ہوتی تھی یعنی پوری تیس سال کی ملازمت کے دوران چار یا پانچ بار۔ یہ افسر یہیں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے رڑکی میں ہی تعلیم حاصل کی تھی' شادیاں بھی یہیں کیں اور وفات بھی یہیں پائی۔ وہ مسوری کی لمبی شاخوں والے کنیر کے درختوں کے نیچے ہمالیہ کی ان دائمی

برفوں کو دیکھتے ہوئے دفن ہوئے جو ان لوگوں کی کھودی ہوئی نہروں کو پانی مہیا کرتی تھیں جن کو یہی لوگ چلاتے بھی تھے۔ ان کے اکثر بچے واپس ہندوستان آ گئے تھے۔ یہیں انہوں نے ملازمتیں کیں اور شادیاں بھی یہیں کیں۔ میرے والد ایسے لوگوں کی ماتحتی میں خوش تھے اور ان کے ساتھ زبان' کھانے اور ثقافت میں حصہ لیتے تھے۔ میری والدہ بھی ان انگریزوں کی بیویوں کو جانتی تھیں کیونکہ ان کی اکثریت بھی یہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ بڑی اچھی ہندوستانی بولتی تھیں۔ ان میں سے اکثر پنجابی بھی بڑی اچھی جانتی تھیں۔ جب وہ اپنے شوہروں کے ساتھ دوروں پر آتی تھیں تو میری والدہ ان کے لئے خاص طور پر پنجابی کھانے پکا کر بھیجا کرتی تھیں۔ وہ بھی میری والدہ کو بننا' کروشیا' کشیدہ کاری' پردے اور گدوں کے غلاف بنانا اور ہمارے لئے خاکی نکریں کاٹنا سکھاتی تھیں۔ میری والدہ ان کے ساتھ گھل مل جاتی تھیں اور وہ بھی ان کی معیت میں خوش رہتی تھیں۔

نئی نسل کے انگریز افسران برطانوی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل تھے۔ اچھی تنخواہیں' جلد ترقیاں' وافر چھٹیاں سفر کے کرائے میں رعایت اور ملازمت سے جلد سبکدوشی' اور انگلستان کے مقابلے میں کم از کم درمیانے درجے کے لوگوں کے لئے نسبتاً آسان ملازمتیں ایسی توقعات تھیں جو انہیں کھینچ کر ہندوستان لے آتی تھیں۔ ممکن ہے ہندوستان میں دلچسپی نے آئی سی ایس والوں کو اس ملک کی طرف کھینچا ہو لیکن انجنیئروں میں اس ملک کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ یہ روایتی آدمی تھے اور ان کی قدریں مختلف تھیں۔ ان کا مقصد صرف کام چلانا تھا اور انہیں پنجاب میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میرے والد جیسے لوگوں اور ان نو واردوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کی نظر میں میرے والد کی نسل کے لوگ محنتی ضرور تھے لیکن غیر دلچسپ تھے اور ان کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو وہ صرف کام تھا۔ میرے والد نے اس تبدیلی کو جلد ہی بھانپ لیا تھا۔ وہ پرانی قسم کے پنجابی تھے جن کی جدید قسم کی شائستگی ان کے اپنے کام میں مہارت اور سماجی سوچ تک محدود تھی۔ ان کا تعلق نہ تو مغرب زدہ طبقے سے تھا اور نہ مغربیت سے پیدا ہونے والے مسائل سے۔ انہیں کوئی شوق نہیں تھا کہ وہ اپنے انگریز رفقائے کار سے گھل مل جائیں یا کلب کے ممبر بن جائیں۔ وہ اپنی روش سے مطمئن تھے اور ان تبدیلیوں سے بھی جو انگریزی تعلق سے ان میں پیدا ہوئیں۔ وہ اب بھی پگڑی باندھتے تھے۔ کوٹ پتلون کو انہوں نے کام میں سہولت کے پیش نظر پہننا شروع کیا۔ گھر پر ان کا رہن سہن پنجابی تھا۔ انگریزوں کی پرانی نسل اور ان کے درمیان ایک تعلق ضرور تھا لیکن نو واردوں اور میرے والد کے درمیان سوائے کام

کے اور کوئی رابطہ نہ تھا۔ میرے خیال میں میرے والد نو واردوں کی روش سے مجروح ہوئے تھے۔ نو وار دانی روش پر ہی قایم رہے اور میرے والد کی روش کو سمجھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ میرے والد کو احساس تھا کہ نو وارد انہیں مختی اور راستباز تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن وہ انہیں بطور ایک فرد کے سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ ممکن ہے کہ میرے والد کو وہ مضحکہ خیز سمجھتے ہوں اور انگریزوں کی پرانی نسل جسے ایک دلچسپ پرانی وضع سمجھتی تھی' نو وارد اسے پسماندگی تصور کرتے تھے۔ میرے والد نے اپنے یہ احساسات کبھی ظاہر نہیں ہونے دیئے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ محسوس یہی کچھ کرتے ہوں گے۔ انہوں نے نو واردوں کے لئے مراعات یافتہ عہدوں کی تخصیص کو بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک عام سے انجنیئر گریجوایٹ کو جسے آب پاشی اور عمارت سازی کا کوئی تجربہ نہ ہو' "تناسب" کے پیش نظر رڑکی سے فارغ التحصیل اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک لوگوں کے اوپر تعینات کرنا ایک ناقابل دفاع صورت حال تھی۔ چند برسوں کی تربیت کے بعد ان نوجوانوں کو اعلیٰ مقامات پر تعین کر دینا اور پھر ان کی اس سبقت کو ساری ملازمت کے دوران برقرار رکھنا میرے والد کے نقطہ نظر سے درست نہیں تھا۔ ان کی نظر میں یہ ناانصافی تھی اور یہ ان ناانصافیوں کے برابر تھی جس کا ذکر ہمارے سیاسی راہنما کرتے تھے۔ یہ ناانصافی ایک بڑی ناانصافی یعنی ملک کے استحصال کا حصہ تھی۔ رفتہ رفتہ محکمے میں کئی ناانصافیاں سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ ہندوستانی انجنیئر خواہ وہ انتہائی قابل ہی کیوں نہ ہوں ایک مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ جب وہ اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کے قریب ہوتے تھے تو ان میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آنے لگتی تھی۔ اعلیٰ عہدوں کی دوڑ میں جیتنے والے صرف انگریز ہی ہوتے تھے۔ ایسا کسی طے شدہ پالیسی کے تحت نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک مایوس کن عمل کے تحت انگریز ہر مد مقابل کو فرداً فرداً نیچے گرا کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ میرے والد ایسے اعلیٰ ترین عہدے کے لئے کبھی کوشاں نہیں تھے اور نہ ہی وہ کبھی اس کے قریب پہنچے تھے۔ آغاز میں تو یہ قابل قبول تھا کہ ہندوستانی صرف ایک حد تک جا سکیں گے۔ بعد میں ایسی رکاوٹوں کو بتدریج کم کر کے مایوسی کا ازالہ کیا گیا لیکن اب جس وقت بہت سارے قابل ہندوستانیوں کا ایک ہجوم آخری منزل کے قریب اکٹھا ہو چکا تھا تو ان کو اس منزل تک پہنچنے سے روکنا تلخی کا سبب بننے لگا تھا۔

دوسری دہائی کے آخر میں سماجی تناؤ بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ جب میں لاہور میں زیر تعلیم تھا تو میرے والد کی سرگودھا میں دوبارہ تعیناتی ہو گئی۔ اس وقت سرگودھے میں دو

کلبیں تھیں۔ سرگودھا کلب کی مخصوص یورپی حیثیت میں قدرے تبدیلی آ چکی تھی کیونکہ ضلع کے چند اعلیٰ افسران کو بھی اس میں داخلہ مل گیا تھا اور کچھ ٹوانوں جیسے بڑے زمیندار اس کلب کے ممبر بن گئے تھے لیکن ان کی خواتین داخلے سے محروم رہیں کیونکہ اکثر ہندوستانی عورتیں پردہ کرتی تھیں اور سماجی اعتبار سے وہ اتنی پسماندہ تھیں کہ ان کو ممبر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی افسروں اور مختلف پیشوں سے متعلق شہریوں نے اپنی علیحدہ کلب بنا لی تھی۔ سول سٹیشن میں ان دونوں کلبوں کا باہمی تعامل دلچسپ تھا۔

اس وقت سرگودھا کلب میں دو ہندوستانی تھے : ڈپٹی کمشنر جو ایک ہندوستانی عیسائی تھا اور سیشنز جج۔ ڈپٹی کمشنر نے کلب کا ممبر ہونے کا شرف تو قبول کر لیا لیکن وہ جاتا نہیں تھا۔ لیکن سیشنز جج بے یقینی کی حالت میں گرفتار تھا اور سمجھتا تھا ممبری کے اعزاز کو قایم رکھنے کے لئے اسے باقاعدگی سے کلب جانا چاہئے۔ وہ ہر شام وہاں ٹینس کھیلتا تھا لیکن خالص سوشل سرگرمیوں میں حصہ لینے سے کتراتا تھا۔ چنانچہ ہر شام ٹینس کھیلنے کے بعد برج کی بازی یا گفتگو کے لئے وہ ہندوستانی کلب میں آ جاتا تھا۔ اس وقت سرگودھے میں ایک کشمیری نوجوان تھا جو مقامی امپیریل بنک کی شاخ کا پہلا ہندوستانی اکاؤنٹنٹ تھا۔ وہ بہت مغرب زدہ' بہت زندہ دل اور خوش باش انسان تھا۔ اس کے انگریز مینیجر نے اسے سرگودھا کلب کا ممبر بننے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا کیونکہ اس کی بیوی اس کلب کی ممبر نہیں بن سکتی تھی۔ مزید اس کی نظر میں اس کلب کے ممبر بننے کا اعزاز بھی مشکوک تھا۔ وہ ہندوستانی کلب کا ممبر بن گیا اور اپنی نوجوانی کے وفور جذبات سے اس نے سیشنز جج کا ناک میں دم کر دیا۔ ہر شام کو جب جج ٹینس کھیل کر ہندوستانی کلب میں آتا تو یہ کشمیری اس کا تمسخر اڑاتا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے فرار ہو کر آیا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سارے سماجی مسائل پر وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ اس کی باتوں میں بہت بڑی سچائی اور جوش ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ سیاست کی طرف رجوع کرتا اور میرے والد جیسے پرانے فیشن کے بوڑھے لوگ بڑے غور سے اس کی گفتگو سنتے تھے کیونکہ ایسی گفتگو ٹریبون اخبار کے اداریتی کالموں میں ایک نئے بعد کا اضافہ کرتی تھی۔ یہ بعد اس کے ذاتی احساسات پر مبنی تھا جن کو وہ بڑی وضاحت سے پیش کرتا تھا۔ وہ کافی سیاحت کر چکا تھا اور اس کا تعلق کشمیر کے ایک مشہور خاندان سے تھا جو سیاست میں پیش پیش تھا۔ وہ ناانصافیوں کا کھل کر ذکر کرتا تھا اور اس سے لوگوں کے دل میں اپنے معاملات کے متعلق احساسات بیدار ہو جاتے

تھے۔ اپنے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات وہ خود ہی فراہم کرتا جو حقیقت اور بڑی صاف گوئی پر مبنی ہوتے تھے۔ یہ خوبصورت نوجوان جلد ہی پوری کلب کا منظور نظر ہو گیا اور میرے والد اور ان کے ہمعصروں کا سیاسی اتالیق بن گیا۔ وہ ان خیالات کی ترجمانی کرتا تھا جو ہندوستانیوں کے ذہنوں میں مبہم صورت میں موجود تو تھے مگر جن کے متعلق انہوں نے کبھی کسی دوسرے شخص سے بات نہیں کی تھی۔

میرے پیشے کے انتخاب میں ایک طرح سے وہ بھی ذمہ دار تھا۔ اس نے تجویز کیا کہ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا پیشہ اختیار کرنے پر غور کروں کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں صرف مٹھی بھر آدمی اس پیشے میں تھے۔ میرے والد اس کی ہر تجویز پر غور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس طرح چند ماہ بعد انگلستان جا کر آرٹیکل شپ لے کر میرا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا طے ہوا۔ میرے رفقائے کار اور پروفیسر اس انتخاب پر بڑے حیران ہوئے لیکن میں خوش تھا کہ میں اپنے پیشے میں اپنے پیچھے ایک روشن لکیر چھوڑ جاؤں گا۔ پہلا پنجابی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ابھی ابھی واپس آیا تھا اور چونکہ اس نے ابھی کام کرنا شروع نہیں کیا تھا اس لئے اس پیشے کے متعلق لوگوں کو بہت کم تفصیلات مل سکیں۔

اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے سرگودھے سے انگلستان کا طویل سفر شروع کیا۔ میں اس وقت ناپختہ نوجوان تھا جو لاہور سے دو سو میل سے زیادہ دور کبھی نہیں گیا تھا۔ رات کے دو بجے گھر کو چھوڑ کر سفر کا آغاز کرنا کچھ آسان نہیں تھا۔ جب گاڑی پورچ سے نکلی ڈھلتے ہوئے چاند کی اداس چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ میرے دل میں اس وقت اداسی' ہیجان اور خوف کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے انجانے مستقبل کی امکانات کے بارے میں سوچا اور اس تحریری وعدے کا بھی مجھے خیال آیا جس میں میرے والد نے یہ وعدہ لیا تھا کہ میں نہ سگریٹ پیوں گا اور نہ شراب کو ہاتھ لگاؤں گا اور نہ میں عورتوں سے کوئی رسم و راہ رکھوں گا تاکہ اس طرح سے میرا اصل مقصد ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہے۔ ایسا کرنا میرے والد کا مخصوص طریق کار تھا۔

سمندر میں نے پہلی دفعہ کراچی میں دیکھا۔ ایک ایسے پنجابی کے تخیل سے سمندر کا تصور ماورا ہے جس نے صرف طغیانی میں آئے ہوئے دریا ہی دیکھے ہوں۔ لیکن اگست کی ایک دوپہر کو جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے' میرے لئے سمندر اتنا بھی غیر مانوس نہیں تھا۔ یہ صحرا کی طرح بھورے رنگ کی ایک وسیع چادر تھی۔ مگر ریت کی خاموشی کے برعکس یہ حرکت کرتا تھا اور اس کی سطح اوپر نیچے ہوتی تھی اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے

والی گرج کے ساتھ یہ کیماڑی کی دیوار سے ٹکراتا تھا۔ لگتا تھا کہ ایک مردہ صحرا یکدم زندہ ہو گیا ہے سانس لے رہا اور اس کا سینہ اوپر نیچے حرکت کر رہا ہے اور اس کے ریت کے ٹیلے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ایک تال پر جھول رہی ہیں۔

کراچی سے بمبئی تک ڈاک لے جانے والا چھوٹا جہاز مانسون ہوا میں جھولتا اور لڑھکتا ہوا چلتا رہا۔ اس سفر کے دوران میں ایسی مصیبت میں مبتلا رہا جس کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ گھر سے دور ہونے کی افسردگی سمندر زدگی میں مدغم ہو گئی۔ میری چھوٹی سی لکڑی کی کیبن جس کے پردے جھولتے افق کو چھپانے کے لئے کھینچ دیئے گئے تھے ایک تنہا ڈولی کی طرح ادھر ادھر جھول رہی تھی۔ میں ایک جامد گھر' والدین اور دوستوں کے لئے ترس رہا تھا اور چاہتا تھا کہ آگے جانے کی بجائے میں واپس لوٹ جاؤں۔ انگلستان کیا ہو گا؟ وہاں کے لوگ کیسے ہوں گے؟ کیا وہ انگریز بھی ایسے ہی برے اور غیر مانوس ہوں گے جیسے کہ ہم پنجاب میں دیکھتے تھے؟ ہم نے سن رکھا تھا کہ انگلستان میں تو قلی بھی انگریز ہوتے ہیں جو کوٹ پتلون اور ہیٹ پہنتے ہیں کیا میں کسی قلی کو اپنا سامان اٹھانے کے لئے کہہ سکوں گا؟ انگلستان سے واپس آنے والوں کی زبانی میں یہ بھی سن چکا تھا کہ پبلک غسل خانہ استعمال کرنے پر ایک جھاڑو دینے والے انگریز کو دو آنے دیتے ہیں۔ یہ انگریز بھی سوٹ پہنتا تھا اور پایپ پیتا اور اخبار بھی پڑھتا تھا۔ وہ آپ کو سر کہتا تھا اور اگر آپ اس کو دو آنے زیادہ دے دیتے تو وہ آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا تھا۔ رستورانتوں میں لڑکیاں ہوتی تھیں جو آپ کے لئے کھانا لاتی تھیں۔ آپ انہیں میڈم نہیں کہتے تھے بلکہ الٹا وہ آپ کو سر کہتی تھیں۔ آپ اجنبیوں کے گھر میں رہتے تھے اور انہیں کرایہ ادا کرتے تھے۔ گھر کی مالکہ آپ کا کھانا پکاتی تھی' کپڑے دھوتی تھی اور آپ کا کمرہ گرم رکھنے کے لئے آگ بھی جلاتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے ہجوم سے گلیاں بھری رہتی تھیں جو ہر وقت بھاگتے تھے یا تیز تیز چلتے تھے اور ایسی ٹرینوں میں چڑھتے تھے جو زمین کے اندر جا کر غائب ہو جاتی تھیں۔ اپنے بنک میں جس پر سپرنگوں والا گدا تھا جو میری اذیت میں شدید اضافہ کر رہا تھا' پڑا پڑا میں جو کچھ میں سن چکا تھا' اس کی بنا پر اپنی آئندہ زندگی کا تصور کر رہا تھا لیکن تصویر بالکل سپاٹ اور غیر حقیقی تھی کیونکہ اس میں جانے پہچانے ابعاد کی کمی تھی۔

بمبئی میں ایک چھوٹے سے ساحلی جہاز سے آٹھ ہزار ٹن وزنی جہاز پر سوار ہونے کی حیرانی نے میری تمام پچھلی اذیتوں کو بھلا دیا۔ نیا جہاز بہت بڑا تھا اور سراسر تعیش تھا۔ اس میں راستوں' سیڑھیوں اور عرشوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ جہاز پر انگریزوں اور بالخصوص

سفید براق کلف والی وردیوں میں ملبوس جہاز کے عملے کی موجودگی سے میں تھوڑا سا مرعوب ہوا اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری کیبن میں میرا ہم سفر انگریز ہو گا تو میرے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے نئے انکشافات کے انتشار اور پرہجوم ڈیکوں کے ہیجان میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب جہاز نے سائرن بجایا اور وہ بیلارڈ پاٹر سے آہستہ آہستہ دور ہونا شروع ہوا۔ کچھ ہندوستانی نوجوان عرشے پر ایک خوف زدہ گلے کی طرح اپنی اپنی لاعلمی سے ایک دوسرے کی ہمت بندھا رہے تھے۔ ایک سٹیورڈ آیا اور اس نے لنچ کا اعلان کیا۔ میرا یہ پہلا لنچ تھا کیونکہ کھانا تو ہم پہلے بھی کھاتے تھے مگر اس کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور میں متجسس بھی تھا چنانچہ میں ایک میز پر دبک کر بیٹھ گیا جس پر پلیٹوں' گلاسوں اور چھریوں اور کانٹوں کی ایک پریشان کن قطار تھی۔ مینو کارڈ سے میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا اور میں نے نے سٹیورڈ کی تجویز کو بڑی مستعدی سے قبول کرتے ہوئے ایک روسٹ مٹن منگوا لیا۔ انگریزی کھانے سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ بغیر نمک اور مسالوں کے ابلے ہوئے آلو' سلاد کے کچے پتے اور ٹماٹر' بند گوبھی کے ابلے ہوئے موٹے موٹے ڈلے' ڈبل روٹی' مصنوعی دکھائی دیتا ہوا زرد مکھن' یہ سب اتنا ہی غیر مانوس تھا جتنا کہ سفید سوپ اور ابلے ہوئے کیک کی پڈنگ۔ اس وقت کولابا لائٹ ہاؤس کا چکر کاٹ کر جہاز مانسون کی پیدا کردہ بڑی بڑی موجوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس میں اب وہ سب جانی پہچانی تمام حرکات شروع ہو گئی تھیں جن سے میرا تعارف کراچی کے سفر کے دوران ہوا تھا۔ میں جلدی میں اٹھ کر غسلخانوں سے ہوتا ہوا نیچے اپنی کیبن میں پہنچ گیا۔

اگلے پانچ دن خالص عذاب کے دن تھے۔ پورٹ ہول بند ہو جانے سے کیبن میں گرمی اور رطوبت تھی۔ ایک تکیہ اور چادر اٹھا کر میں راستے میں رکھے ہوئے لکڑی کے بنچ پر لیٹنے کے لئے اوپر چلا گیا جہاں قدرے ٹھنڈک اور تازہ ہوا تھی۔ کچھ اور ہندوستانی طالب علموں نے بھی یہ جگہ دریافت کر لی تھی اور وہ سارے ایک نیم مردہ ڈھیر کی صورت میں وہاں پڑے تھے۔ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر رہے تھے نہ بیماری اور نہ ہی احساسات کا فقدان۔ جہاز پہاڑوں جیسی موجوں کو کاٹتا کر اپنا راستہ بناتا ہوا' ڈولتا' لڑکھڑاتا' گھومتا گھوماتا چلا جا رہا تھا۔ اس ڈھیر میں تین پنجابی تھے اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے اور ہم پہلے مل چکے تھے۔ ہم گھر اور ٹھوس زمین کے متعلق باتیں کرنے لگے جو خواہ کتنی سرد ہو یا کتنی ہی گرم' مگر ہمیشہ ہمارے قدموں کے نیچے رہتی ہے۔ غیر ہموار موجوں کی بجائے جو جہاز کو پاگل جھولے کی طرح ہر طرف جھولا رہی تھیں' ہم

میں ایک تیز اور غیر متحرک افق دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ہمیں اپنے سکول کے زمانے کی فزکس یاد آ گئی اور ہم نے کہا جہاز ڈوب نہیں رہا۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ارشمیدس درست تھا۔ جہاز ڈولتا تھا' چکر کھاتا تھا' اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر ہوتا تھا لیکن ہم بے حس و حرکت پڑے رہے۔ اندھیرے اور مرطوب دن رات میں مدغم ہو گئے۔ اگر طوفان جہاز کو شکست دے بھی دیتا یعنی وہ غرق بھی ہو جاتا تو ہمیں پرواہ نہ تھی۔

ایک دوپہر کو جہاز یکدم سیدھا اور متوازن ہو گیا۔ اور چرچرانے اور کراہنے کی آوازیں کی جگہ جو موجوں پر اوپر نیچے ہوتے وقت اس سے نکلتی تھیں' اب یہ بڑی ہموار طریقے سے مرتعش آواز نکالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ معجزہ دیکھنے کے لئے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساکن نیلے پانی کو کاٹتا ہوا جہاز بڑی شان سے جا رہا تھا اور اپنے پیچھے پانی میں ایک سفید لکیر چھوڑ رہا تھا۔ اوز پھر بحیرہ احمر کی بنجر پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب احساس تھا جس نے پچھلے ہفتے کی ساری کلفتیں مٹا دیں۔ ہم بھاگ کر نیچے گئے' شیو کی' نہائے اور کپڑے بدل کر پھر عرشے پر آ گئے تاکہ ہم بحری سفر کا ہیجان محسوس کر سکیں۔ عرشوں پر زندگی اب قہقہوں سے لبریز تھی۔ مسافر گزری ہوئی کلفتوں کا ازالہ کر رہے تھے اور سٹیورڈ اپنی مصروفیت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

میں نے اس شخص کو ڈھونڈ لیا جو کیبن میں میرا شریک سفر تھا۔ بمبئی میں وہ ایک کسٹمز افسر تھا۔ سوائے ان چند گھنٹوں کے جب وہ اپنے بستر پر پھیلا ہوا پڑا رہتا تھا جہاں سٹیورڈ اسے ہر رات پھینک جاتا تھا' وہ ناشتے کے وقت سے شروع کر کے رات گئے تک شراب پیتا تھا اور سگریٹ پھونکتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے کسی شخص کو شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سوائے ان دنوں کے جب ہمارے گھر برانڈی کی آدھی بوتل آئی تھی میں نے شراب دیکھی تک نہ تھی۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں واپس وطن جا رہا ہوں لیکن میں اس کے لہجے کی وجہ سے کچھ نہ سمجھ سکا اور نہ ہی لفظ ہوم کا مطلب مجھ پر واضح تھا اور میں نے پنجابی میں "ہیں"؟ کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے "ہیں" کی بجائے انگریزی میں لفظ "پارڈن" کہنا چاہئے تھا۔ اس پر مجھے بڑی شرم آئی اور شاید وہ یہ بات جان گیا کیونکہ پھر اس نے مجھ سے دوبارہ بات نہیں کی۔ جہاز پر اس قسم کے مسائل جگہ جگہ پیدا ہو رہے تھے۔ انگریزوں کے طور طریقوں کو جاننے والے زیادہ تجربہ کار ہندوستانی آرام سے گھومتے

پھرتے تھے لیکن ہم سادے تھے اور فطری طور پر ویسے ہی تھے جیسے ہماری تربیت کی گئی تھی چنانچہ ہمیں چھوٹی چھوٹی بہت سی مشکلات پیش آتی رہیں۔ کچھ منجھے ہوئے سخت جان مسافروں کو جو طوفان کے دنوں میں عرشے پر آئے تھے' ہمارا بینچوں پر ڈھیر کی صورت میں موجود ہونا برا لگا۔ آخر کپتان وہاں آیا' ہمیں دیکھا اور ہماری اذیت کا اندازہ لگایا اور ہمارے ذرا بہتر ہونے تک ہمیں ویسا ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر ہم اونچی آواز سے بولتے تھے اور اکثر عرشے کے دوسری طرف کھڑے شخص سے مخاطب ہوتے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ ہم بنی سنوری عورتوں اور ان کے کپڑوں کو گھور گھور کر دیکھتے تھے خصوصاً اس وقت جب وہ بے شرمی سے مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چکنے فرش پر پھسلتی تھیں۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کے دوران کافی پیتے وقت ہم میں سے ایک لڑکے نے پیانوں پر ایک ہندوستانی دھن بجائی اور یوں کافی پینے میں مخل ہوا۔ اس پر کیپٹن سے شکایت کی گئی۔ ایک تامل برہمن لڑکے نے جو آئی سی ایس کے لئے کیمبرج جا رہا تھا' بڑی دلیری سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اپنی پیشانی' بازوں اور سینے پر برہمنوں والے مخصوص نشان بنا کر وہ عرشے پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور منتر جپنے لگا۔ وہ اتنی دیر پڑھتا رہا کہ پورا عرشہ خالی ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ مذہبی کام سے وہ مامونیت حاصل ہو سکتی ہے جو جہاز کے سٹیٹ روم میں اسے میسر نہیں آ سکتی تھی۔

ہمیں تجربہ کار ہندوستانیوں نے بتایا کہ برطانوی جہازوں پر انگریزوں اور ہندوستانیوں میں ایسے جھگڑے ایک معمول ہیں۔ یہ بمبئی سے شروع ہو کر پورٹ سعید تک چلتے ہیں۔ لیکن بحیرہ روم میں داخل ہوتے ہی جہاز کا پورا ماحول بدل جاتا ہے۔ واپسی پر بھی پورٹ سعید تک ماحول خوشگوار رہتا ہے لیکن نہر سوئز کے مشرقی طرف پہنچتے ہی اس میں تناؤ آ جاتا ہے۔ سیکنڈ کلاس میں انگریزوں کا تعلق نچلے درمیانے طبقے سے تھا۔ ان میں محنت کش طبقے کے لوگ بھی تھے۔ ان کا تعلق کسٹمز' پورٹ ٹرسٹ' ٹیلیفون اور ریلوے ورکشاپ کے محکموں سے تھا۔ ہم ان کی سوشل شائستگی اور طرز عمل کے معیاروں پر بھی پورا نہیں اترتے تھے۔ وہ سادہ لوگ تھے اور اپنے کردار سے اس امر وضاحت کر دیتے تھے۔ چنانچہ جہاز پر دو گروپ بن گئے : ایک ہندوستانیوں کا اور دوسرا انگریزوں کا۔ دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ دونوں طرف سے واضح ناپسندیدگی نظر آتی تھی۔ ایک نوجوان بنگالی نے جو آرٹ کا طالب علم تھا اور سابقہ دہشت گرد ہونے کا دعوی کرتا تھا' ہمیں سیاست کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ایک انگریز پولیس افسر نے اسے تجربے کے لئے منتخب کیا ہے اور لندن میں واقع انڈیا ہاؤس کی دیواروں پر تصویریں

بنانے کے لئے اس کی سفارش کی ہے کیونکہ اس انگریز افسر کو امید [illegible] انگلستان میں قیام کے بعد وہ دہشت گردی سے باز آ جائے گا۔

ہم پنجابیوں کے لئے سب سے بڑی مصیبت کھانے کی تھی۔ ہم موٹی چپاتیاں' سفید مکھن اور دہی کھانا چاہتے تھے۔ ہم ملاحوں کے کوارٹرز میں گئے جہاں انجن روم میں کام کرنے والے پٹھان اور مغربی پنجاب کے لوگ رہتے تھے۔ ہم نے ان سے درخواست کرنے کی ٹھانی۔ وہ ہماری مشکل سمجھ گئے اور چیف آفیسر کے احتجاج کے باوجود ہم ان کے باقاعدہ مہمان بن گئے۔ ہمیں انگریزوں کی تمام چیزوں کو کھا جانے کی عادت سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ جانور کی ہر چیز بڑے مزے سے کھا جاتے تھے۔ ہمیں سور اور گائے کے گوشت' سٹیک اور پسلیوں سے سخت گھن آتی تھی۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ وہ بے چارے جانور کا سر' پائے اور اوجھڑی بھی کھا جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ انہیں کچھ تو چھوڑنا چاہئے۔ ایک صبح جب ہم ناشتے کے لئے جا رہے تھے۔ ایک مسلمان لڑکا بھاگتا بھاگتا ہمارے پاس آیا اور بتایا کہ یہ لوگ تو جانور کا جنسی عضو بھی کھا جاتے ہیں۔ ہیجان کی وجہ سے وہ سب کچھ پوری طرح بیان نہ کر سکا لیکن جب ذرا سنبھلا تو اس نے بتایا وہ اس وقت سیدھا ڈائننگ روم سے آ رہا ہے۔ سٹیورڈ اس کے لئے کلیجی گردے اور جانور کے جسم کا وہ مخصوص حصہ بھی لے کر آیا تھا۔ اس نے سوال پوچھنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور بھاگ کر ہمارے پاس آ گیا ہے۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا کیونکہ جب جھجکتے جھجکتے ہم میز پر بیٹھے تو ہمیں ساسیجز سے بھری ہوئی پلیٹ نظر آئی۔ اس کے بعد تو ہم ہر چیز کی توقع کر سکتے تھے۔

پورٹ سعید پر اتر کر ہم سیدھے نان بائیوں کی دکانوں پر پہنچے۔ بنگالی اور تامل اور پارسیوں کی کراہت کے باوجود ہم نے ایک غیر ہندوستانی شہر کے نظاروں پر نان گوشت [illegible] شام کو ترجیح دی۔ بہت سی فطیری روٹیوں اور گوشت سے جو شاید اونٹ کا تھا' [illegible] آئندہ سفر کے لئے تیار ہو کر ہم واپس جہاز پر پہنچے۔ جیسا کہ ہمارے تجربہ کار ہم [illegible] پیش گوئی کی تھی' دوسرے دن سے جہاز کا ماحول بدلنے لگا۔ یورپی ہوا کے پہلے [illegible] ہمارے ہم سفر اینگلو انڈین سے انگریز بن گئے۔ کئی برسوں کی گرمی اور کام [illegible] ہی اتر گئی۔ انہوں نے اب پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم کون ہیں' کہاں [illegible] ہیں اور ہم کیا سیکھنے یا کیا پڑھنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں مشور[illegible] دینے شروع کر دیئے۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ ایٹ ہوم محسوس کرنا شروع کر دیا اور ان کے آداب [illegible]

انداز سیکھنے پر وہ مسکرا کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں چونکہ فطرتاً تقلید کی طرف مائل ہوں، میں نے ان کی زبان اور انداز گفتگو، ان کی خوش اخلاقی، ان کی نرم گفتاری جلدی جلدی سیکھنا شروع کر دیا۔ میں ان کے کھانوں کی طرف بھی راغب ہو گیا اور میز پر کھانے کے اوزاروں کی پریشان کن تعداد سے بھی واقف ہونے لگا تھا۔ مارسیلز پہنچنے تک مجھ میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ میں نئی زندگی میں اپنا راستہ تلاش کر لوں گا۔

جب ٹرین لندن پہنچی تو ہر شخص مستقبل کے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ گھر اور والدین سے دور انہیں کئی سال ایک اجنبی ملک میں گزارنے ہوں گے۔ اس دوران کامیابیاں بھی ہوں گی اور ناکامیاں بھی، ناامیدیاں بھی ہوں گی اور بحران بھی جن کا مقابلہ اکیلے ہی کرنا ہو گا اور اکیلے ہی فیصلے کرنے ہوں گے۔ ہم سب انگلستان، سکاٹ لینڈ اور ویلز کی یونیورسٹیوں، ہسپتالوں، ورک شاپوں اور دفتروں میں پھیل جائیں گے اور اس دوران ہم کئی قسم کے مضامین پڑھیں گے، کئی پیشے سیکھیں گے اور مہارتیں حاصل کریں گے۔ کئی تو مقصد کے حصول کے لئے سیدھے راستے پر چلتے رہیں گے اور کئی بدنصیبی سے اپنی ہی کوتاہیوں کے سبب آدھے راستے میں ہی رہ جائیں گے۔ کچھ بھٹکنا شروع کر دیں گے، پہلے مزے لیں گے اور پھر بھنور میں پھنس جائیں گے اور وقت انہیں ایک طرف پھینک دے گا۔ وہ اپنی زندگیاں اونے کام جیسے ہندوستانی ریسٹورانٹوں میں بیرے وغیرہ بن کر گزار دیں گے۔ ان میں نہ واپسی کا حوصلہ ہو گا اور نہ ہی اس ملک میں دوسرے ہندوستانیوں سے ملنے کا۔ واپسی پر قسمت کیا گل کھلائے گی؟ ہندوستان میں ملازمتوں کی پہلے ہی کمی تھی انگلستان میں ہمارے قیام کے دوران ہندوستان میں یہ کمی بھی سوہان روح رہے گی۔ میلوں میل گھروں کے جڑے ہوئے پچھواڑوں سے جن کے چھوٹے چھوٹے صحن سب ایک جیسے تھے، ہم حال اور مستقبل کے اندیشوں میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہے تاآنکہ ٹرین نے ہمیں لندن کی پہنائیوں میں اگل دیا گیا۔

وکٹوریہ سٹیشن پر ہر شخص کو لینے کے لئے کوئی نہ کوئی رشتے دار، دوست یا کوئی ملنے والا آیا ہوا تھا۔ میرے لئے میرا بڑا بھائی منتظر تھا جو صبح سے پیرس سے آنے والی ہر ٹرین کو دیکھ رہا تھا۔ جہاز سے اس کی کیبل کے جواب میں میں نے اسے اپنے لندن پہنچنے کی متوقع تاریخ سے مطلع کر دیا تھا لیکن مجھے یہ خیال ہی نہ تھا کہ ایک دن میں لندن پہنچنے والی کئی ٹرینیں تھیں میں نے اسے ساڑھے چار سال پہلے دیکھا تھا۔ اب وہ اتنا بدل چکا تھا کہ میں اسے بمشکل پہچان سکا۔ وہ مجھ سے اتنا مختلف تھا کہ میں قدرے خود شعوری کا شکار ہو گیا۔

وہ اتنا غیر پنجابی اور اتنا انگریز لگ رہا تھا یہاں تک کہ اس کی جلد کا رنگ بھی جگہ جگہ سے بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑوں کی تراش مختلف تھی۔ اس کے جوتے اور سوفٹ ہیٹ ان سے کہیں مختلف تھا جو میں لاہور سے انگلستان کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی پنجابی بھی غیر مانوس لگ رہی تھی اور اس کے جملوں کی ساخت بھی انگریزی ہو چکی تھی۔ ہم نے بڑے بے ڈھب طریقے سے گھر اور سفر کے بارے میں باتیں کیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے سفر میں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی مشکلات کے متعلق اسے بتایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں انگریز بڑے مختلف ہیں اور ہندوستان میں جو کچھ میں نے ان کے بارے میں سن رکھا تھا وہ سب مجھے بھول جانا چاہئے۔

اگلے آٹھ برسوں کے لئے انگلستان ہی میرا گھر ہو گا۔ اس کے بعد شاید مجھے یہ احساس ہو کہ مجھے واپس جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس دوران مجھ پر منکشف ہو گا کہ انگریز جو اپنی علیحدگی اور تکلف کے لئے بدنام ہیں، اندر سے بڑے جذباتی ہیں اور کچھ چھپا کر نہیں رکھتے بشرطیکہ آپ ان کے ہو جائیں۔ اور میں ان کا ہو گیا۔

تیرھواں باب

لندن میرے لئے بہت بڑا تھا اور دو دن میں ہی وہ مجھ پر غالب آ گیا۔ میں بڑی خوشی سے مانچسٹر روانہ ہو گیا۔ میرے بھائی نے میرے لئے رہنے کا انتظام کر دیا تھا اور جاتے ہی میں وہاں تک گیا۔ اگلے دن میں اپنے پرنسپل کے پاس گیا جس نے مجھے آرٹیکل شپ دے دی اور پھر میں یونیورسٹی چلا گیا۔ اب مجھ پر زندگی کا ایک ایسا باب وا ہوا جہاں ہر چیز میرے لئے نئی تھی۔ میں کہیں بھی ہوں --- اپنے کمرے، کالج یا شہر میں --- تاثرات بڑے بڑے اور بڑی تیزی سے آنے لگے۔ اپنے معاملات میں میری خود مختاری، یونیورسٹی کی سوشل اور تعلیمی آزادی، انگیخت پیدا کرنے والے لیکچر اور یونین کی سرگرمیوں نے مرے اندر نشاط افزا احساسات پیدا کیے۔ معاملہ بہت بڑھ گیا اور مجھے چونکا دینے والے پریشان خواب آنے لگے کہ مجھے فوراً واپس بلا لیا گیا ہے۔ جب میری آنکھ کھل جاتی تو اطمینان ہوتا تھا کہ یہ تو اصل میں آغاز ہے۔

اتنی بھرپور زندگی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لاہور میں تو کبھی کبھار کی غیر نصابی سرگرمیاں صرف ایک مباحثے تک ہی محدود ہوتی تھیں جس میں ہمیشہ ایک پروفیسر صدر ہوتا تھا یا کبھی کوئی مہمان ایک آدھ لیکچر دیتا تھا اور اس میں بھی پروفیسر ہی صدارت کرتا تھا۔ آپ صرف سنتے تھے۔ سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ مباحثے سراسر غیر سیاسی ہوتے تھے۔ اور گفتگو کے موضوع ممکنہ حد تک بے ضرر۔ اب میں ایک ایسے ماحول سے روشناس ہو رہا تھا جس کو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اور یہ اس حد تک انگیخت کرنے والا تھا کہ مجھے اپنے آپ سے بار بار کہنا پڑتا تھا یہ سب کچھ خواب نہیں عین حقیقت ہے۔ میں ایک عجیب صورت حال سے دو چار تھا۔ میں لیکچروں، مباحثوں، تقریروں، مذاکروں سوسائیٹیوں کے جلسوں، موسیقی کی محفلوں اور سماجی بیٹھکوں میں موجود رہتا تھا۔ دلچسپیوں سے دن اس حد تک معمور تھے کہ وہ پریشان خواب بار بار واپس آ جاتا تھا۔ لیکن اس زندگی کا حصہ بننے سے پہلے مجھے ایک اہم مسئلہ در پیش تھا۔

ہندوستانیوں کی اکٹھے ہو جانے کی عادت جہاز ہی سے شروع ہو گئی تھی اور یہ انگلستان

میں بھی جاری رہی۔ لیکچروں کے بعد جب لوگ کالج یونین میں جاتے تو وہ خود ہی ایک کونے میں چلے جاتے جہاں ہندوستانی طالب علم پہلے سے ہی موجود ہوتے تھے۔ وہاں کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اور کوئی موضوع گفتگو تلاش نہیں کرنا پڑتا تھا۔ گھر کے بارے میں صرف ایک آدھ سوال کافی ہوتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس دوسری طرف انگریزوں کے کسی گروپ میں نہ تو ہم آسانی سے جاتے تھے اور نہ ہی اپنے آپ کو متعارف کراتے تھے کیونکہ گفتگو کے موضوعات غیر مانوس ہوتے تھے۔ مزید' ان کا روز مرہ ہمیشہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہندوستانیوں نے ایک دوسرے کو بہت جلد جاننا شروع کر دیا تھا اور باہم دوستانہ بھی ہو جاتا تھا اور مل جل کر اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ مشترکہ مسئلہ کھانے کا تھا کیونکہ اس وقت مانچسٹر میں ہندوستانی رسٹورنٹ نہیں تھے کوئی تجربہ کار لینڈ لیڈی کبھی کبھی کڑی پکا دیتی تھی جو صرف شکل میں ہی کڑی ہوتی تھی۔ چنانچہ ہمیں اکثر اپنی مہارت پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ پنجابیوں میں یہ مہارت کافی تھی۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ اپنے رویّوں کی پہچان اور اس کے نتائج کی دوسروں اور خصوصاً ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے آئے تھے' جانچ پرکھ تھی۔ شرمندگی کے کسی احساس کا شکار ہوئے بغیر آپ اپنے مسائل ان لوگوں کے پاس لے جا سکتے تھے۔ اکٹھے ہو جانے کی عادت بڑی معتبر تھی اور اس میں خامیاں بھی تھیں۔ تعلیم کی روزن کے سوا یہ رویہ زندگی کی دوسری تمام کھڑکیوں کو بند کر دیتا تھا۔ لیکچرز کے بعد آپ کی زندگی ویسے ہی تھی جیسے وطن میں ہوا کرتی تھی۔ اس موقعے کے سوا جب آپ کو کسی سے کوئی کام پڑ جائے آپ کو اپنے نئے ماحول سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ بغیر شخصی حوالے کے آپ کے مشاہدات کند ہو جاتے ہیں اور آپ انہیں ایسے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے جو آپ کے اپنے نقطہ نظر سے قریب تر ہو۔ اس چیز نے مجھے احساس محرومی میں مبتلا کر دیا اور میں بے چین رہنے لگا۔

کسی غیر ملک کی زندگی میں بھرپور حصہ لینا اتنا آسان نہیں۔ ہم انگریزوں پر علیحدگی پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ ہندوستان میں وہ ہم پر حکمران تھے اور مسائل اسی وجہ سے پیدا ہوتے تھے' ورنہ انگلستان میں ہمارے مسائل اور ہندوستان میں ان کے مسائل میں چنداں کئی فرق نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ روش بدلنے کا معاملہ کہاں سے شروع کیا جائے اور اس مشکل کے حل کی قیمت کیا ہو گی۔ سب سے بڑی مشکل اپنے گروپ کو چھوڑنا تھا جسے عام طور پر غیر ضروری غداری سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہ گروپ آپ کو خود کفیل سوشل زندگی

فراہم کرتا تھا۔ اگر آپ کو سینما جانا ہوتا تو آپ کو کسی انگریز دوست کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بہت سارے ہندوستانی دوست موجود تھے جن میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ جا سکتا تھا۔ اگر آپ چند انگریز لڑکوں کے ساتھ طعام گاہ میں بیٹھے ہیں یا ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر چلے گئے ہیں تو آپ کو جتایا جاتا تھا کہ آپ دوسری طرف جھک رہے ہیں۔ کسی انگریز سے دوستی کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ آپ اپنوں یعنی ہندوستانیوں سے شرمسار ہیں۔ بلاشبہ کچھ ہندوستانی لڑکوں کے لئے انگریز لڑکوں سے دوستی بڑی باعث فخر تھی لیکن یہ دبے ہوئے احساس کمتری کا نتیجہ تھی۔ جو ہندوستان میں انگریزوں کی روش کی پروردہ تھی۔ احساس کمتری کی بنا پر کچھ ہندوستانی حد سے زیادہ بڑھ کر دوستی کر لیتے تھے اور کچھ غیر ضروری طور پر شبہ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ بہت کم لڑکوں میں فطری توازن تھا۔ عموی رویہ یہ تھا کہ انگریزوں نے ہمیں ہندوستان میں نظر انداز کیا ہے ہم انہیں انگلستان میں نظر انداز کریں گے۔

یہ بڑی پیچیدہ صورت حال تھی جسے ہندوستان کے ہمدرد انگریز مرد اور عورتوں نے اپنے گھروں اور سوشل اجتماعوں میں ہمیں مدعو کر کے حل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس رویے سے کسی فوری تلافی کی توقع تو نہیں تھی تاہم ایسے لوگوں کا میں صدق دل سے معترف ہوں۔ ایسی صورت میں ہم میں سے اکثر کا رد عمل حقارت آمیز تھا کچھ لوگ ہندوستان میں انگریزوں کی نا انصافیوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ کبھی کوئی انگریز ہلکی سی مدافعت کرتا یا کوئی دوسرے زاویہ نگاہ سے صورت حال کو دیکھنا تجویز کرتا تو ہم اسے بھی سامراجی زاویے کا ثبوت قرار دیتے تھے۔ جس نے ہندوستانیوں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہماری بات عموماً ہمدردی سے سنی جاتی تھی جس سے ہم کبھی آبدیدہ اور کبھی گستاخ ہو جاتے تھے۔ ناخواندگی' غربت' بچپن کی شادیاں اور کئی دوسرے مسائل کے لئے ہم صرف انگریزوں کو ہی مورد الزام ٹھہراتے اور اپنے آپ کو ہر کوتاہی یا خامی سے مبرا قرار دیتے تھے۔ مزید براں انگریزوں کو یہ الزام بھی دیا جاتا تھا کہ اگرچہ ان مسائل سے ہم خود ہی چمٹے ہوئے تھے مگر ہماری اس روش کو نظر انداز کر کے انگریزوں نے ان کا ازالہ کیوں نہیں کیا۔

ایک دن میں نے یو پی کے سابقہ گورنر لارڈ ہیسٹنگز آف آگرہ کا لیکچر سنا۔ وہ ایک نرم خو شخص تھا۔ اس کے انکسار اور بے تکلفی سے میں بڑا متاثر ہوا۔ اس سے میری ملاقات سڑک پر ہی ہو گئی۔ اس نے مجھ سے اس جگہ کا پتہ پوچھا جہاں اس نے لیکچر دینا تھا۔ ایک

انگریز لارڈ کا جو گورنر رہ چکا ہو' میکنٹوش پہنے' گیلے فٹ پاتھ پر اپنا بیگ اٹھائے ہوئے نظر آنا ایک ایسا منظر تھا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اکٹھے سیڑھیاں چڑھے اور جب ہم کمرے میں پہنچے تو وہ جھکتا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سوسائٹی کے سیکریٹری نے اسے پہچان لیا۔ اس کا لیکچر بڑا متوازن تھا اور اس نے کافی معلومات بہم پہنچائیں لیکن میں بت چڑ گیا تھا کیونکہ اس نے ایک بار سے زیادہ اس مقبول عام مفروضے کا ذکر کیا کہ ہندوستان میں برطانیہ کا ریکارڈ خیر ہی خیر تھا اور خیر کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور نوجوان انگریزوں کو اس پر فخر کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسی بات پر مروز لیگ میں کرتا تو معاملہ ٹھیک ٹھاک رہتا لیکن یہاں تو بشمول میرے نئے نئے ابھرتے ہوئے سوشلسٹ بیٹھے تھے اور انہوں نے سوال جواب کے دوران اسے خاصا دق کیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے میرے کان میں کہا "شاید تمہیں ہندوستان سے نہیں ان چاہئے تھا"۔ لیکن اس کی یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔

جلد ہی برطانوی سلطنت پر گفتگو کرنے کے لئے میں ایک مباحثے میں کھڑا ہوا۔ تقریر سے پہلے جب میں بیٹھا ہوا تھا تو میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں تقریر کے لئے ضروری جرات فراہم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں نے تقریر شروع کی تو حال کی بتیاں بجھ گئیں۔ لوگوں نے کہا کہ میں تقریر جاری رکھوں۔ روشنی آتی جاتی رہی لیکن میں نے بلا خوف اپنی تقریر جاری رکھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ میرا خیال ہے کہ چند ایک دلائل کے تیروں اور اپنے اٹھارہ سالہ اخلاص سے میں برطانوی سلطنت کے معاملے کو برباد کر دیا گو جو کچھ پنجاب کے لئے انگریزوں نے کیا تھا' میں نے اس کی تعریف بھی کی۔ مجھے احساس ہوا کہ شدید تنقید کو نوجوان انگریز برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں مزاح اور اخلاص ہو تو یہ اور بھی بہتر ہے لیکن خواہ ہم تنقید کریں یا تعریف ہمارے لئے یہ اتنا آسان نہیں۔ کسی لگی لپٹی کے بغیر ہم بڑے غیر مبہم طریقے سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کو بیان کرنا احسن سمجھتے ہیں۔

تقریر کے بعد میں نے سنجیدہ کام کے سوا اپنے آپ کو یونیورسٹی کے ہر قسم کے مشاغل کے لئے وقف کر دیا۔ میں اس آزادی پر عش عش کرتا تھا جہاں لڑکے لڑکیاں اپنے آپ کو کسی بھی سرگرمی کے لئے منظم کر سکتے تھے اور کوئی بھی اس بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ بغیر بلائے کوئی پروفیسر یونین میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان مباحث کا موضوع سیاسی قدامت پسندی یعنی کنزر و ـٹزم' کیمونزم' نیل ازم' میری سٹوپس' یا کوئی اور ایسا معاملہ ہو سکتا تھا

جس پر ہم بحث کرنا چاہیں او مباحث کا نقطۂ عروج اور سب سے زیادہ پر جوش اور تلخ ترین مباحثہ وہ تھا جس کا تعلق بادشاہ اور ملک سے تھا۔ قرارداد تھی :" بادشاہ اور ملک کے لئے یہ ایوان کسی حالت میں بھی نہیں لڑے گا"۔ یہ قرار داد پاس ہو گئی۔ میں خوش بھی تھا اور حواس باختہ بھی۔ اس بحث کے بعد سکلات والا کا لیکچر تھا یہ پارسی تھا۔ اس کا تعلق ٹاٹا کے خاندان سے ساتھ تھا لیکن وہ یہاں آباد ہو گیا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کا پہلا کیمونسٹ ممبر تھا اس کی تقریر بڑی روشن خیال اور بیباک تھی اور ہال میں بلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کسی انگریز کا بادشاہ کے خلاف بات سننا بہت بڑا ارتداد تو تھا ہی لیکن ایک ایسے ہندوستانی کیمونسٹ کا جسے انگریزوں نے ہی پارلیمنٹ میں بھیجا تھا' ایسی تقریر کرنا ایسی بات تھی جسے نوجوان قدامت پسند برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک نوجوان ٹوری نے بڑے جذباتی انداز میں کہا " جناب اس خوبصورت ہال کی تاریخ میں اس کی دیواروں پر اتنی گندگی کبھی نہیں پھینکی گئی۔ اسے صاف کرنے میں کئی سال اور کئی نسلیں درکار ہوں گی"۔

بادشاہ اور ملک کی بحث اور سکلات والا کے لیکچر کے بعد میں اتنا ششدر ہوا کہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہ تھا۔ پھر یہ انگریزوں کا اپنا جھگڑا تھا۔ میرے جذبات ملے جلے تھے۔ میں اتنی آزادی دیکھ کر خوش تھا اور افسردہ اس بات پر تھا کہ اتنی آزادی شاید ہندوستان کے نصیب میں نہیں۔ مگر ہندوستان کا مسئلہ میرے ذہن سے بڑی تیزی سے نکل رہا تھا۔ مجھ میں انبساط کا ایک ایسا احساس تھا جس کا مجھے پہلے تجربہ نہیں تھا۔ میں نئی زندگی کے ورطے میں کھنچا چلا جا رہا تھا اور پیچھے چھوڑی ہوئی اپنی زندگی سے زیادہ سے زیادہ لا پرواہ ہوتا جا رہا تھا۔

میری روش کے متعلق کچھ ہندوستانی لڑکوں کا رد عمل بہت خراب تھا۔ ان کی نظر میں میرے اندر واقع ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ " بادشاہ کے لئے روائتی پنجابی وفا داری" تھی۔ اس میں طنزیہ پہلو یہ تھا کہ اصل میں تو یہ انگریز ہی کا مقولہ تھا جسے ہم کبھی بھول نہ سکے تھے۔ کچھ بنگالیوں نے دوسرے لڑکوں کو بتایا کہ میں جاسوس ہوں اور میرا تعلق پولیس والوں کے خاندان سے ہے۔ کچھ عرصے کے لئے یہ مسئلہ خاصی ناخوشگوار صورت حال اختیار کر گیا کیونکہ اس الزام کے جواب میں میں انگریزوں کی خوبیاں اور ہندوستانیوں کی کوتاہیوں بیان کرتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ انگریزوں کو ملامت کرنے سے پیشتر اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہئے۔ ایک خاصے پرانے طالب علم نے جو رڑکی میں لیکچرار تھا اور نیا نیا انگلستان آیا تھا میری رائے سے پورا پورا اتفاق کرتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے خبردار بھی کیا کہ

ہندوستان واپسی پر میں انگریزوں سے بڑا نا امید ہوں گا۔

ایک مشغلے سے دوسرے میں مصروف رہنے سے وقت مزے میں گزرنے لگا۔ فطری طور پر بدیسی پن نے اپنی جڑیں مرے اندر آسانی سے اتار لیں تھی۔ چنانچہ انگریز میرا خیر مقدم کرتے تھے۔ میں ان کے طور اطوار اپنانے میں بڑی مسرت محسوس کرتا تھا۔ کسی مصروف شام کے بعد اب مجھے ان کی پیاز اور اوجڑی مین بھی مزہ آنے لگا تھا۔ گو میرے لیے وہ اتنی پسندیدہ چیز نہیں تھی لیکن میرے بھائی نے تو انگریزوں کی بری بلیک پڈنگ پسند کر کے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ میں نے اپنے تمام امتناع ختم کر دیے تھے۔ بیسٹر' فش اینڈ چپس' ہاٹ پاٹ' مرغی ہڈیاں اور فحش کہانیاں مجھے اچھی لگنے لگیں۔ میں نے ان کے لہجے کا لمبا اے بھی اپنا لیا اور یوں میں ممکنہ حد تک لنکا شائر کے دل کے قریب ہو گیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں اب بھی فطری قرابت داری کا اتنا احساس تھا کہ ایک بوڑھے گاڑی والے کو جو سامان ادھر سے ادھر لے کر جاتا تھا' ایک پورا ہاف کراؤن دے دیا کیونکہ اس نے یہ کہا تھا ہمیں ایک ہاف کراؤن اور دے دو۔ سر' میں نے کئی دفعہ آپ کے رانجی کو ٹریفورڈ میں کرکٹ کھیلتے دیکھا ہے۔ خدا کی قسم' وہ واقعہ ایک بڑا کریکٹر تھا"۔

میں نے لنکا شائر کا لب و لہجہ اور طرز گفتار بڑی آسانی سے اپنا لیا۔ ان دنوں اسے گھٹیا تعلیم کی نشانی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کالج میں لیکچراروں اور طالب علموں کی بھی شمالی علاقے والی گفتگو کی وہی نرم زبان تھی جس کا لہجہ بڑا مترنم تھا۔ واکر' وائنڈر' اینٹ وسل' لیتھ ویٹ' قسم کے ناموں والے لڑکے لڑکیوں سے کلاس بھری ہوئی تھی۔ یہ لوگ لنکا شائر کی وادیوں اور وگن کی کانوں کے قرب و جوار کے رہنے والے تھے اور بڑے منکسر المزاج اور سیدھے سادھے تھے۔ یہاں کے لوگ اکثر دو زبانیں بولتے تھے۔ گھروں میں ایک قدیم قسم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن کالج میں لنکا شائر کے لہجے میں جدید انگریزی بولتے تھے۔ ان کے قریب ہونا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ آپ کو اکیلا چھوڑ دینا پسند کرتے تھے۔ لیکن جب آپ کو پسند کرتے تھے تو ان میں پورا اخلاص اور گرم جوشی ہوتی تھی۔

میرے لئے وہ ایک پریشان دن تھا جب میں تقریباً عیسائی ہو چکا تھا اور اس موقعے کا مزاحیہ پہلو اس وقت میری گرفت میں نہیں آیا تھا۔ ایک خاندان نے اتوار کے روز مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا۔ ان کی بیٹی خوبصورت تھی اس لئے میں نے یہ دعوت بڑی خوشی سے قبول کر لی۔ چائے پر ہندوستان کے متعلق بڑے شائستہ قسم کے سوالات پوچھے گئے اور یقین دہانی کرائی گئی کہ مناسب وقت پر سلطنت میں ہندوستان برابر کا شریک ہو جائے گا خصوصاً

اس وقت جب میرے جیسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں چرچ جانا چاہوں گا۔ چونکہ وہ سب بشمول اس لڑکی کے چرچ جا رہے تھے اس لئے میرے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

یہ چرچ ایک قسم کی عارضی اقامت گاہ تھی۔ سکاٹ لینڈ کا ایک پر جوش باشندہ صدارت کر رہا تھا۔ یہ ایک سادہ سا ہال تھا جس میں ایک پلیٹ فارم تھا اور اس کے اوپر دو عورتیں' ایک وائلن اور دوسری ہارمونیم کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ میں اس سے پہلے چرچ سروس میں کبھی نہیں گیا تھا تاہم میرے تصور سے یہ چرچ بڑا مختلف تھا۔ چند پرجوش نغموں کے بعد جو بڑے جذبے سے گائے گئے تھے' لاونج سوٹ میں ملبوس الجھے ہوئے بالوں والا پادری سٹیج پر آیا اور بڑی نرمی سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ پہلے اس نے مجھے بڑی اچٹتی نظر سے دیکھا اور پھر ہر شخص پر اپنی نظریں گاڑتا چلا گیا۔ جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے ذہانت آمیز دلچسپی دکھائی اور موافقانہ طریقے سے مسکرایا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ایسا کرنا ہی میری بربادی تھی۔

پادری آہستہ آہستہ گرم ہوا۔ تمام سامعین یعنی عورتیں' بچے بڑے غور سے اس کی باتیں ایسے سن رہے تھے جیسے انہوں نے یہ پہلے کبھی نہ سنی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد پورے ہال میں اس کی آواز گونج رہی تھی اود وہ کانپ رہا تھا' اس کے بال بادل کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ قدم جما کر سٹیج پر کھڑا تھا۔ اپنے سامعین کو کوئی تسلی دئے بغیر وہ بے رحمی سے دھمکا رہا تھا۔ سامعین میں خوف سرایت کرنے لگا۔ اور جب اس نے گرج کر پوچھا "کیا تم جہنم میں زندہ جلو گے"؟ تو سب نے دبی زبان میں کہا "نہیں ہمیں نجات دلا دو"۔ پھر بڑی نرم اور اعتماد بحال کرنے والی آواز میں اس نے دھیمے طریقے سے کہا "ہاں میں تمہیں نجات دلا دوں گا"۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر اپنی زبان کے کوڑے برسانے لگا "ہاں اگر تم نجات کے قابل ہوئے تو۔ اگر تم خود نجات چاہو گے تو"۔ "ہمیں نجات دلا دو"۔ سب نے پھر یک زبان ہو کر کہا "ہم نجات چاہتے ہیں"۔

میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے اوپر کونسا جادو چل گیا ہے؟ انہوں نے کیا گناہ کیا ہے جس کی سزا کے خوف سے یہ لوگ اتنے پریشان ہیں؟ اور وہ انہیں دھمکا کیوں رہا ہے؟ وہ ان کو بچانے کے لئے کیا کرے گا؟ اس نے ہال کا پھر جائزہ لیا اور گرج کر بولا "میں تمہیں نجات دلاؤں گا۔ خواہ تم سفید فام ہو یا تمہارا رنگ براؤن ہے' خواہ تم انگریز ہو یا غیر ملکی' خواہ تم عیسائی ہو یا کافر"۔ اب سب کو پتہ چل گیا

اور وہ اپنی گردنیں لمبی کر کے حوالے کی اس مخصوص شے کو یعنی مجھے دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں نے مجھے آتے دیکھ لیا تھا اور دوسروں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ میرے میزبانوں نے بڑے فخر سے مجھے دیکھا اور میں اپنی جگہ پر سکڑنے لگا۔

اب اس شکار میں دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک براؤن رنگ کے کافر کو طشتری میں ڈال کر پیش کرنے سے یہ اتوار بڑا شاندار ہو جائے گا۔ جنم سے اس قسم کا بچاؤ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پادری دھمکاتا تھا اور غلاتا تھا' تکرار کرتا تھا ار پھر نرمی سے بولتا تھا تاکہ میں اپنے آپ کو نجات کی ترغیب دے سکوں۔ سارا مجمع اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ کچھ نوجوان مرد عورتیں کھڑے ہو گئے ار درخواست کرنے لگے کہ ان کو نجات دلائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے ایسا کیا گیا تھا۔ لیکن میری مشکل کو کوئی بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے مبہم سا خیال تھا کہ نجات کا مطلب بپتسمہ لینا تھا جس کے معنی سب کے سامنے ننگا ہو کر نہانا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ موسم بہت ٹھنڈا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ میں سب کے سامنے ننگا ہو کر نہانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کوئی خطرہ مول نہ لیا اور اپنی جگہ پر ہی جما رہا۔

سروس کے بعد میں نے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے نیم دلی سے پھر آنے کو کہا لیکن اتنا ضرور واضح ہو گیا کہ وہ سب سخت نا امید ہوئے ہیں۔ میری حالت بھی بڑی قابل افسوس تھی کیونکہ میں سب کو خوش کرنا چاہتا تھا۔

جب دنیا میں بڑی بری تبدیلیاں ہو رہی تھیں انگلستان میں رہنا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ جب میں اس کے ملک کو' اس کے لوگوں اور اداروں کو جاننے لگا تو میں نے بھی اسی ذہنی عمل میں حصہ لینا شروع کر دیا جو ان تبدیلیوں کے پیچھے کار فرما تھا۔ مجھے یونیورسٹی کی زندگی پر ایک کمیٹی میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ میں یونین کی مجلس عاملہ کے رکنیت کے لئے منتخب ہو گیا اور مباحثے کی ایک ٹیم کا لیڈر بن کر برطانوی یونیورسٹیوں میں گیا۔ مجھے کئی اور معاملات کے لئے مدعو کیا گیا۔ یہی وقت عظیم بحران' بھوکوں کے جلوسوں اور "لو آن ڈول" کا زمانہ تھا۔ میں ایسے گھر میں رہ رہا تھا جس کا سربراہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ بے روزگاری کے کیا معنی ہیں۔ جب تک ان کی خود داری نے ساتھ دیا وہ بیروزگاری کے وظیفے سے انکار کرتے رہے۔ اس زمانے میں یہی ان کا ذریعہ آمدنی تھا۔

اس گھر میں دونوں میاں بیوی کنزرویٹو پارٹی کے حامی تھے اور میرا پر جوش رجحان لیبر کی طرف تھا۔ میں اس عمل کو دیکھ سکتا تھا جس نے میری سوچ کو متاثر کیا لیکن مجھے یہ سمجھ

ہیں آ رہا تھا کہ اس خاندان اور کنزرویٹو پارٹی میں کون سی قدر مشترک ہے۔ رفتہ رفتہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ ان کے محنت کش طبقے کے قریب ہونا اور امیر اور غریب طبقے کے درمیان خط کو عبور کرنے کی ان کی شدید کوششیں بڑی دلچسپ تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے ہی انہوں مجھے مہمان کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ ہم پہلے ایک ایسی گلی میں رہتے تھے جس میں مکانوں کی پشتیں ایک قطار کی صورت میں باہم جڑی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک پچھواڑہ تھا اور سامنے سیڑھیاں تھیں۔ ان کی نظر میں ایسے گھر محنت کش طبقے کی نفرت انگیز علامت تھے۔ خاتون خانہ ایسے گھر سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ اس کے شوہر کے کمشن میں تھوڑے سے اضافے اور اس معقول رقم سے جو میں ان کو ادا کرتا تھا' اس خاتون نے سوچا کہ وہ اپنی پسند کا گھر لے سکتی ہے۔ "بچوں کی ایسے گھر میں پرورش جس کا پچھواڑا ہو اور سامنے باغ نہ ہو! ممکن ہے کہ جہاں سے میں آئی ہوں ٹھاٹھ دار نہ ہو لیکن ہمارے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے پیچھے چند ایک درخت تھے اور میں وہیں جا رہی ہوں جس جگہ سے میرا تعلق ہے"۔ مجھے اس کا اپنے سر کو دلیری سے اچانک اوپر اٹھانا جس سے اس کے گھنٹی کی صورت میں بنے ہوئے بال لہرائے اور اس کی لنکا شائر کی نرم زبان اور لہجہ بڑے اچھے لگے جب اس نے اپنی تمام فصاحت اس بات پر صرف کر دی کہ ہر طبقے کو اسی طرح رہنا چاہئے جیسا کہ ان کا مقدر ہے۔

بڑی سوچ کے بعد میری میزبان خاتون اصل موضوع کی طرف آئی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان کے ساتھ رہنے پر خوش ہوں۔ اگر میں واقعی خوش ہوں تو وہ اس علاقے کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا چاہتی ہے۔ میں اسے اچھی رقم دے رہا تھا اور وہ مجھے اس کا پور معاوضہ دے رہی تھی۔ اس کے دل میں اپنے پڑوسیوں کے خلاف کچھ نہیں تھا لیکن وہ کونسل اسٹیٹ کے کسی گھر میں جانا چاہتی تھی۔ جس کے سامنے اور پیچھے چھوٹے چھوٹے باغیچے ہوں اور جو تھوڑا سا الگ ہو۔ ایسا گھر "ان کے اور ان کے بچوں کے لئے مناسب ہو گا"۔ میں بھی جذباتی ہو گیا کیونکہ وہ مجھے اپنے گھر کا فرد شمار کرنے لگی تھی۔ جس سیدھے سادھے طریقے سے اس نے سوال کیا تو مجھے ایسے لگا کہ میں اس خاندان کی ترقی اور گھر کی امنگوں کا حصہ بن گیا ہوں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ جب تک میں وہاں ہوں میں انہی کے ساتھ رہوں گا اور چونکہ مجھ میں بھی شمالی علاقوں والی چالاکی آ گئی تھی میں نے مزید کہا کہ "جب تک وہ میرا اچھی طرح خیال رکھے گی اسے فکر نہیں کرنی چاہئے"

چنانچہ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک کونسل ہاؤس میں آ گئے جس کا اپنا دروازہ تھا اور

تاروں کی باڑ تھی۔ اس کے سامنے ایک لان تھا اور پچھواڑے میں باغیچہ تھا۔ الامنتس میں جا کر اس کا شوہر ایک مزدور کی طرح کھدائی کرنے کی بجائے اپنے ہی گھر میں ہی گھاس کاٹے گا اور کھدائی کرے گا۔ گھر میں اوپر ایک مناسب غسل خانہ تھا جس میں ایک ٹب تھا اور پچھواڑے میں باہر بیت الخلاء ہونے کہ بجائے علیحدہ طہارت خانہ تھا اس گھر میں دو سونے کی کمرے اور ایک بچوں کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامنے والا کمرہ مجھے مطالعہ کے لئے مل گیا۔ پھر ایک چھوٹا سا ہال تھا اور سیڑھیوں کے نیچے ایک الماری تھی۔ گھر' علاقہ' اور گھر کے سامنے گلی کی بجائے ایک سڑک کا ہونا اور پھر اس علاقے کا اپنا نام ہونا' ان سب پر پورا گھر خوشیاں منا رہا تھا۔ علاقے میں ایک شاپنگ سنٹر' ایک کو آپ' ایک پبلک ہاؤس' کار پارک اور دوسری طبقاتی علامتیں بھی تھیں۔ معاوضے پر ایک مہمان رکھنا کوئی ایسی بات نہیں تھی کیونکہ وہ مہمان ایک صحیح جنٹلمین تھا جو شہر بھی جاتا تھا اور کالج بھی اور وہ کوئی مزدور نہیں تھا۔ اب وہ کہہ سکتی تھی کہ اس کی خرید کردہ چیزیں اس کے گھر پہنچا دی جائیں جن میں کبھی کبھی اس ہندوستانی جنٹلمین کے لئے جو ان کا مہمان تھا' ایک گریپ فروٹ بھی ہوتا تھا۔ بچے اب بہتر سکول میں جاتے تھے جہاں سارے بچے یونیفارم پہنتے تھے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے ہر اتوار کو بھنا ہوا گوشت اور ہائی ٹی بھی ملتی تھی جس میں سستے موسمی پھلوں کی بجائے ڈبے میں بند پھل شامل ہوتے تھے۔

ایک کفایت شعار پنجابی عورت اور اپنی اس خاتون کے درمیان فرق کو میں بڑے غور سے دیکھتا تھا۔ پنجابی عورت تو کچھ بچا کر زیور اور کپڑون پر خرچ کر دیتی مگر یہ انگریز عورت فرنیچر کے چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدتی تھی جیسے نصف چاند جیسا قالین کا ٹکڑا' ایک آرام کرسی' یا ایک الماری۔ پنجابی عورت کے برعکس جو اپنے ہلکے زیور کو بھاری زیور میں تبدیل کرتی رہتی تھی یہ خاتون اپنے ڈرائنگ روم کے فرنیچر کو بہتر لکڑی والے فرنیچر میں بدلتی رہتی تھی۔ اس کو کام کرتے اور آرام کرتے دیکھ کر میں گھر پر فخر کرنے کی نئی تعریف سے آشنا ہوا ہماری عورتون کے مقابلے مین یہ عورت جھاڑ پونچھ اور پالش پر زیادہ وقت صرف کرتی تھی۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جہاں ہماری عورتیں گھر اور برادری کے فرائض پورے کرتی تھیں یہ خاتون اپنے گھر کی دنیا میں مگن رہتی تھی۔ اپنے شوہر یا اس کے اپنے رشتے داروں سے اس کا واسطہ بہت ہی کم تھا۔ کرسمس اور بپتسمہ کی رسم کے سوا اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے وہ بہت کم نکلتی تھی اور بہت کم لوگ انہیں ملنے آتے تھے۔ وہ مجھ سے اکثر پوچھتے تھے کہ کیا ہم بھی اپنی گھریلو زندگی کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن

ہمارے ہاں تو گھر کا تصور ہی بڑا مختلف ہے۔ ہمارے ہاں خاص خاص موقعوں پر ہم سب یعنی والدین' بچے' بچیاں' بھائی' بہنیں' چچا' چچیاں' چچیرے بھائی اور یہاں تک کہ تیسری نسل کے لوگ بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں لیکن یہاں بھائی کو بھائی سے ملنے میں بھی برسوں لگ جاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کون سا سسٹم بہتر ہے میرے خیال میں ان کا سسٹم ہی بہتر تھا۔ اپنے وسائل اور توانائیوں کو وسیع پیمانے پر پھیلانے اور خرچ کرنے کی بجائے ان کا سسٹم ان سب کو قریب ترین خاندان پر ہی صرف کرتا تھا۔ اگر حالات ٹھیک ہوں تو ان کی روش ہی مفید ہے لیکن جب مصیبت آ جائے جیسے کہ یہ گریٹ ڈیپرشن تھا تو مجھے اس روش کا تکلیف دہ پہلو بھی نظر آنے لگا۔ ایک وقت تو میں ان کے رشتے داروں سے بھی زیادہ قریب تھا۔ رشتے داروں کی نظر میں تو یہ بدنصیبی تھی کہ آپ سڑک پر آ گئے ہیں لیکن میرے لئے تو یہ ایسی بدنصیبی تھی جو مجھے ان کے ساتھ بانٹنی تھی۔ ہم لوگ رشتے داروں پر تکیہ کرتے ہیں تو یہ لوگ دوستوں سے مدد مانگ لیتے ہیں لیکن ان کے ہاں پہلے سے متعین ذمہ داریوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔

بحران ان مصائب میں سے تھا جو امریکہ میں شروع ہوتی ہیں۔ لنکاشائر نے اسے ذرا جلدی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے لئے تو الزام لیبر گورنمنٹ کی نااہلیت اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ آپ انجن ڈرائیوروں اور کان کنوں سے حکومت چلانے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ اس موضوع پر میری بڑی طویل گفتگو کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ حکومت کرنا ٹوریوں پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ وہ پیدائشی جنٹلمین ہیں اور کئی نسلوں سے حکومت کرنا جانتے ہیں۔ اس کے اور میرے درمیان سوشل ازم لیگ آف نیشنز اور آزاد تجارت پر طویل بحثیں ہوتی تھیں۔ ان تمام خیالات کو وہ انگریزوں کے خلاف غیر مناسب قرار دیتا تھا اور اگر ان نظریات کو غیر ملکی اختیار کریں تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اپنی تعلیم کا حصہ سمجھ کر میں اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ انگلستان میں ایک ہندوستانی نوجوان کو سوشل ازم کو اپنے سیاسی عقیدے کے طور پر اپنانے میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ ہم کنزرویٹوز کی شاہ پسندی کی روش اور اس مفروضے سے پریشان تھے کہ ہندوستان اور دوسرے ممالک پر انگریز ان لوگوں کی بہتری کے لئے حکومت کر رہا تھا مگر گمراہ مقامی لوگ اس رمز کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ سوشلسٹ کنزرویٹو کو اتنا ہی بڑا مسئلہ اور خطرہ سمجھتے تھے جتنا کہ ہم۔ قدرتی طور پر تمام کمزور لوگوں کے لئے سوشلسٹوں کی ہمدردیاں ہمیں اپیل کرتی تھیں : سوشلسٹ آزاد تجارت' غربت کے خاتمے اور قوموں میں مساوات کی بات کرتے تھے اور اپنی مستقبل کی امیدوں میں سب کو شامل کرتے تھے۔ لیکن یونین

میں کنزرویٹو ایسوسی ایشن کی گفتگو ان سب خیالات کی بجائے سلطنت کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے اور ہر جگہ مزاحمت کے خلاف مضبوط روش اختیار کرنے پر مرکوز ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہندوستان مکمل نراجیت میں ڈوبنا نہیں چاہتا تو اسے آزادی کا بڑے سکون سے کافی عرصے تک انتظار کرنا چاہئے۔ بحیثیت ایک قوم کے ہم میں کنزرویٹوز کو کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ہمارے مسائل کا وہ کوئی حل پیش نہیں کرتے تھے۔

ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی روش جس قدر بائیں طرف جھکی اس کا پورا انحصار ان ہندوستانی نوجوان نسلوں پر تھا جنہوں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی اور وہ سوشلسٹ اور فیبین فکر سے متاثر ہوئے۔ ہندوستان کی امنگوں کے لئے سوشلسٹوں کی پر خلوص ہمدردیاں طالب علموں کی ان نسلوں نے محسوس کر لی تھیں اور ہندوستان کے مسائل کا حل انہیں سوشلسٹوں کے ان نظریات میں ہی دکھائی دیا۔ چنانچہ جب آزادی آئی تو یہ قدرتی عمل تھا کہ سوشلسٹ نمونے کو اپنایا جائے۔

جب بحران گہرا ہوا تو خوف و ہراس چاروں طرف پھیلنے لگا۔ اب کھانے کی میز پر میزبان خاتون بتایا کرتی تھی کہ فلاں کے شوہر کو عارضی طور پر برطرف کر دیا گیا ہے اور فلاں کار خانے نے اوقات کار کم کر دیئے ہیں۔ ہیری کی فرم بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھی اور بدنصیبی یہ تھی کہ بحران کا پھیلتا ہوا خوف ہیری کو شراب خوری کی طرف دھکیل رہا تھا اس نے اب جمعے کے روز کے علاوہ جو تنخواہ کا دن ہوتا تھا' اب تقریباً ہر روز دیر سے گھر آنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی اس وجہ سے بھی پریشان رہنے لگی کیونکہ شراب خوری کی بد عادت پہلے ہی اس کے خاندان میں موجود تھی۔ چنانچہ اس خاتون کو خوف تھا کہ اگر وہ شراب خوری جاری رکھے گا تو اس کی شراب خوری کو بہانہ بنا کر اس کی فیکٹری اسے برطرف کر دے گی۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں بھی اس نے شراب پینی شروع کر دی تھی۔ اسے نوکری سے عارضی طور پر برطرف کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک خوفناک جد و جہد شروع ہو گئی۔ فرنیچر کی چیزیں جیسے جیسے آئی تھیں آہستہ آہستہ جانے لگیں۔ قسطوں پر لی ہوئی اشیا واپس ہونے لگیں۔ ناقابل مرمت چیزوں کی مرمت اور رفو میں گھنٹوں صرف ہونے لگے۔ آخر کار خود داری کو بالائے طاق رکھ کر انہیں بے روز گاری کے وظیفے کو قبول کرنا پڑا۔ ان تاریک دنوں میں وہ صرف ایک دفعہ کمزور پڑی۔ اس نے ایک دن مجھے کہا: پرکاش۔ اگر میں اپنے ہاں تمہارے قیام پر بھروسہ کر سکوں تو شاید ہم بچ نکلیں"۔ بحران کے دنوں نے مجھے اتنا کچھ سکھایا کہ میرے دل میں ان کے حوصلے کے لئے بڑا احترام پیدا ہو گیا۔ اور اس حوصلے کا دس سال بعد بڑا شاندار مظاہرہ ہوا۔

چودھواں باب

میں ڈگری حاصل کر چکا تھا جس کے بعد میں نے اقتصادیات میں تحقیق کرنے کی کچھ کوشش بھی کی لیکن جلد ہی میں انگریزی طرز زندگی کی بہتر تفہیم میں مصروف ہو گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس دوران میں کچھ نہیں کر رہا تھا اور ایک خوشگوار مگر بے مقصد زندگی گزار رہا تھا۔ بیلے کی موسیقی کی محفلیں' ریفرنس لائبریری' نیو سٹیٹس میں پڑھنا' یونین کے معاملات میں دلچسپی اور کام' اوسوالڈ موزلے' ونسٹن چرچل' اور ہیری پولٹ کی تقریریں سننا' کھیلنا' شمالی علاقوں میں خوب گھومنا پھرنا' نسواری رنگ کی قمیضیں پہننا اور سبز رنگ کی ٹائیاں لگانا' یہ تھیں میری مصروفیات۔ یہ بڑی خوش آئند زندگی تھی جس میں واحد قباحت ہفتے میں ایک دفعہ گھر خط لکھنا تھا۔ معمول کی مہارت سے ایک دفعہ یہ کام کر کے پھر ہفتہ بھر فراغت ہی فراغت ہی ہوتی تھی اور میں پھر تازہ دم ہو جاتا تھا کم از کم تین آدمی میرے اچھے دوست تھے جو پچھلے دس برسوں سے ڈاکٹری کی تعلیم پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری ضروریات کے لئے پندرہ پاؤنڈ ماہانہ اور ہر سال بعد کچھ اضافی رقم کافی تھی۔ اگر وہ اس نازک وقت پر نہ پہنچتی تو زندگی اسی طرح سست بہاؤ پر چلتی رہتی اور یقیناً مجھے گدھلے کیچڑ میں پھینک دیتی۔ وہ تائید غیبی تھی جو عین وقت پر پہنچی۔ اس سے میری ملاقات موسم بہار کی ابتداء میں آکسفورڈ میں ایک سٹوڈنٹ کانفرنس کے موقعے پر ہوئی۔ کانفرنس کے اختتام سے دو دن پہلے ہر شخص کو وپسینڈ کے چڑیا گھر یا سٹنفورڈ آن ایوان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ وپسینڈ چونکہ آدھا کراؤن سستا تھا اس لئے میں نے اسکا انتخاب کیا اور دوسرے سب لوگوں نے سٹنفورڈ کا انتخاب کیا۔۔ اس لئے مجھے وپسینڈ منسوخ کرنا پڑا۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی اپنے ذہن کو روشن تر کرنے کی سوچی۔ وہ نارڈک نسل والی سنجیدگی سے ادب کی تاریخ کی اپنی تعلیم اپسالا میں جاری رکھنا چاہتی تھی۔ وہ گداز تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں' چہرہ چپٹا اور زرد تھا اور ٹخنے مضبوط تھے۔ میرے لئے کشش کا باعث اس کی ناک تھی۔ اس کی ناک کی سکنڈے نیوین قوس جو ناک کو اونچا اٹھا کر ختم ہوتی تھی' میرے لئے بڑی کشش کا باعث تھی اور ایسی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پنجابیوں کی ناکیں سیدھی ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ان میں مشرق وسطیٰ جیسے خیدگی بھی ہوتی ہے لیکن آخر میں یہ اونچی نہیں

اٹھتیں۔ اگلی شام آکسفورڈ میں میں نے محسوس کیا کہ زندگی کچھ پیچیدہ طریقے سے ادھر ادھر ہونے والی ہے لیکن میں نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔

مانچسٹر آ کر میں نے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی۔ سویڈن ایسا ملک ہے جہاں سے ہندوستانی لڑکوں کے لئے رشتے آتے تھے۔ میں اس ملک کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا دیکھنے لائبریری گیا۔ وہاں سے صرف اتنا ہی پتہ چلا کہ یہاں ناجائز بچوں کی تعداد سب ملکوں سے زیادہ ہے' یہاں لکڑی اور لوہا ملتا ہے' اور اس کا ساحل کٹا پھٹا ہے مثالی جھیلوں اور جنگلوں کی تصویروں سے پتہ چلا کہ یہ علاقہ پنجاب کے علاقے سے مختلف ہے جتنا کہ یہ اپنے نقشوں سے مختلف ہے۔ وہ بحیرہ بالٹک کے ایک جزیرے کی رہنے والی تھی جو اور بھی دور تھا۔ حسب معمول میں نے زندگی کو ایسے ہی قبول کرنے کی ٹھانی جیسے وہ آئندہ میرے سامنے آتی جائے گی۔ اپنی یہ روش مجھے خود بھی پسند آئی۔ واکنگ کے رومانوی انداز اور جزیرے میں رہنے والوں کی عملی قابلیت کے متعلق تمام شک و شبہات میں نے رد کر دیئے۔ اگر اسے وہ جگہ پسند آ جائے جہاں وہ اترے گی تو وہ بھی اپنی جدی کشتیاں جلانے کو تیار تھی۔ اس نے یورپ کے باقی ماندہ دورے منسوخ کر دیئے اور اپنی والدہ کو اطلاع کر دی۔ اس کا تعلق بالٹک کے بحری جہازی کپتانوں کے لمبے سلسلے سے تھا اور ممکن ہے کہ اس سے اور بھی پیچھے لمبی کشتیوں والے لوگوں سے جا ملتا ہو۔ وہ کبھی شک میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے میرے مستقبل کے اندیشوں کو مصمم ارادے سے رد کرنے اور مشکلات کو نظرانداز کرنے کے طریقوں سے میں کسی حد تک ڈر گیا۔ اس کی ماں نے ایک سادہ سی دعوت دی کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔

سویڈن جانے سے پیشتر میں اسے اپنے اس محبوب مقام پر لے گیا جہاں موقعہ ملنے پر میں اختتام ہفتہ کے لئے لے جاتا تھا۔ یہ دریائے ربل کی وادی میں ایک کوئیکر ریسٹ ہاؤس تھا جو لنکا شائر اور یارک شائر کی سرحد پر واقع تھا۔ ایک پرانے فارم ہاؤس کو ریسٹ ہاؤس میں بدل دیا گیا تھا۔ یہاں سے چاروں طرف کا نظارا بڑا شاندار تھا۔ مانچسٹر میں رہتے ہوئے میں ہمیشہ افق کو دیکھنے کی تمنا کرتا تھا۔ جب مانچسٹر کے گھروں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں' اس کے گیلے پیدل راستوں اور ٹرام کی چمکتی ہوئی پٹڑی سے میرا دل بھر جاتا تو میں ایک چھوٹا سا بیگ لے کر اور بس میں سوار ہو کر یہاں پہنچ جاتا تھا۔ تیس میل تک بری' بولٹن اور دوسرے قصبوں کی قطار کی صورت میں مانچسٹر کا سرمئی رنگ ساتھ ساتھ ہی چلتا رہتا تھا تا آنکہ سڑک اس صنعتی سرنگ سے گزر کر ربل کی وادی کی کھلی فضاؤں میں پہنچ جاتی تھی۔ یہاں آسمان کھلا تھا' گھاس سبز تھی' روشنی تھی اور کھیتوں کی خوشبو تھی۔ کلتھرو کے سوئے ہوئے پتھریلے قصبے پر میں بس چھوڑ دیتا اور اس گلی میں آ جاتا

تھا جو کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی اوپر کو چڑھنا شروع کرتی ہے اور انگریزی دیہات کے لامحدود تنوع والی خوشبوئیں اپنے سانس کے ساتھ میں اپنے اندر لے جاتا تھا۔

فارم وادی سے خاصی اونچائی پر تھا۔ وہاں سے کافی وسیع علاقہ نظر آتا تھا۔ یہ منظر درختوں سے بھری ہوئی ڈھلوان کی صورت میں نیچے ربل کی وادی تک جاتا تھا اور وہاں سے پھر کھیتوں اور درختوں میں سے گزر کر اوپر اٹھتی ہوئی خوبصورت پینڈل ہل تک پہنچ جاتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے دوسری طرف ایک خوبصورت پرانی قسم کا انگریزی باغ تھا جو گرمیوں کے آغاز کے دنوں میں اکیلا ہی اتنا پر کشش تھا کہ مانچسٹر سے صرف اسے ہی دیکھنے کے لئے آیا جائے۔ مہربان کوئیکر نے جو اس کی دیکھ بھال کرتا تھا' مجھے بتایا کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس کے دنوں میں جب گاندھی جی لنکا شائر آئے تو وہ یہاں ایک رات کے لئے ٹھہرے۔ وہ شام کو وہاں پہنچے۔ وہ اپنی چپل' دھوتی اور سفید اونی شال میں ملبوس تھے۔ انہوں نے باغ کی سیر کی۔ باغ اس وقت اپنے حسن کے عروج پر تھا۔ کوئیکر اس بات پر حیران تھا کہ گاندھی جی نے پھولوں کو دیکھا تک نہ تھا۔ میں نے اس تسلی دی کی یہ گاندھی جی کی صفت تھی کہ اگرچہ وہ بڑے جذباتی انداز میں قدرت کی طرف لوٹنے کو کہتے تھے لیکن انہیں قدرت کے حسن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب میں اس باغ میں گھومتا تھا یا ٹیرس سے وادی اور پینڈل کی پہاڑی کو دیکھتا تھا تو مجھے بڑا سکون ملتا تھا۔ میں اس پہاڑی کے چپے چپے سے واقف ہو چکا تھا۔ چاروں موسموں میں اس کے رنگوں اور ان کے خفیف خفیف فرق سے پوری طرح آشنا تھا اور دن اور رات کی بدلتی ہوئی روشنیوں کو خوب جانتا تھا۔ میں اسے مخصوص نجی طریقے سے پیار کرتا تھا اور میں نے سوچا کہ مجھے اس کی بچپن کے جذبات کا رخ کسی نئی طرف موڑنا چاہئے اور اس مقصد کے تحت میں گارڈ کو یہاں لے آیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ میرا تعارف اپنے ملک سے کراتی میں اسے انگلستان کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا دکھانا چاہتا تھا۔ ہم جنگل اور چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی بنائی ہوئی گھاٹیوں میں گھومتے رہے جو آخر میں دریائے ربل سے مل جاتی تھیں۔ ہم اس وادی سے پینڈل پہاڑی پر چڑھ گئے اور گھٹنوں جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی نیم تاریک خالی زمین میں گھومتے رہے۔ یہاں ہوا بڑی تیز ہوتی تھی۔ ہم پتھروں کی ایک پرانی دیوار پر بیٹھ گئے اور سمندری بگلوں کو ہوا میں ترازو ہوتے دیکھتے رہے جو کبھی کبھی ابتدائی قسم کی چیخیں مارتی تھے۔ میں ریسٹ ہاؤس سے نکل کر اکثر پینڈل پر چڑھ جایا کرتا تھا لیکن اس دن یہاں ایک عجیب قسم کی سرخوشی تھی اور پہاڑی اتنی اہم نہیں تھی۔

گوتھن برگ سے سٹاک ہوم جانے والی ٹرین کی کھڑکی سے میں سنگ خارا کی ابھری ہوئی چٹانوں کے سلسلوں' نیلی خاموش جھیلوں اور صنوبر کے جنگلات کو دیکھ رہا تھا کبھی کبھی جنگل کو صاف کر کے بنائی ہوئی جگہ پر کوئی فیکٹری نظر آ جاتی تھی جو عموماً جھیل کے کنارے پر ہوتی۔ لیکن میلوں پر پھیلے ہوئے محنت کشوں کی دھوئیں کی چمنیوں سے ٹرین کہیں بھی نہیں گزری۔ سامنے والی نشست سے میں نے اس کے چہرہ اور دوسرے مسافروں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ سب بے رونق اور جذبات سے خالی تھے۔ ان کی نیلی آنکھیں پر سکون تھیں اور وہ بڑے مطمئن تھے لیکن آپ محسوس کر سکتے تھے کہ ان میں جذبات کی ایک قوت ہے جو میں نے اس میں پہلے ہی پہچان لی تھی۔ یہ سب کچھ پنجاب سے کتنا دور اور کتنا مختلف تھا تاہم مجھے اس میں ایک باہمی اشتراک کا احساس ہوا اور میں ایسے مطمئن ہو گیا جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔ جیسے جیسے میں ان کو جانتا گیا مجھے احساس ہوا کہ ہم واقعی ایک دیہی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ ہماری طرح وہ بھی دیہاتی لوگ تھے جن کے لئے زمین اور رشتے داریاں اب بھی بڑے معنی رکھتی تھیں۔

ہم نے کچھ دن سٹاک ہوم میں گزارے۔ اس شائستہ اور خوش وضع شہر کا نیا اور پرانا طرز تعمیر اپنے اطراف پھیلے ہوئے جنگلات اور صاف ستھرے ندی نالوں سے بڑے قدرتی طریقے سے گھل مل گیا ہے۔ اس نے مجھے وہاں کے محلات' گیلریاں' پارکیں اور لنڈن کی ایونیوز' پرانا شہر' نیا ٹاؤن ہال' اس کے مجسمے ' اور میرے اندر کے پنجابی کی تسکین کے لئے رسٹورانٹ دکھائے۔ وہاں کے مختلف کھانوں سے میرا تعارف ہوا۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہم صبح سے لے کر شام تک گھومتے تھے اور یہ سب کچھ میری آنکھوں سے دیکھ کر اسے ایک نئی سنسنی کا احساس ہوتا تھا۔ شامیں بہت لمبی اور راتیں بڑی چھوٹی تھیں۔ غروب ہوتے وقت سورج ایک مخملیں اودی نیم تاریکی چھوڑ جاتا تھا اور طلوع ہوتے وقت ایک گلابی صبح لاتا تھا جو جلد ہی ایک نقرئی دن میں بدل جاتی تھی۔ ہمیں اتنے لمبے دن بھی اتنے چھوٹے لگ رہے تھے۔

صبح کے وقت ہم کنسرٹ ہال کے باہر ملے تاکہ ہم ملیز کے مجسمے " آرفیس ویکنگ اپ " کے ناقابل بیان حسین گروپ کے چمکدار جسموں پر فوارون کو چلتا ہوا دیکھ سکیں۔ ہم پھول بیچنے والوں کے درمیان گھومے جو خوش رنگ ٹیولپ' نرگس اور بے سنتو کے پھول بیچتے تھے اور آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اس وقت ناشتے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہم ایک " تارما " میں بیٹھ گئے اور ہمارے سامنے مختلف قسم کے پنیر' مکھن' دودھ اور ہمہ اقسام کی روٹیاں تھیں۔ ناشتے کے بعد ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے اس چھوٹے سے جزیرے

پر گئے جہاں " سنگر ٹو دی سن " کا مجسمہ سویڈن کی گرمیوں کے مسرور وجد میں اپنے بازو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔

آخری شام ہم سکینسس کی ڈھلوان پر بیٹھ گئے اور گہرے ہوتے ہوئے نیلے رنگ کے ملیسان کو شہر پر اترتا دیکھتے رہے۔ ٹاؤن ہال کی اینٹیں سرخ سے اودی ہو گئیں اور آس پاس کا پانی نیلاہٹ مائل سیاہ ہو گیا اور اس کے بڑے مینار کے تینوں تاج سورج کی آخری کرنوں میں چمکنے لگے۔ سٹاک ہوم پر نیلا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے پچھلے پندرہ دنوں پر نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن اسی شام ہم گوٹ لینڈ کے جزیرے پر واقع وزبی کے لئے بوٹ ٹرین پکڑ کر رات کے سٹیمر پر سوار ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

سٹاک ہوم میں تو ہم کھو جاتے تھے اور اب سب کچھ مختلف ہونے کو تھا۔ گوٹ لینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور وزبی اس کا چھوٹا سا شہر۔ اس کی ماں کی طرف سے اس کا خاندان کئی صدیوں سے یہاں رہ رہا تھا۔ اس کا والد براعظم سے ہجرت کر کے یہاں آگیا تھا اور مقامی کیتھیڈرل سکول میں اس نے کئی نسلوں کو پڑھایا۔ اس کا نانا براعظم اور گوٹ لینڈ کے درمیان چلنے والے سٹیمروں پر کپتان تھا۔ اس کے نانا کا والد ایک بادبانی جہاز میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس جزیرے کی لڑکیوں نے دور دراز کے ملکوں میں شادیاں کی تھیں۔ لیکن پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ یہاں کے لڑکی ایک ہندوستانی لڑکے کو اپنے گھر لا کر رہی تھی۔ جونہی ہم جہاز پر سوار ہوئے میٹ نے جو اس کا پرانا ہم سبق تھا' بڑے چاق و چوبند طریقے سے سلیوٹ کیا اور جہاز کے کپتان کو اطلاع کرنے کے لئے فوراً ہی غائب ہو گیا۔ کپتان بڑی شفقت سے چھوٹی انجیگارڈ اور اس کے ہندوستانی لڑکے کو خوش آمدید کہنے کے لئے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ براعظم کے سیاحوں کو چھوڑ کر جہاز پر سوار تقریباً تمام مسافر گارڈ کو جانتے تھے۔ کچھ ہم مکتب ہونے کے ناتے' کچھ سکول ٹیچر ڈاکٹر سکوگر اور نانتے ہیڈوگ کی بیٹی ہونے کے حوالے سے۔ میں نہ ختم ہونے والے مصافحوں' کمر سے جھک کر سلام کرنے اور تعظیم کے لئے جھکنے اور گاٹ لینڈ کی خوش آمدیدوں میں کھو گیا۔

آدھی رات کو جہاز نیاشان کو چھوڑ کر شیشے کی طرح پر سکون سمندر پر وزبی کی طرف چل پڑا۔ ہم سب سے اونچے عرشے پر بیٹھ کر گرمیوں کی رات کی روشنی کو دیکھتے رہے۔ میرا تعلق نچلے طول بدلوں سے تھا۔ میرے لئے اس میں عجیب و غریب حسن تھا۔ طویل جھٹ پٹا بغیر رضامندی کے ایک نرم سے اندھیرے میں تحلیل ہو گیا جس سے سورج ڈھیلے ڈھالے طریقے سے بغل گیر ہونے پر اصرار کر رہا ہو۔ جہاں سورج غروب ہوا تھا وہاں سے ہلکے نارنجی رنگ کی روشنی کی ایک لکیر افق کے ساتھ چلتی گئی اور اس نے اندھیرے کو آگے

بڑھنے سے روکے رکھا مجھے ہندوستان کی اندھیری گھپ راتوں کا خیال آیا جہاں سورج اپنا کام ختم کرنے کے بعد غائب ہو جاتا ہے اور پھر اندھیرے کا راج ہوتا ہے۔ یہاں سورج اور اندھیرا نیم خوابی کی صورت میں مدغم نظر آئے اور پھر سورج اندھیرے کو آہستہ آہستہ اپنے سے الگ کر کے سمندر سے طلوع ہونا شروع کر دیتا ہے۔ اندھیرا آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگا اور کچھ دیر رنگین صبح کی صورت میں رہا۔ دو بجے کے قریب سورج نے زمین کو اپنی روشنی کی گرفت میں پوری طرح لے لیا۔ آسمان اور سمندر کا رنگ چینی نیلے رنگ کا ہو گیا اور ایک اور نارڈک دن اپنی پوری شان و شوکت سے طلوع ہوا۔ میں صبح کی سردی سے کانپا اور اس کے قریب ہو گیا۔ میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے سورج کی پرستش کیوں چھوڑ دی جبکہ ہم اب بھی اسے پوجتے ہیں۔

اب گوٹ لینڈ کی چاک کی چٹانیں جن کی ڈھلوانوں سے وزبی کا شہر چمٹا ہوا تھا، سمندر سے باہر ابھرنے لگیں۔ جیسے ہی جہاز بندر گاہ کے تنگ دھانے کی طرف تیزی سے گھوما تو شہر کی دیوار' سانتا ماریا کی سیاہ سپائرز' ہانسی ایٹک کھنڈرات اور مکانوں کی سرخ اور سبز چھتیں نظر آنے لگیں۔ میں اگلے موڑ پر اس منظر کو دیکھنا چاہتا تھا جو زندگی میرے لئے لے کر کھڑی تھی۔ میرا اعتماد بحال کرنے کے لئے اس نے میرا ہاتھ دبایا لیکن مجھے لگا کہ وہ ہاتھ خود بے یقینی کا شکار تھا۔

کئی برسوں بعد گارڈ نے مجھے بتایا کہ جب وہ اس چھوٹے سے قصبے میں گئی جہاں میرے والدین ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے لگے تھے' تو اس نے بڑی آسودگی محسوس کی اور کہا کہ میں نے بھی وزبی میں ایسا ہی محسوس کیا ہو گا۔ جس طرح پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوتا ہے سویڈن کے ایک اس چھوٹے سے شہر میں بھی ہر شخص کسی نئے شخص کی آمد میں دلچسپی لیتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی حد تک انگریز ہو چکا ہوں کیونکہ میں نے پہلے اس عمل کو غیر دلچسپ سمجھا لیکن جلد ہی مجھے اپنی نمائش کی عادت ہو گئی اور میں نے اسے بڑے صبر سے برداشت کیا۔ میرے پہنچنے کے بعد ماما کا کافی کا برتن دنوں تک ابلتا رہا۔ ماما اور ملازمہ نے آنے والوں کو پیش کرنے کے لئے کیک بنانے پر کئی دن صرف کئے ہوں گے۔ آنے والوں میں اکثر عورتیں تھیں جو اکیلی اکیلی یا دو دو تین تین کے گروہوں میں آتی تھیں اور ہر دفعہ میں سویڈن کے مخصوص تعارفی اور الوداعی فارمولے سے کسی غلطی کے بغیر عمدہ برا ہو رہا تھا۔ جس سے ہر کوئی خوش ہوتا تھا اور خاص کر ماما کے لئے تو یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ میری مسلسل مسکراہٹ میری زبان سے ناواقفیت پر پردہ ڈال دیتی تھی۔ گارڈ کے مطابق وہ میرے دانتوں کی سفیدی اور اور ان کے ہموار ہونے اور سیاہ بالوں کے

بے قابو ہونے پر رائے زنی کرتی تھیں۔ میرے گھر کے متعلق وہ کئی سوال پوچھتی تھیں اور ان کا جواب مجھ سے پوچھے بغیر گارڈ سویڈش زبان میں خوشی خوشی دے دیتی تھی گو بیچ میں رک کر وہ مجھے بتا دیتی تھی کہ سوال کیا ہے۔

سویڈن کے جہاز پر مہمانوں کو خوش آمدید اور الوداع کہنے کے طریقے میں نے بھی اچھی طرح سیکھ لئے تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی مہمان آتا میں بالکل سیدھا اکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ دونوں ایڑیاں جوڑ کر ہاتھ ملاتا تھا اور کمر سے اتنا جھک کر سلام کرتا تھا کہ میرے سر کے بال میری آنکھوں میں آ جاتے تھے۔ بعد میں جب میں نے گارڈ کو اپنے بچوں کے سر کو ہلکا سا جھکا کر صحیح طریقے سے استقبال کرنا سکھایا تو مجھے ساری باتیں یاد آ گئیں۔ سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیوں اور نوجوان عورتیں کا اپنے دونوں گھٹنے جھکا کر اپنے بزرگوں کو سلام کرنا اور چھوٹے لڑکوں کا اپنی ایڑیاں ملا کر اور سر اور کمر کو خم کرنا تھا۔ میں نے یہ بھی سیکھا تھا کہ جب کافی پیش کی جائے تو ہر قسم کے کیک سے ایک ایک ٹکڑا لے کر کھانا ضروری ہے۔ اگر دوسری بار لیں تو یہ میزبان خاتون کے لئے اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اتنی مٹھائیاں کھانے کے لئے مشق کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم نے آنے والوں سے واپسی ملنا تھا جس کا مطلب تھا مزید کافی اور مزید کیک۔

ان تہواروں اور چھٹیوں کے علاوہ جن کا مبدا مذہب ہے اور جن کو خاص طور پر کھانے پینے کے لئے منایا جاتا ہے' کچھ ایسے بھی تہوار ہیں جن کی اہمیت خوش خوراکی میں ہے۔ ایک ایسا تہوار کرے فش کی ضیافت ہے جو یکم اگست کو منعقد ہوتی ہے جب راتیں پہلے ہی کالی ہو چکی ہوتی ہیں۔ باغوں' ہفتے کے اختتام پر آباد ہونے والے کاٹیج اور کھلی ہوا میں قائم ریسٹورانٹوں میں اس ضیافت کے موقعے پر چینی طرز کی لالٹینیں جلا کر روشنیاں کی جاتی ہیں۔ اگست کے پورے مہینے میں کرے فش کی دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان دنوں ندیوں میں ان کے شکار کی اجازت ہے۔ جب ہم لوکل یاٹ کلب کی کرے فش پارٹی میں گئے تو سویڈن کے آداب خورد و نوش سے اس وقت میری صحیح واقفیت ہوئی۔

وزبی یاٹ کلب صحیح معنوں میں جمہوری ادارہ تھا۔ کشتی کے سائز سے قطع نظر ہر کشتی کا مالک یا جو باقاعدگی کے ساتھ کشتی رانی کرتا ہو' اس کلب کا ممبر بن سکتا تھا اس کا پریذیڈنٹ لٹویا کا وائس کونسل تھا۔ وہ اپنے یاٹ کے علاوہ گوٹ لینڈ کے تجارتی جہازوں کا بھی مالک تھا جو شاید یہاں کے آخری جہاز ہوں۔ وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ ایک بڑے سٹور کا مالک اپنے کارندوں کے ساتھ آیا ہوا تھا جو باری باری اس کے ساتھ کشتی رانی کے لئے جاتے تھے۔ ایک کتب فروش جو صرف لڑکیوں کو ملازم رکھتا تھا ان

سب لڑکیوں کو لے کر آیا ہوا تھا۔ شہری معاشرے کے تمام پہلوؤں کا یہ اچھا اظہار تھا کیونکہ جب کشتیوں کی بات ہو تو سب بھائی بھائی تھے۔

پارٹی ساری رات چلی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پینے کی عادت سویڈن کے لوگوں نے برقرار رکھی ہے۔ وہ کتنا کھا سکتے ہیں اور کتنا پی سکتے ہیں' ایک الگ سوال ہے مگر ایک غیر ملکی کا ان کا ساتھ دینا مشکل ہے۔ اس سے پیشتر کہ سرخ رنگ کا مخصوص طعام یعنی کرے فش میز پر آئے ایک بہت بڑا سمورگوسبورڈ اور بران ون نامی آتشیں شرابیں چلیں۔ آپ ناپختہ سپرٹ کا جس میں ہلکا سا سونف کا ذائقہ ہوتا ہے' گلاس اٹھاتے اور ایک جھٹکے سے اپنے اندر انڈیل لیتے اور وہ گلے کو جلاتی ہوئی معدے میں جا کر ایک خاموش ابال کی صورت میں پھٹ پڑتی۔ کرے فش کے متعلق " ہر پنجے کے لئے ایک " جام قابل احترام اصول ہے۔ ساری رات ایک کے بعد ایک دور چلتا رہا اور ہر شخص غیر ملکی کے لئے جام صحت تجویز کرتا رہا۔ جب ایسا ہوتا تھا تو آپ تجویز کرنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا گلاس اوپر اٹھاتے اور پیتے اور واپس رکھنے سے پہلے دوبارہ اپنے سامنے پکڑ کر رکھتے اور پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوسری بار دیکھتے اور گلاس واپس رکھ دیتے۔ اتنا پینے کے بعد ہر شخص کو سکول کی انگریزی کتاب کے کچھ ٹکڑے یاد آنے لگے اور میرے ساتھ وہ بھی مزے سے باتیں کرنے لگے۔ کھانے اور شراب پینے کے دوران وہ کھلی ہوا میں ناچنے کے لئے باہر بھی نکل جاتے تھے۔ سویڈن کے رقص میں ایک طاقتور لا ابالی پن ہے۔

میں کسی نہ کسی طرح قائم رہا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ ساحل کے ساتھ کلب میں کشتی رانی کا مقابلہ تھا۔ گو ہوا بڑی تیز تھی اور بہت سے لوگ مقابلے کے لئے آئے تھے لیکن گارڈ اور اس کے بھائی سونے نے اپنی بادبانی کشتی سمندر میں ڈال دی۔ اگر مجھے بحرۂ عرب والا تجربہ یاد رہتا تو میں بحرۂ بالٹک سے زیادہ احترام سے پیش آتا۔ پچھلی رات کی کرے فش اور ناپختہ شراب' کشتی میں السی اور مٹی کے تیل کی بو' طوفانی سمندر اور یخ بستہ ہوا ان سب نے پورے خاندان کو بتایا کہ گوٹ لینڈ کے ملاحوں کے ایک خاندان اور خشکی سے محصور ایک پنجابی میں کتنا طویل فاصلہ ہے۔ سونے کی یقین دہانی پر کہ یہ کشتی خاص طور پر طوفانوں کے لئے بنائی گئی ہے اور اس سے زیادہ سخت طوفان دیکھ چکی ہے' میں نے کان نہیں دھرا۔ مقابلے پر صرف تین کشتیاں آئی تھیں اور بہت زیادہ کھانا ضائع ہو گیا۔ میں نے کہا کہ واپسی پر میں تو اٹھارہ میل چل کر جانے کو ترجیح دوں گا۔ ماما نے میرا ساتھ دیا لیکن خوش نصیبی سے ہمیں بس مل گئی۔

گارڈ اور میں بائیسکلوں پر جزیرے کے دورے کے لئے نکلے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ

سڑک شہر کے شمال کے جانب جاتی تھی۔ یہ بڑا سنگلاخ علاقہ تھا جس میں صنوبر' سفیدے اور جونیپر کے درختوں کا جنگل اور چاک کی ابھرتی ہوئی چٹانیں تھیں۔ پتھریلے ساحل پر مٹی کے رنگ میں جنگلی پودینے کی بنفشی چمک تھی جس نے سنہری دھوپ میں نہائی ہوئی ہوا کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیا تھا۔ فر کے درختوں کی شاخوں کا رخ جزیرے کی طرف تھا اور چٹانوں کی پناہ میں سفیدے کے تڑے مڑے درخت قالین کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے آخری طوفان کے بعد چٹانوں کے نیچے بحیرہ بالٹک بڑا پر سکون تھا۔ جب شام ہوئی تو رات بسر کرنے کے لئے جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ گھومنے پھرنے والوں نوجوانوں کی طرح ہم بھی ایک اکیلے فارم ہاؤس میں چلے گئے اور مالکہ سے پوچھا کہ کیا رات گزارنے کے لئے وہ ہمیں جگہ دے سکتی ہے۔ کرنا ایسا ہوا کہ کسان اپنی جوانی میں امریکہ میں رہ چکا تھا اور انگریزی بول سکتا تھا۔ سویڈن کے کئی لوگ امریکہ میں رہ گئے لیکن یہ شخص واپس آ گیا تھا۔ چنانچہ جب گارڈ اور اس کی بیوی اوپر سونے کا کمرہ درست کر رہی تھیں۔ تو اس نے مجھے ان لڑکیوں کے بارے میں بتایا جن کو وہ جانتا تھا۔

ہماری میزبان نے ہمیں شام کا بہترین کھانا دیا جو اتنے تھوڑے عرصے میں تیار کرنا ممکن تھا اور صبح کے وقت کافی بھی پلائی۔ جب ہم نے معاوضہ ادا کرنا چاہا تو وہ بات سننے کو تیار نہ تھی۔ اس نے ہمیں کہا کہ ہم اس کی بہن سے بھی ملیں جو اسی سڑک پر چند میل دور رہتی تھی۔ چنانچہ ہم اس سے بھی ملے۔ اس نے بھی ہمیں کافی اور کیک کے لئے رکنے کو کہا۔ فارم خواہ اسی طرح کا چھوٹا یا جنوب میں پتھروں سے بنا ہوا شاہانہ قسم کا ہو' ہر جگہ ایسے ہی ہوتا رہا اور بغیر کسی معاوضے کے مہمان نوازی کے دعوتیں ملتی رہیں۔ لوگوں کے ایک دوسرے پر اس طرح اعتماد کرنے پر میں بڑا حیران تھا۔ ہمارا ایک بائیکل خراب ہو گیا اور ہم نے اسے سڑک پر ہی چھوڑ دیا اور ہمیں پتہ تھا ہم اسے اگلی صبح اٹھا لیں گے۔ جو چیز بھی آپ سڑک پر چھوڑ دیتے وہ محفوظ رہتی تھی۔ ان سڑکوں پر جو فارم سے نکل کر بڑی سڑک سے آ ملتی تھیں' کسانوں نے لکڑی کے پلیٹ فارم بنائے ہوئے تھے جہاں ڈاکیہ اور ڈاک تقسیم کرنے والے ٹرک کا ڈرائیور ڈاک اور پارسل چھوڑ جاتے تھے۔ یہ جزیرہ جرائم سے پاک تھا اور وزبی کی چھوٹی سے جیل خالی پڑی رہتی تھی۔

سویڈن کی سب سے بڑی جھیل کے کنارے ڈال کے ضلع میں ایک فارم پر ہمارا ایک اور گھر تھا۔ یہ گارڈ کے والد کا خاندانی فارم تھا اور ابھی تک اسی خاندان چلا آ رہا تھا۔ جھیل کو جانے والی سڑک اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ سڑک کے ایک طرف باغ تھا جس کے گیٹ پر چار سو سال پرانے لنڈن کے درخت تھے۔ راستہ سفید اور پیلے رنگ

کے لکڑی سے بنے ہوئے گھر کو جاتا تھا جس پر سرمئی رنگ کی سلیٹوں کی چھت تھی۔ سڑک کی دوسری طرف اصطبل اور غلے اور بھوسے اور دوسری زرعی چیزوں کے گودام تھے۔ صنوبر کے جنگل میں جگہ صاف کر کے کھیت بنائے گئے تھے۔ یہی فارم کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔

بلنٹ کو میں نے تاریک ترین سرما میں دیکھا ہے۔ یہ ایسا اندھیرا تھا جو برفوں کی وجہ سے ابھی چھٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے گوتھن برگ میں ملی تھی اور ہم کرسمس کے لئے وہاں جا رہے تھے مجھے پہلے معلوم نہیں تھا سردیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ چند گھنٹوں کے جھٹ پٹے کے بعد پورے ملک پر ایک ناقابل نفوذ تاریکی چھا جاتی تھی۔ گھروں میں سارا دن روشنیاں جلتی تھیں۔ سینٹ لوشیا کے دن جو کرسمس کا پیش خیمہ ہوتا ہے' اس کی چھوٹی چچیری بہن رات کالمبا سفید گاؤن پہنے' سر پر جلتی ہوئی موم بتیوں کو تاج کی صورت میں رکھے علی الصبح ہر سونے والے کمرے میں گئی۔ اس نے کافی کی ٹرے اٹھائی ہوئی تھی جس میں سواستیکا کی شکل کی زرد روٹی پڑی ہوئی تھی۔ یہ سواستیکا سورج کی پرستش کی علامت ہے جو ہم میں اور سکنڈے نیویا میں مشترک ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں میں دوبارہ بلنٹ گیا۔اس وقت ہر طرف کھنے کے درختوں کی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا اجالیا کی بیلوں کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی اور شہد کی مکھیاں برآمدے میں اڑ رہی تھیں۔ باغ میں کئی ایسے درخت تھے جو ان طول بلدوں میں نہیں ملتے۔ انہیں اس کے والد نے لگایا تھا۔ وہ اس مٹی کو پیار کرتا تھا جسے وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سرما کے دنوں میں پور جنگل سرخ اور سیاہ گوندنیوں سے بھر جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جو فارم پر مصروف نہیں ہوتے تھے' ٹوکریاں دے کر ان گوندنیوں کو اکٹھا کرنے کے ئے بھیج دیا جاتا تھا تاکہ اتنی گوندنیاں لے آئیں جو سردیوں کے لئے مربوں اور رسوں کے لئے کافی ہوں۔ انہی دنوں مقامی سکول کے بچے بھی آ جاتے تھے تاکہ گرائے گئے درختوں کی جگہ نئے درخت لگانے میں ہاتھ بٹائیں۔

یہ مستحکم معاشرہ زمین میں اپنی جڑیں کافی گہری اتار چکا تھا۔ اس سے جاگیرداری نظام نے چھوا تک نہ تھا۔ اتناع سے آزاد جنسی اخلاق عیسائت سے بھی پہلے یہاں موجود تھا جب میں نے یہ سب کچھ دیکھا تو میں نے سویڈن کی ترقی کو سمجھنا شروع کر دیا۔ شادی سے پہلے جنسی تعلقات کی برداشت کے متعلق سویڈن کی روش کو غیر ملکی غلطی سے جنسی آزادی یا لاپرواہی سمجھتے ہیں۔ سویڈن کے دیہاتی علاقے کے ایک کونے میں جو لوتھری روایت کی مطابقت میں سخت مذہبی تھی' نوجوان جوڑے کا کبھی کبھی لڑکی کے والدین کے ہاں ایک

رات بسر کر لینا بالکل فطری خیال کیا جاتا تھا بشرطیکہ ہمسایوں کو اس رشتے کے بارے میں یقین ہو کہ ان کا نتیجہ شادی ہو گا۔ بدکاری کو ناپسند کیا جاتا تھا۔بعض اوقات تو مقررہ مدت سے پہلے ہی شادی ہو جاتی تھی۔ ظاہرہ وجوہ کی بنا پر جیسے اپنی فارم بنانے میں نوجوان کی تاخیر' تو منگنی کی مدت طویل بھی ہو سکتی تھی اور کسی نا امیدی کے بغیر اسے برداشت کیا جاتا تھا۔ لڑکی اور لڑکا ہفتہ بھر کام کرتے تھے اور بغیر کسی احساس جرم کے وہ ہفتے کی شام کو ملتے تھے۔ اس قسم کا معقول اور عملی نقطۂ نظر سویڈن کے لوگوں میں عام تھا۔

ایک سال سے پہلے ہی گارڈ نے اپسالا چھوڑ دیا تھا لیکن سویڈن میں طویل گرمیوں کے بعد اور کرسمس کی آمد پر اس نے اپنی تعلیم جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ میرے لئے بھی اشارہ تھا۔ میں نے بھی ایک سال سے زیادہ عرصے میں کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اگر اس وقت اپنی تعلیم جاری نہ رکھتا تو شاید بہت دیر ہو جاتی۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سخت تنظیم کے پیش نظر یہ نصاب بہت مشکل تھا۔ لیکن میرے طرز عمل کے پیش نظر میرے اوپر یارک شائر کے پرنسپل نے اپنی زبان کے تازیانے برسائے اور کہا کہ میری کامیابی ممکن نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تو میرے کامیاب اکاؤنٹینٹ بن کر وفات پانے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کی یہ بات مجھے کھا گئی۔ تعلیم کے بارے اپنی سنجیدگی کا اظہار کرنے کے لئے اگلے ہی دن سے دھاری دار پتلون' کالا کوٹ پہنے کر اور بولر ہیٹ اپنے سر پر رکھ کر میں دفتر جانے لگا اور تین سال تک متواتر جاتا رہا۔ کالج یونین سے دور رہنا ذرا مشکل تھا کیونکہ یہ ہٹلر اور مسولینی' ایبے سینیا اور سپین میں جنگ کے دن تھے اور ہیجان سے پر تھے۔ پھر بھی میں مختاری کے قانون اور بیلنس شیٹوں کے انضمام جیسے غیر دلچسپ کاموں میں کھو گیا۔ اپنے کالج کے پرنسپل کی پیش گوئی کو جھٹلانے کے لئے میری کوششوں میں جو یک رنگی تھی اس کی کلفت کا ازالہ کبھی کبھی ہالے' فری ٹریڈ ہال جو مانچسٹر میں موسیقی کا آخری ہال تھا اور رشلوم ریپرٹری تھیٹر جانے سے ہو جاتا تھا۔

گھر سے پانچ' چھ' سات سال غیر حاضر رہنے پر گھر کی عدم موجودگی کا اب میرے اوپر اتنا دباؤ نہیں تھا جتنا کہ ایک ایسے بڑے شہر مانچسٹر میں رہنے کی تکلیف تھی جس کی آب و ہوا مرطوب اور سخت سرد تھی۔ لیکن اس کے دھوئیں اور کالک کے باوجود مجھے مانچسٹر سے محبت تھی مگر دھوپ کی کمی اور ہموار زمین پر کھلے آسمان کی خواہش زیادہ شدید تھی اور یہ مجھے ستانے لگی۔ سردیوں کے مرطوب اور دھند سے بھرے ہوئے دنوں میں ہر صبح اپنی کھڑکی سے باہر روآں کی جھاڑی کو دیکھا کرتا تھا۔ اگر اس کا پھل زیادہ ہوتا اور سرخ ہوتا تو

اس کا مطلب تھا سردیاں بڑی شدید ہوں گی اور جب تک ان کی کمر ٹوٹ نہ جائے یہ جاری ایسے ہی رہے گی۔ جب گھر کے سامنے سڑک کے اندر ایک جزیرے کی طرح خالی جگہ میں جھاڑیوں کی ننگی شاخوں میں چھوٹی چھوٹی پھولی ہوئی جگہیں نظر آنے لگتیں تو بہار کی آمد سے میری روح مسرور ہونے لگتی تھی لیکن دفتر کا لفٹ مین میری امیدوں کو پژ مردہ کر دیتا تھا۔ "تم ہمارے موسم کو نہیں جانتے۔ تمہیں ہمارے مارچ اور اپریل کا کچھ پتہ نہیں"۔ وہ مغموم سا آدمی لگتا تھا۔ وہ بالکل گنجا تھا اور سرخ رنگ کی ٹوپی پہنتا تھا۔ وہ عموماً درست ہی کہا کرتا تھا لیکن میں اس کی اس مغموم پیش گوئی پر ہنستا تھا۔ میرے آخری موسم سرما میں ایک بعد ایک معتدل دن آنے شروع ہوئے۔ روآں کی جھاڑی اپنے سرخ پھل والے انتباہ کے باوجود سبز ریشمی پتے نکالنے لگی۔ میں اس کو روز بڑھتے ہوئے دیکھتا تھا اور امید کرتا تھا کہ اس ملک کے ناقابل پیش گوئی موسم کے باوجود شاید کم از کم ایک دفعہ تو موسم بہار جلدی آ جائے گا لیکن لفٹ مین صحیح تھا اور میں اور روآں کی جھاڑی بری طرح ناکام ہوئے۔ سردیاں پھر لوٹ آئیں اور یہ انتہائی سرد موسم سرما تھا جو مجھے یاد پڑتا ہے کہرے سے اس بہادر روآں کی جھاڑی کے پتے سکڑ گئے اور میں اور سخت محنت کرنے لگا تا کہ یہ موسم میرا آخری سرما ہو جائے۔

گہری دھند اور ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردیوں کے دوران نومبر کے ایک ہفتے میں امتحانات ختم ہو گئے اور میں وزنی میں نتیجے کی انتظار کرنے لگا۔ ایک کام کو مکمل کر دینے کا خوش کن احساس میرے اوپر طاری ہو گیا۔ میں پوری بہار اور گرما سویڈن میں ٹھہرا رہا۔ گارڈ اب اپنے والد کے سکول میں پڑھا رہی تھی۔ میں بڑے اطمینان سے اس کے والد کا وسیع کتب خانہ دیکھنے میں مصروف تھا۔ ہٹلر اب دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں اپنے پیچھے لندن میں ہوائی حملے سے بچاؤ کے پوسٹر چھوڑ کر آیا تھا۔ اس پر امن جزیرے میں بھی جنگ ناگزیر لگتی تھی۔ میں کبھی سوچتا تھا کہ کیا گارڈ میرے پیچھے ہندوستان آ سکے گی۔ میں نے مہینوں کو سست رفتاری سے گزرنے دیا یہاں تک کہ میری واپسی کا وقت آ گیا۔

پندرھواں باب

مستقبل پہلے سے ہی اپنا سایہ ڈال رہا تھا۔ واپسی پر سب سے بڑا سوال ملازمت کا تھا۔ مینیجمنٹ کی اہلیت رکھنے والوں کی طلب گار ابھی تک صرف حکومت تھی۔ پنجاب میں کوئی صنعت نہیں تھی۔ ذات پات اور فرقہ واریت کے خیالات حکومت کو بھی متاثر کر رہے تھے۔ ہندو، مسلمان اور سکھوں کے لئے کوٹا تھا اور ہندوؤں کے سوا سب کو ویٹ ایج ملتی تھی۔ سفارش اور نوازش ان پر مستزاد تھی اور معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا جاتا تھا۔ ملازمت کے دوران ترقی اور تعیناتی بھی مذہب کی بنا پر ہوتی تھی۔ سرکاری ملازمت میں اب وہ کشش باقی نہیں رہ گئی تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے بمبئی کے صنعتی حلقوں میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

انگلستان چھوڑنے سے پہلے میں نے یونیورسٹی اپوئنٹمنٹ بورڈ کے ذریعے ہندوستان میں کام کرنے والی کئی انگریزی فرموں کو ملازمت کے لئے درخواستیں بھیجی تھیں۔ ایک یا دو کمپنیوں نے کہا کہ مجھے ہندوستان میں ان کی انتظامیہ سے رابطہ کرنا چاہئے لیکن تیل کی ایک کمپنی نے مجھے انٹرویو کے لئے بلا لیا۔ چونکہ اس کمپنی میں چند ہندوستانیوں کو آئی سی ایس کے سکیل میں ملازمت مل چکی تھی اس لئے مجھے بڑی امید تھی۔ لیکن انٹرویو نے مجھے بڑا فکر مند کر دیا۔ ان صاحب کو میری اسناد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میرا خاندان اور اس کے تعلقات جاننا چاہتے تھے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ میں ملازمت میں فٹ ہو سکوں گا۔ مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ ان کے کام کی نوعیت کیا ہے اور ان کی حساب کاری کا سسٹم کیا ہے۔ وہ بڑا غیر دلچسپ آدمی نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس سوال کی اسے وضاحت کرنی پڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ کیا میں ان کے صدر مقام پر متعین برکاری افسروں اور کمپنی کے سٹاف میں فٹ ہو سکوں گا۔ میں چونکہ گیلا قابلیت کے اس معیار سے مجھے اتفاق نہیں تھا اور پھر مجھے سوشل مشکلات کا بھی سامنا تھا بالخصوص وہ جن کا تعلق مخلوط شادیوں کے خلاف انگریزوں کے تعصب سے تھا۔ یہ بے مروت سا انٹرویو ختم ہو گیا اور چند دن بعد مجھے خط کے ذریعے اطلاع ملی کہ ان کے پاس میرے لئے کوئی کام نہیں ہے اور بہتر

ہو گا کہ میں ہندوستان میں ان سے رجوع کروں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ انہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ ایک معمے سے کم نہ تھا۔ میں ابھی لندن ہی میں تھا کہ ہندوستان میں ملازمت کے متعلق مشورے کے لئے میں انڈین ہائی کمشنر کے دفتر گیا۔ اس زمانے میں یہ صرف برائے نام ہندوستانی تھا۔ ہائی کمشنر کے سوا باقی عملے میں سب انگریز تھے اور وہی اس دفتر کو چلا رہے تھے۔ ان کو ہندوستانی طلب علموں کی امیدوں اور امنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی پنجاب یونیورسٹی کی سند کی توثیق کے لئے آٹھ سال پہلے میں وہاں گیا تھا۔ اس کے بعد میرا اور ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اب جو وہاں پہنچا تو ملاقات کرنے والے افسر کی میز پر میں نے ایک موتی فائل پڑی دیکھی جس پر بڑے جلی حروف میں میرا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ شخص مجھے نہ کوئی پیش کش کر سکا اور نہ ہی کوئی مشورہ دے سکا۔ ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ ہندوستانی طالب علموں کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے لیکن مجھے یہ کبھی نہ معلوم ہو سکا وہ کونسی اتنی اہم معلومات تھیں جن سے میری فایل اتنی موٹی ہو گئی تھی۔ دوسرے دن میں وطن روانہ ہو گیا۔

پی اینڈ او کے ذریعے سفر کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا اگرچہ اس جہاز پر صرف ایک ہی کلاس تھی مگر انگریزوں نے کرائے کے مطابق اپنے آپ کو دو جماعتوں میں بانٹنے کی کوشش۔ لیکن یہ حقیقت کہ ہر شخص سستے کرائے پر سفر کرنا چاہتا تھا۔ پچاس پاونڈ ادا کرنے والوں کو بتیس پاونڈ ادا کرنے والوں سے علیحدہ کرنے سے نہ روک سکی۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان ماحول آٹھ سال سے قدرے بہتر تھا۔

واپس جانے والوں میں طالب علم اور ایسے کاروباری آدمی تھے جو کچھ زیادہ خوشحال نہ تھے۔ وہ آسانی سے گھل مل جاتے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے ہندی اور پنجابی بولنے میں مجھے دقت ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اپنے والدین سے ملنے سے پہلے مجھے کم از کم پنجابی میں مہارت پیدا کر لینی چاہیئے۔ گفتگو عام طور پر سیلف رول اور ڈومینین سٹیٹس کے موضوعات پر ہوتی تھی۔ مکمل آزادی اس وقت ایک خواب تھا اور اسکے متعلق ہم سنجیدگی سے سوچتے بھی نہیں تھے۔

کیبن میں میرا ہم سفر دوست قسم کا بمبئی کا ایک تاجر تھا۔ وہ نئے کاروباری خیالات کی تلاش میں انگلستان گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک دلچسپ خیال تھا۔ بمبئی میں جوہو ساحل سمندر پر ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ سیر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس کی خواہش

تھی کہ ا[illegible] جگہ کو اشتہاری بورڈوں سے بھر دیا جائے۔ جن میں ان پڑھ لوگوں کے لئے بھی خریداری کی تازہ ترین اطلاعات ہوں وہ پک ڈلی سرکس میں متحرک سائن بورڈوں اور روشنیوں اور انگلستان کی سڑکوں پر خوبصورت پوسٹرز پر بڑی فصاحت سے گفتگو کرتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ جوہو کا ساحل سمندر اب بھی بورڈوں کے بغیر ہی اپنے ناریل کے درختوں سے خوبصورت لگتا ہے تو وہ بذاق افسردہ ہو گیا اور کہا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی مشکل ہی یہ ہے کہ معاملات کو لمبے عرصے تک ویسے کا ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد اس سے ایک دفعہ اور مل کر مجھے پھر کوفت اٹھانی پڑی۔

میں بمبئی میں ایک یورپی دوست سے ملا۔ اس کے لئے میرے پاس ایک مشترکہ دوست کا خط تھا۔ یہ بڑا صاف گو آدمی تھا۔ اس نے بڑی حوصلہ شکن تصویر پیش کی۔ دوسری فرموں کی طرح اس کی اپنی فرم بھی ہندوستانیوں کو اپنی انتظامیہ میں لینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ایک آدہ ہندوستانی کو جگہ ضرور مل گئی تھی لیکن وہ اثر و رسوخ کا معاملہ تھا یا وہ آکسفورڈ یا کیمبرج کا اعزاز یافتہ تھا۔ مستقبل میں میری شادی مزید الجھنیں پیدا کر سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ یورپی فرموں کو میری شادی پسند نہ آئے۔ اس کی اپنی فرم نے ایک بڑے بارسوخ شخص کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کی شادی بھی ایک انگریز لڑکی سے ہوئی تھی۔ یہ بہت سے الجھنوں کا باعث بنی اور وہ دونوں بڑے آزردہ ہوئے۔ اس کے یورپی رفقائے کار ایسی شادیوں کو خاموشی سے مسترد کر دیتے تھے اور اس کا اظہار سوشل ٹیبو کی صورت میں ہوتا تھا۔ لڑکی اسے شدت سے محسوس کرتی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر میں نے سوچا کہ کسی ہندوستانی فرم میں شمولیت بہترین راستہ ہے جہاں ایسے مسایل موجود نہیں۔ اور پھر ہندوستان کی بہتری کے لئے کام کرنا بڑا دل خوش کن خیال تھا۔ لیکن سیدھا ان کے دفتر میں پہنچ کر ملازمت کے طلب گار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ منیجر کو جاننا ضروری تھا اور اگر اس کا تعلق بھی اپ کی ذات سے ہو یا کسی ایسے آدمی سے جس کا وہ ممنون احسان ہو تو اور بھی بہتر تھا۔ ورنہ ایک اجنبی کو ملازم رکھ کر وہ ایک اچھی نوکری کیوں ضائع کرے جبکہ وہ برابر کی اسناد رکھنے والے کسی دوست یا رشتے دار کو ملازم رکھ کر ممنون کر سکتا تھا۔

ایک تعارفی خط لے کر میں ایک کمپنی کے جنرل مینجر کو ملنے چلا گیا لیکن ایک مختلف قسم کا صدمہ میری گھات میں تھا۔ یہ شخص معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں کم سے کم کتنی تنخواہ قبول کروں گا۔ میں نے بڑی سادگی سے کہا کہ میں تو کسی ہندوستانی کمپنی میں ملازمت کا بڑا

خواہش مند ہوں۔ اگر آئندہ امکانات ہوں تو ابتدائی تنخواہ اتنے معنی نہیں رکھتی اور کچھ عرصہ بعد اگر معلوم ہو جائے کہ مجھ میں مطلوبہ صلاحیت ہے تو مجھے امید ہے کہ مجھے معقول تنخواہ ملے گی۔ لیکن اس وقت تنخواہ اتنی اہم نہیں۔ اس بات پر وہ خفا ہو گیا اور باہر سے تربیت یافتہ لوگوں کے مبالغہ آمیز تصورات پر اس نے مجھے ایک لیکچر دے ڈالا۔ اس نے پوچھا کیا میں اپنے آپ کو آئی سی ایس کے برابر سمجھتا ہوں اور بڑی تنخواہ کا خواہاں ہوں۔ میں نے احتجاج کیا کہ میں نے تو کسی رقم کا نام تک نہیں لیا۔ لیکن اس نے اس نصیحت کے بعد کہ میں اپنے مطالبات میں منکسر المزاجی سے کام لوں اور اپنے متعلق مبالغہ آمیز خیالات دل سے نکال دوں' مجھے دفتر سے باہر بھیج دیا۔ یوں انٹرویو ختم ہو گیا۔ میں اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔

اب صرف ایک ہی بڑی فرم رہ گئی تھی لیکن وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میرے تمام تعارفی ذریعے ختم ہو چکے تھے۔ مزید وہ فرم صرف اپنے مذہب کے لوگوں کو ہی ملازم رکھتی تھی۔ چنانچہ میں نے کچھ یورپی فرموں سے رابطہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ کسی فرم کے دفتر پہنچ کر صرف اپنا تعارفی کارڈ اندر بھیج دینا ہی کافی ہے۔ آپ کو اندر بلا لیا جائے گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اکثر نے تو یہ کہا کہ ان کا ہیڈ آفس کلکتے میں ہے' مجھے وہاں جانا ہو گا۔ دوسروں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ لیکن سب نے میری حوصلہ افزائی ضرور کی اور مجھے یہ تاثر ملا کہ وہ اپنی انتظامیہ میں ابھی ہندوستانیوں کو رکھنا نہیں چاہتے تھے گو یہ مرحلہ اب دور نہیں تھا۔ ایک مینجر نے ذرا دلچسپی ظاہر کی اور مجھے اپنے اکاؤنٹینٹ سے ملنے کو کہا۔ یہ اکاؤنٹنٹ بہت باصلاحیت آدمی نظر آتا تھا۔ اس کا لہجہ بھی شمالی انگلستان والوں کا تھا جس سے مجھے ماضی یاد آ گیا۔ اس نے مجھے صرف سرسری توجہ دی کیونکہ اسے کسی انڈسٹری میں ایک سند یافتہ اکاؤنٹینٹ کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا کہ ان کے بغیر وہ اپنے اکاونٹس کا کام کیسے چلاتے ہیں۔ اگرچہ میرا انٹرویو تو ختم ہو چکا تھا لیکن مجھے یہ بتایا گیا کہ اکاونٹس کے عملے کو وہ خود تربیت دیتے ہیں اور اونچی ڈگریوں میں وہ یقین نہیں رکھتے۔ مجھے وہ اپنے یارک شائر والے پرنسپل جیسا لگا جس کا بیرون اس کے اندروں سے بڑا مختلف تھا۔ میں نے کہا کہ شاید انہیں کسی اکاونٹینٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس سے شاید اس کے دل میں ہمدردی کا کوئی جذبہ جاگ اٹھا اور اس نے مجھے اگلے دن آنے کو کہا۔ اسے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

وہ ایک حساس آدمی لگتا تھا جس کے اطوار اور زبان میں ایک فیصلہ کن عنصر تھا۔ اس نے مجھے اپنی تجویز کا خاکہ بتایا۔ یہ خاکہ اس کے ذہن کا عکاس تھا۔ اور اس میں میرے متعلق دلچسپی کا ایک ہلکا سا احساس تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مارکٹنگ ریسرچ کا ایک نیا شعبہ کھولنے والے ہیں اور ان کے ہیڈ آفس سے آکر کسی نے کام کو شروع کرنا ہے۔ انہیں ایک ایسے ہندوستانی کی ضرورت تھی جو اس کی زیر نگرانی تربیت حاصل کرے۔ وہاں مستقبل اتنا ہی اچھا ہو گا جتنا کہ اکاونٹس کے محکمے میں مگر میری برسوں کی تربیت میرے کسی کام نہیں آئے گی۔ اس نے مجھے بڑی صاف گوئی سے بتا دیا کہ اکاونٹس کے شعبے میں جانے کا امکانات کم ہوں گے۔ اس نے مجھے اس تجویز پر غور کرنے کے لئے کہا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ میں اپنی لائن ہی کی تلاش میں کلکتے کا چکر بھی لگا لوں۔ میں کلکتے چلا گیا اور بیلارڈ اسٹیٹ سے حاصل کی ہوئی خود اعتمادی کے ساتھ میں کلائیو سٹریٹ اور ڈلہوزی سکوئر کے چکر کاٹنے لگا۔ وہاں کوئی بڑی ہندوستانی فرم نہیں تھی جو ملازمت دے سکے۔ انگریزی تجارتی فرمیں بڑی شائستہ تھیں لیکن ہندوستانیوں کو مینجر رکھنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ کوئی بارسوخ نوجوان کہیں کہیں بھرتی ہو گیا تھا لیکن فرموں کو ہندوستانی بنانے کا عمل بطور پالیسی کے ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ایک ربڑ کمپنی کے چیف اکاونٹنٹ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ایک چارٹرڈ اکاونٹینٹ کو [illegible] سو پچاس روپے پر رکھا ہے اور "تم نے اسے میرے دفتر کے باہر بیٹھا ہوا دیکھا ہو گا۔ تو دیکھیں گے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"۔

پریکٹس کرنے والی فرمیں سرد مہر اور الگ تھلگ تھیں۔ ان کی شراکت مقدس تھی۔ مینجنگ ایجنسیاں اپنے کارندے انگلستان سے یہاں بھیجتی تھیں۔

میں پھر ہمت کر کے آئل کمپنی کے پاس دوبارہ گیا اور وہاں کے چیف نے مجھے اکاونٹنٹ کے پاس بھیج دیا۔ وہ آسٹریلین تھا مگر آرٹیکل شپ اس نے انگلستان سے ہی کی تھی۔ اس دفعہ معاملہ قدرے بہتر تھا۔ میری اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں جن کے دوران بحث یہ ہوتی تھی کہ یہ پیشہ ہمیں کہاں لے جائے گا اس موضوع پر میں خاصا جوشیلا تھا اور پیشے میں ایک نووارد کے خیالات سن کر وہ بڑا محظوظ ہوتا تھا۔ ہم دونوں کو امید تھی کہ ایک دن اکاونٹینٹ اپنے لیجر چھوڑ کر عملی انتظامیہ میں ضرور آئیں گے۔ آخر میں اس نے مجھے بتایا کہ اگر میں دو تین ماہ انتظار کر سکوں تو ممکن ہے کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ اور اگر اس اثنا میں بمبئی میں ملازمت کر لوں تو اسے اطلاع ضرور دوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی فرم اور اس کے سوشل ماحول میں فٹ ہونا ضروری ہو گا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ

تو سوچنا پڑے گا لیکن چونکہ وہ خود آسٹریلین تھا وہ میرے اس نکتے کو سمجھ گیا۔

میں نے بمبئی والی فرم میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انٹرویو لینے والے بڑے اچھے لوگ تھے۔ ان کی صنعت اسی ملک میں تھی اور وہ ہندوستانیوں کو فرم میں داخل کرنے کے تجربے کے متعلق بڑے سنجیدہ تھے۔ اس فرم کا مبدا شمالی انگلستان تھا اور وہاں کا لب و لہجہ اس سٹاف میں بھی منعکس ہوتا تھا۔ میرے لئے یہ مزید کشش کا باعث تھا۔ زندگی میں ان کا اولین مقصد کام تھا اور یہی وہ معیار تھا جو مجھے اپنے والد سے وراثت میں ملا تھا۔ تسویے کا طویل عمل میرے سامنے تھا۔ اس میں کئی مسایل اور تکلیفیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن یہ تجربہ بذات خود ایک انگیخت کا باعث تھا۔ اپنے پیشہ ورانہ تربیت چھوڑ کر میں نے ایک نیا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

اس بڑے مسئلے کے حل ہو جانے کے بعد اپنے گھر والوں سے ملنے میں لاہور چلا گیا۔

سولہواں باب

مختلف پیشے اختیار کرنے والے پنجابیوں کے لئے یہ عین فطری عمل تھا کہ اپنی ملازمتوں کے اختتام کے بعد وہ اپنے آبائی مقامات کی طرف لوٹ جائیں اور ایک چھوٹے سے گاؤں یا قصبے کے چھوٹے سے معاشرے میں معزز بزرگوں کی طرح اپنی زندگی کے آخری دن گزاریں۔ لیکن میرے والد والی نسل اپنے پس منظر سے دور پروان چڑھی تھی۔ ان کے لئے مسئلہ ایسی جگہ آباد ہونا تھا جو ان کے مزاج کے مطابق ہو۔ میں ابھی انگلستان ہی میں تھا جب میرے والد اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے اور انہوں نے لاہور سے چھ میل دور ماڈل ٹاؤن میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔

ماڈل ٹاؤن ایک ایسی جگہ تھی جس کی مثال دنیا نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ آئندہ کبھی دیکھے گی۔ اس میں تقریباً سب ریٹائرڈ آدمی رہتے تھے جو ایک دوسرے کو رائے بہادر رائے صاحب، خان صاحب اور سردار بہادر اور سردار صاحب جیسے ناموں سے مخاطب کرتے تھے۔

کسی نے ۱۹۲۵ میں سوچا تھا کہ شہر سے دور جنگل میں ایک قطعہ زمین لے کر اسے پلاٹوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ایک کواپریٹو سوسائٹی تشکیل دی جائے جو بھی پلاٹ خریدتا تھا وہ سوسائٹی کا ممبر بن جاتا تھا اور ووٹ کا حقدار ٹھہرتا تھا۔

ماڈل ٹاؤن کا نقشہ جیومیٹری پر مبنی تھا۔ اس کا ایک مرکز تھا اور اس کے گرد ہم مرکز دائروں کی صورت میں کئی سڑکیں تھیں۔ مرکز سے شروع ہو کر چار بڑی سڑکیں ان دائروں کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ اس طرح پورا شہر یا قصبہ قطعات میں بٹ جاتا تھا۔ سڑکوں کے کوئی نام نہیں تھے لیکن قصبے کے مختلف بلاکوں کو انگریزی کے حروف تہجی سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہمارے گھر کا نمبر ۱۲ جی تھا تو ہمارے سامنے والے گھر کا نمبر ۲۱ ایف تھا۔ پرانی سوچ والوں کے لئے یہ کافی تھا کہ گیٹ پر گھر کا نمبر لگا دیا جائے۔ بعد میں آنے والے لوگوں نے اپنے گھروں کے شاعرانہ نام رکھ لئے۔

مرکز کے اطراف ایک وسیع اور مدور قطعہ زمین تھا۔ یہ جگہ شاملات دیہہ تھی اور

اس میں صرف پگڈنڈیاں اور کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ اسے ایک وسیع پارک کی صورت دی جائے گی۔اس کے کناروں پر لائبریری' سکول' جنج گھر' اور دوسرے پبلک اداروں کے لئے جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ ابھی تک کلب' سکول' ہسپتال اور ڈسپنسری بن چکے تھے مگر کئی پراویٹ سکول مکمل چکے تھے۔ دکانوں اور مارکٹوں کے لئے جگہیں مختص تھیں۔ ماڈل ٹاؤن میں ایک مسجد' ایک مندر اور ایک گردوارہ تھا۔ مندر جدید فن تعمیر کا انتہائی دلکش نمونہ تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔

نقشے پر ماڈل ٹاؤن باقاعدگی اور تنظیم کا ایک نمونہ تھا اور یہاں رہنے والوں کی زندگیوں میں بھی یہی باقاعدگی اور تنظیم منعکس ہوتی تھی۔ باعمل زندگی سے ریٹائرمنٹ کی طرف تغیر کے وقفے کو اپنا اپنا گھر بنانے کے کام نے کافی آسان اور خوشگوار بنا دیا تھا ایک کے بعد ایک ریٹائر شدہ انجنیئر' ڈاکٹر' ریٹائر ہونے والے سیویلیوں اور سیشنز جج آنا شروع ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں کی بنیادیں رکھنے لگے۔ ان سب کی کوششوں کے نتیجے تقریبا ایک جیسے تھے کیونکہ یہ گھر انگریزی بنگلوں اور ڈاک بنگلوں کی صورت میں ہی بنائے گئے تھے جن میں ملازمت کے دوران ان لوگوں نے اپنی زندگیاں بسر کی تھیں۔ ایک لمبی گیلری گھر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ اس کے لئے ایک طرف کھانے کا کمرہ' ڈرائینگ روم اور دفتر کا کمرہ ہوتا تھا۔ دوسری طرف سونے کے کمرے' ڈرسنگ روم اور غسل خانے ہوتے تھے۔ سامنے کی طرف برآمدے سے آگے ایک لان اور پھولوں کی کیاریاں اور سرو کے درخت ہوتے تھے۔ یہ مردانہ استقبالیہ تھا۔ مکان کے دوسری طرف بھی ایک برآمدہ ہوتا تھا سردی کے دنوں کے سوا کھانا یہیں کھاتے تھے۔ صحن کچے تھے اور ان کی چار دیواری بھی تھی۔ یہ علاقہ عورتوں کا تھا۔ اسی طرف کچن اور سٹور کے کمرے ہوتے تھے۔ گھر میں ملازموں کی رہائش گاہیں اور سبزیوں کی وسیع کیاریاں تھیں اور عموماً ایک چھوٹا سا باغ ہوتا تھا۔

ہمارا گھر بڑے پیار سے بنایا گیا تھا۔ میرے والد کی ساری فنی مہارت' سوچ اور احتیاط اس گھر کے بنانے میں صرف ہوئی۔ اس کی دیواریں بڑی چوڑی تھیں تاکہ گرمیوں سے بچاجا سکے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سردیوں کی شاموں میں گھر برف خانہ بن جاتا تھا اور والد اپنے سیارتی نقطۂ نظر سے آگ جلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ گھر میں کمروں کے چار باہم ملحق کمروں کا سلسلہ تھا تاکہ آنے والے دنوں میں سارے بھائی مع اپنے بال بچوں کے آکر اکٹھے رہ سکیں مگر ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ ایک دفعہ ہم تینوں بھائیوں نے چھٹیاں یہاں گزاریں لیکن اس وقت ہمارے چھوٹے بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ میرے والد

کی مخصوص پیش بینی تھی کہ انہوں نے اگرچہ اپنی موٹر گاڑی بیچ دی تھی' پھر بھی انہوں نے دو گیراجیں بنوائی تھیں ایک گیراج چارپائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس طرح اپنے گھر میں ہم کئی مہمان ٹھہرا سکتے تھے۔ گرمیوں کے لئے گھر کی تین چھتیں تھیں۔ آپ سونے کے لئے کسی ایک کا انتخاب کر سکتے تھے۔ زیریں چھت پچھلے برآمدے پر تھی۔ دوسری وہ چھت تھی جو کمروں کے اوپر تھی اور تیسری اس چھت کے اوپر برساتی تھی۔ اس طرح اس کا اگلا حصہ انگریزی طرز کا اور اس کا پچھلا حصہ دادا چچا کے گھروں کی طرف تھا۔

چند بنگلوں کو چھوڑ کر گھر کا ساز و سامان بھی ڈاک بنگلوں کی طرح افادیت کا مظہر تھا۔ ہمارے گھر میں تعیش کی چیز فقط ایک ایرانی قالین تھا جو والد کی کشمیر کی سیاحت کی یاد دلاتا تھا۔ اس قالین کے ارد گرد بڑی ترتیب سے دو صوفے اور چھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ ہر صوفے کے سامنے ایک میز تھی جس پر پھندنوں والی ریشمی میز پوش تھے۔ گارڈ نے اس ترتیب کو بدلنے اور ان چیزوں کو مختلف طریقے سے رکھنے کی اور پھندنوں والے میز پوشوں کو ہٹا کر نئی ترتیب کی بڑی کوششیں کی لیکن ہمارا پرانا ملازم صبح سویرے اسی سابقہ ترتیب کو بحال کر دیتا تھا۔ آخر تھک ہار کر گارڈ نے اس کام سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تصویروں میں بڑے بھائی کی شادی کی تصویر' روی ورما کی شکنتلا اور سٹیجز آف لائف والی تصویر تھیں۔ آخری تصویر کو گارڈ نے سویڈن کے فارم پر اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔

گرمی کے دنوں میں تو ایسے گھر کی دیکھ بھال آسان تھی لیکن باغیچہ بڑے تواتر سے توجہ مانگتا تھا۔ یہاں بھی والد کا افادیت والا رجحان نظر آتا تھا۔ سامنے والے باغیچے میں کچھ پھولوں کو اتنی توجہ درکار نہیں تھی لیکن اس میں ایسے درخت بھی تھے جو پنجاب کے تمام پھل دار درختوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی اس باغ کی کمزوری تھی۔ ہر درخت اپنے اپنے موسم میں پھل دیتا تھا۔ موسم مختلف ہوتے تھے اس لئے ان کہ ہمہ وقت رکھوالی مشکل تھی۔ سنگتروں کو چھوڑ کر سارا پھل طوطے کھا جاتے تھے۔ سبزیوں میں میرے والد کو خاص دلچسپی تھی۔ سبزی کی کیاریان ہماری ضرورت سے زیادہ پیدا کرتی تھیں۔ ایک اچھے پنجابی کی طرح والد گوبھی کے سائز اور اس کی سفیدی پر فخر کیا کرتے تھے۔

سب بوڑھے آدمی اپنا کام جلدی شروع کر دیتے تھے۔ ان کو ورزش میں دلچسپی تھی۔ گرمی کے دنوں میں سرکولر روڈ پر صبح جاگنے والوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنا اپنا چکر پورا کرنے کی دھن میں ہوتا تھا۔ اس وقت یہ لوگ اتنے مصروف ہوتے تھے کہ انہیں آپس میں باتیں کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ ان کی ساری توجہ اپنی اپنی ورزش پر ہوتی

تھی۔ سردیوں کی ٹھنڈی صبحوں کو والد کی گھڑی کا الارم چھ بجے بج اٹھتا تھا۔ جب ہم اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوتے وہ مرکزی دائرے کے گرد چکر لگا کر اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے دن بڑے لمبے ہوتے تھے۔ پھر ان کے پاس کرنے کو بھی کچھ نہ تھا لیکن دیر سے اٹھنا ان کے اصولوں کے خلاف تھا۔ بارش والی صبحوں میں ورزش کے لئے والد نے پچھلا برآمدہ ناپ رکھا تھا۔ انہیں پتہ تھا کہ کتنی دفعہ اس برآمدے مین ادھر سے ادھر بھاگ کر چکر لگانے سے ان کی ورزش پوری ہو جائے گی۔

شام کی سیر میں زیادہ زندہ دلی ہوتی اور یہ گفتگو کے لئے مخصوص تھی۔ اپنے ایک ہمسائے کے ساتھ جو بیکانیر میں وزیر رہ چکا تھا' میرے والد روانہ ہو جاتے تھے۔ چکر کے دوران اکثر رک کر دوسرے رائے صاحبوں اور رائے بہادروں سے گفتگو کرتے تھے۔ موضوع صحت ہوتا تھا اور گفتگو بڑی مفصل ۔ ایک دوسرے کو دوائیوں کے بارے میں مشورہ دیا جاتا تھا۔ اور ہر مقبول یا پسندیدہ دوائی کے خواص بیان کئے جاتے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ دوائیوں پر ان لوگوں کو بڑا اعتماد تھا۔ نئی نسل بھی ایک موضوع تھا۔ ان لوگوں کے خیال میں نئی نسل تن آسانی اور تفریح کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اورماڈل ٹاؤن میں سینما گھر کا تقاضا کر رہی تھی۔ مگر یہ بزرگ کہتے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ملازم ست ہو جائیں گے اور بچوں کی توجہ پڑھائی سے ہٹ جائے گی۔ ان میں سے اکثر ایسے حضرات بھی تھے جنہوں نے فلم نہیں دیکھی تھی۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں ایک شخص کو یہ کہتے سنا "اب تو یہ صرف فلموں کی باتیں کرتے ہیں"۔

سب سے زیادہ دلچسپ موضوع ماڈل ٹاؤن کوآپریٹو سوسائٹی کے معاملات تھے۔ چونکہ یہ لوگ خود بھی افسر رہ چکے تھے اس لئے یہ خود ہی سوسائٹی کے دفتر اور اس کے سیکریٹری کو چلانا چاہتے تھے۔بیچارہ کوئی سکریٹری بھی چند ماہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ ریٹائر ہونے والا کنزرویٹر آف فارسٹس اسے اور اس کے مالیوں کو درختوں' پودوں اور باڑوں کے بارے میں سرزنش کرتا تو پی ڈبلیو ڈی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہونے کی بنا پر مختلف انجنیئر اپنے اپنے متعلقہ شعبوں کی مناسبت سے یعنی آب پاشی' سڑکیں عمارتیں اور بجلی کے متعلق اپنی اپنے مشورے تھوپنے کی کوشش کرتے تھے۔ آئی سی ایس والے ہر چیز کے متعلق قانون نافذ کرتے تھے ۔ جب انتخابات کا وقت آتا تو ہر طرف بڑی سرگرمی دکھائی دیتی تھی۔ والد صرف کھانے کے وقت ہی نظر آتے تھے ورنہ وہ سارا دن ووٹوں کو لئے بھاگ دوڑ کرتے رہتے تھے۔ میرے والد سیاست کرنے والے لوگوں کے مقابلے میں بہت سادہ تھے۔

اور ایک اچھے سیاست دان کی خوبیوں سے بالکل عاری تھے۔ وہ کوئی آفس بیرر نہیں بن سکے تھے۔ گارڈ ایک دفعہ سالانہ اجلاس میں ان کے ساتھ گئی۔ اس نے بتایا کہ جب ان کو ووٹوں کی گنتی کے لئے کہا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گارڈ کو اپنے اس پیچیدہ سوال کا جواب بھی مل گیا کہ دیواروں پر سیاہی کے دھبے کیوں ہیں۔ جب بحث کے دوران ممبر گرم ہو جاتے تو سیاہی کی بوتلیں ہوا میں اڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ چنانچہ وہ بڑی خوش تھی کہ وہ عورتوں کے حصے میں بیٹھی تھی۔

گارڈ کو ماڈل ٹاؤن کی زندگی کے متعلق زیادہ پتہ تھا کیونکہ تقسیم سے پہلے ہر سال کچھ وقت وہ وہاں گزارا کرتی تھی۔ جب وہ بمبئی میں تھی اور آب و ہوا کی عادی ہو رہی تھی تو اس نے تھوڑی بہت ہندی سیکھ لی تھی۔ ان دنوں میرے چھوٹے بھائی کرشن کو میری والدہ نے اپنی بھابی سے ملنے بمبئی بھیجا تھا۔ کرشن کی واپسی پر گارڈ اس کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ اسے ملنے کے لئے میری والدہ اور والد سٹیشن پر گئے۔ اس وقت اسے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی کہ اسے میرے والد اس کے اندازے سے زیادہ کم عمر نظر آئے۔ در اصل میرے والد یوروپین عورتوں کو ہمیشہ پرکشش نظر آئے کیونکہ وہ خواتین ہمارے رواج کے مطابق انہیں بزرگوں والے خطبات سے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ اس لئے میرے والد ان سے بے تکلف ہو جاتے تھے اور بڑی زندہ دلانہ گفتگو کرتے تھے۔ والد نے گارڈ کا بڑی محبت سے استقبال کیا۔ کئی عورتوں نے میری والدہ سے پوچھا کہ ایک غیر ملکی بہو ان کے لئے صدمے کا باعث تو نہیں بنی۔ میری والدہ نے بڑی دل آویز سادگی سے کہا "ایک پنجابی لڑکی کو ناخوش رکھنے کی بجائے یہ کہیں بہتر ہے کہ ان کا بیٹا ایک غیر ملکی لڑکی کو خوش رکھے"۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور گارڈ ایک اچھا تاثر دینے کے لئے بے چین تھی۔ ساڑھے چار بجے اٹھ کر سیر پر جانے کے لئے وہ بڑی خوش تھی کیونکہ صرف اسی وقت ہی اسے تازہ اور ٹھنڈی ہوا میسر آ سکتی تھی۔ میرے والد نے اپنے پرانے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ گارڈ ایم اے پاس ہے۔ ان کے لئے یہ فخر کا مقام تھا کہ ان کی دونوں بہوؤں کے پاس دو دو ڈگریاں ہیں۔ میرے والد نے دونوں کو اپنے خرچ پر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ گھر میں ایک عورت ڈاکٹر ہونی چاہئے۔ دونوں بہوؤں نے بڑی شائستگی سے معذرت کر لی تھی تاہم ان کی بھتیجی نے ان کی تمنا پوری کر دی۔

شام کے وقت جب گرمی ذرا کم ہو جاتی اور ہر شخص نہا کر کپڑے بدل لیتا تو عورتیں نئی دلہن کو دیکھنے کے لئے آ جاتی تھیں۔ وہ صحن میں جہاں تازہ تازہ چھڑکاؤ کیا ہوتا تھا' بیٹھ

جاتیں۔ ہر عورت اسے چاندی کے دو روپے دیتی اور اس کی ٹوٹی پھوٹی ہندی کی تعریف کرتی اس غیر کٹر قسم کی شادی پر ان کے خیالات خواہ کچھ ہی ہوں' ان عورتوں کی کوشش ہوتی تھی کہ گارڈ اجنبیت محسوس نہ کرے۔ ہر شام کو ہماری ایک ہمسائی اپنی پانچ بیٹیوں کے ساتھ جن کی عمریں سولہ سے سات برسوں کے درمیان تھیں' آ جاتی تھی۔ وہ خود بھی ٹنڈن تھیں' اپنی اس نئی بھابی کے بارے میں متجسس تھیں اور اس پر اپنی انگریزی آزمانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر شام کو میری والدہ گارڈ کو بازدید کے لئے لے جاتی تھیں۔ اور وقت یوں ہی گزرتا گیا۔

اب والدہ کو موقع ملا کہ وہ ہماری شادی باقاعدہ رسم و رواج کے مطابق کریں۔ چنانچہ ایک آریا سماجی پنڈت بلایا گیا' مقدس آگ برآمدے کے سامنے جلائی گئی۔ پہلے بزرگوں نے اور پھر گروؤں نے گارڈ کو ہندو مذہب میں داخل کیا اور علامتی طور پر اسے سنسکرت نام دیا۔ پھر اکٹھی گرہ باندھے جانے کے بعد ہم سات قدم چلے۔ یہ بڑی مختصر رسمیں تھیں۔ صرف چند رشتے دار اور دوست موجود تھے۔ میری والدہ بڑی خوش تھیں۔ رواج کے مطابق مٹھائی تقسیم ہوئی۔ گارڈ کو بھی بڑی خوشی ہوئی جس کا کہنا تھا دو کرائے کو گواہوں کو لے کر بمبئی کے رجسٹرار کے سامنے شادی کرنا شادی نہیں لگتی اور اس کی والدہ بھی اس قسم کی شادی پر بڑی خوش ہوئی۔

دو دنوں کے بعد میں واپس جانے کے لئے سٹیشن گیا لیکن جلد لوٹ آیا۔ سب لوگ حیران ہو گئے۔ میں نے سٹیشن پر سنا کہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ چنانچہ نئی ہدایات کے لئے میں لاہور ہی رک گیا۔ دوسرے دن پھر روانہ ہو گیا۔ میرے جانے کے بعد جلد ہی گارڈ میرے بڑے بھائی اور اس کی بیوی کو ملنے شمالی بہار چلی گئی۔ جب وہ واپس بمبئی پہنچی تو ہمیں تار کے ذریعے اطلاع ملی کہ آپریشن کے دوران میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

روایت میں ڈھلے ہونے کی وجہ سے والد نے دکھ کا زیادہ اظہار نہیں کیا اور اپنے بیٹوں سے بھی وہ یہی توقع کرتے تھے۔ ہمیں تار میں صرف اتنا کہا "آنے کی تکلیف مت کرو"۔ میری بھابی وہاں موجود تھی جس نے اس ...... پر سارے انتظامات سنبھال لئے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد والد کی زندگی ان کے پچاس سالہ پرانے ملازم چتر سنگھ کی معیت میں معمول کے مطابق چلتی رہی۔ چتر سنگھ ان کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ والد نے کچھ دن ہمارے ہاں بمبئی میں قیام کیا۔ جب میری بیٹی مایا پیدا ہوئی تو ہمارے اور بچی کے علاوہ انہیں اور کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اپنی ہم عمروں کی رفاقت کے لئے اداس تھے۔

چنانچہ وہ ماڈل ٹاؤن واپس چلے گئے۔ ہم یعنی ان کے بیٹے ان کی خبر گیری کے لئے باری باری اپنے بال بچوں کو ان کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے سب سے چھوٹے بھائی کی بھی شادی ہو گئی۔

گارڈ کو ماڈل ٹاؤن کی زندگی بہت پسند تھی۔ اگرچہ بمبئی میں کسی قسم کے سوشل مقاطعہ سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا مگر بمبئی سے اسے چڑ تھی۔ اس میں یورپی لوگوں کا غلبہ تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں ہندوستانیوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ وہ لاہور کے مکمل ہندوستانی ماحول میں خوش رہتی تھی۔ چھوٹی سی سویڈش جماعت نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ جب سے اس نے اپنا سامان اتارا اور لاہور سٹیشن پر تانگوں میں بچے ایک سے دو' دو سے تین اور تین سے چار کر کے بڑھتے گئے' تو اس نے لاہور میں اپنائیت محسوس کرنی شروع کر دی تھی اور جب قافلہ ماڈل ٹاؤن پہنچا تو سڑک پر چلتے لوگوں نے اس کی واپسی پر خوش آمدید کہا۔ جنگ کے دنوں میں باقی جگہوں کے مقابلے میں لاہور میں کچھ زیادہ ہی خود مرکزیت آ گئی۔ پیٹرول کی کمی کی وجہ سے لوگوں نے اپنی کاریں کھڑی کر دیں تھیں۔ گرمیوں میں تانگے میں چھ میل لاہور جانا کوئی مذاق نہیں تھا اور بسیں وقت سے بہت پہلے ہی بک ہو جاتی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن کی بسیں ٹرک نظر آتی تھیں۔ گنجائش سے زیادہ سواریوں کے علاوہ ان پر ٹرنکوں' بائیسکلوں اور دوسری بھاری سامان کے ڈھیر ہوتے تھے۔ لاریوں میں جو ان کا اصلی نام تھا' سامنے کی طرف پردے کا انتظام بھی تھا۔ اس کے دھڑا دھڑ بھر جانے کے بعد عورتیں صرف مردانہ حصے میں ہی شائستگی سے بیٹھ سکتی تھیں۔ ایک انگریز فوجی ڈاکٹر کی بیوہ شہزادی سدر لینڈ' جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری اولاد تھی' یہ شکایت کرتے ہوئے سنی گئی کہ اسے اب لاری میں ایک نشست بھی نہیں مل رہی جب کہ سارا پنجاب اسی کی ملکیت تھی۔ وہ بوڑھی خاتون ماڈل ٹاؤن میں ہی رہتی تھی اور اپنے اجداد کی شان و شوکت کی یادوں پر زندہ تھی۔

ماڈل ٹاؤن صرف بوڑھوں کی ہی بستی نہیں تھی۔ کچھ سرکاری ملازموں نے جن کی بیویاں فوت ہو گئی تھیں چھوٹی عمر کی لڑکیوں سے شادیاں کر لی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بچے بھی پیدا کر لئے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی گھر میں تین خوشیاں منائی جاتی تھیں یعنی جب ماں' بیٹی اور بہو کو ایک ہی دن بچے پیدا ہوتے تھے۔ لیکن نئی نسل نے ماڈل ٹاؤن میں ابھی اپنا کوئی مقام نہیں بنایا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے سوشل واقعات صرف منڈن اور شادیاں تھیں۔ کیونکہ ان کی واقفیت کا حلقہ کافی وسیع تھا بوڑھی عورتیں لڑکے یا لڑکی کی

شادی کے متعلق مشورے کے لئے میرے والد کے پاس ہی آتی تھیں۔ اس سے میرے والد بڑے خوش ہوتے تھے۔ اگر رشتہ طے ہو جاتا تو متعلقہ بوڑھی خاتون مٹھائی کی ٹوکری لے کر والد کے پاس آتی تھی اور شادی کی دعوت دیتی تھی - والد ہمیشہ شادیوں میں شرکت کے لئے خوشی کی خاطر نہیں بلکہ ایک فرض ادا کرنے کے لئے گارڈ کو بھیج دیتے تھے۔ اور اسے بتاتے تھے کہ اس کا نمایاں ہونا اچھی بات ہے۔ اس سے ہر شخص کو پتہ لگ جائے گا کہ ان کے خاندان کی نمائندگی ہو رہی ہے۔

مردوں اور عورتوں کی کلبیں کھیلوں کا انتظام تو کرتی تھیں لیکن کلب کی اصل زندگی کی ہیشہ کی رہی۔ کچھ نوجوان لوگوں نے ایک انقلابی قسم کی اختراع کا انتظام کیا۔ یہ مردوں کی کلب میں ایک مخلوط وسٹ ڈرائیو تھی۔ لیکن اسے پسندیدگی سے نہیں دیکھا گیا کیونکہ کھیل کافی دیر کے بعد رات گیارہ بجے ختم ہوتا تھا۔ تقسیم سے قبل آخری سال میں دوسری نئی چیز شادی کے بعد ٹی پارٹی تھی۔ سوائے چند مسلمان گھرانوں کے پردے کا رواج عام تو نہیں تھا لیکن مردوں اور عورتوں کا صحیح طریقے سے ملنا جلنا کبھی نہیں ہوا یہاں تک کہ میاں بیوی بھی سیر کے لئے اکٹھے نہیں جاتے تھے۔ عورتیں عورتوں کے ساتھ اور مرد مردوں کے ساتھ سیر کے لئے نکلتے تھے۔ چھٹیوں پر آئے ہوئے نوجوان بھی اسی روش کی پیروی کرتے تھے۔

بوڑھے انجینئروں' ڈاکٹروں اور دیگر سرکاری ملازموں کو اگر تقسیم کی قیمت ادا نہ کرنی پڑتی تو ان کی زندگیاں آخر تک پر امن معمول پر چلتی رہتیں۔ تقسیم سے پہلے چند ایک تو بڑے سکوں سے وفات پا گئے لیکن اکثر کو زندگی از سر نو شروع کرنی پڑی۔ کچھ لوگ تو اپنے بیٹوں کے پاس اور دوسرے متاع غرور کا سودا کر کے اپنی بیٹیوں کے فلیٹس میں چلے گئے۔ ان کی بیویوں کو اپنے وسیع صحن چھوڑنے پڑے جہاں ملازموں اور بہوں پر ان کی حکمران تھی۔ وہ بیٹے بیٹیوں کے دست نگر بن گئے۔ اور اگر یہ بوڑھے لوگ ان کو کچھ صلہ دے سکتے تو وہ خوش ہوتے تھے کہ وہ مداخلت بیجا نہیں کر رہے۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس زندگی سے اکھڑ گئے جو انہوں نے اپنے آخری دنوں کے لئے تجویز کی تھی۔

ستارہواں باب

ڈیر پرکاش

فوراً آؤ اور ہمیں نکالو۔

آزادی کے جشن کے رنگ برنگے کاغذی جھنڈے جن کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا' ابھی ہوا میں لہرا رہے تھے جب چچا دوارکا پرشاد کا پوسٹ کارڈ ہمیں ملا جس پر صرف یہ ایک سطر تھی' اور ملک کی تقسیم کی دہشت ہم پر اچانک طاری ہو گئی۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی ہم دونوں بمبئی ہی میں رہ رہے تھے۔ پہلے پہلے ہم افواہوں کو قدرے نظر انداز کرتے رہے اور پریس کی خبروں کی تشویش کو حکومت کم کرتی رہی کیونکہ ابھی تک فضا میں گونجنے والے آزادی کے نغموں کو کوئی بھی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا' مگر خبریں روز بروز زیادہ سے اور زیادہ تشویش ناک ہو رہی تھی۔ چچا کے کارڈ سے پتہ چلا کہ انتقام آن پہنچا ہے۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم کا اعلان ہوا تو بیشتر ہندوؤں اور سکھوں نے اسے نوشتہ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم پہلے بھی مسلمانوں کے تحت رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد سکھوں کے تحت بھی رہے ہیں او پھر انگریزوں کے تحت بھی۔ اب پھر مسلمانوں کی حکمرانی میں جا رہے ہیں تو پھر کیا ہوا؟ ہم کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیں گے۔ آج کل کی حکومتیں بڑی مختلف ہیں۔ وہ آپ کو کچھ حقوق دیتی ہیں۔ انہیں لوگوں کی بات سننی پڑتی ہے۔ ایسے دلائل سے دل کو تسلیاں دے کر لوگوں نے جہاں کہیں وہ تھے' جمے رہنے اور تبدیلی کا مقابلہ کرنے کہ تہیہ کر لیا۔

جولائی میں حالات اور زیادہ دہشت ناک ہو گئے پھر بھی لوگوں کو گھر چھوڑ کر جانے کا خیال نہ آیا۔ ہندوؤں اور سکھوں پر اکا دکا حملے ہو رہے تھے لیکن انہیں صرف بلوے ہی سمجھا گیا۔ اب پنجاب کی باری آ گئی تھی۔ جنگ کے دنوں میں جب پورا ہندوستان ہندو مسلمان تشدد کے ہیجانوں سے لرز رہا تھا ہمیں فخر تھا کہ پنجاب پر امن ہے۔ جیسے ہی حالات بدتر ہوئے والد نے لکھا کہ گھر چھوڑنا بے معنی ہے۔ اگر واقعی مصیبت آ گئی تو وہ محفوظ ہوں

گے۔ ان کے کئی دوست اور ہمسائے مسلمان تھے۔ ایک بوڑھے کو جو پہلے ہی نیم مفلوج ہے کون نقصان پہنچائے گا۔ اور پھر وفادار چتر سنگھ کے ساتھ جو ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا' وہ بڑے آرام سے تھے۔ چتر سنگھ کے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔

اگست میں نوے سالہ نظم و نسق تباہ ہو گیا۔ ابتدائی قسم کی جان و مال کی حفاظت جو چند ہفتے پہلے معمول کی چیز تھی' اب ختم ہو گئی تھی۔ چتر سنگھ نے بھی محسوس کیا کہ اگر اس کو فوری طور پر جانا پڑا تو اس کے گھر والے ہی اس پر کافی بوجھ ہوں گے اور اس پر والد کا خیال رکھنا ایک اور ذمہ داری ہو گی۔ چنانچہ اس نے ہمارے پڑوسیوں سے کہا کہ وہ میرے والد کو سمجھائیں کہ حالات معمول پر آنے تک وہ یہاں سے نکل جائیں۔ وہ اپنے بال بچوں کو امرتسر بھیج رہا تھا۔ ان کے لئے یہ جگہ محفوظ تھی۔ میرے بڑے بھائی نے بہار سے تار بھیجا کہ والد کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ مان گئے اور چتر سنگھ نے انہیں جلدی سے روانہ کر دیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح والد کا بھی یہ یہی خیال تھا کہ فسادات کے خاتمے تک وہ صرف عارضی طور پر جا رہے ہیں۔

ساوتری کی وفات کے چند برسوں بعد چچا دوارکا پرشاد نے دوبارہ شادی کر لی تھی اور گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میری دوسری چچی بڑی خوبصورت عورت تھیں۔ ان کے بال بھورے اور لمبے تھے اور آواز بڑی مترنم تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد انہوں نے چچا دوارکا پرشاد کو رام کر لیا تھا اور اپنی فطری ذہانت سے وہ کافی خوشحال ہو گئے تھے۔ چچا کی وکالت بھی خوب چل رہی تھی۔ میری اس چچی کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی تھی اور والد کے اصرار پر اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے ایک دانتوں کے ڈاکٹر سے شادی کی تھی اور دونوں مل کر امرتسر میں پریکٹس کر رہے تھے۔ سب سے بڑے لڑکے نے قانون کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ باقی دونوں بچے ابھی سکول میں تھے۔

چچا ہمیشہ سے نڈر اور ضدی تھے اور بڑی جلدی لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ عمر کے ساتھ جب وہ برادری کے سربراہ اور کونسل کے ممبر بنے اور میونسپل کمیٹی کے معاملات پر اثر انداز ہونے لگے تو ان میں خاصا دھیما پن آ گیا تھا۔ مختلف مذہبوں والے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے زیادہ موکل ضلعے کے مسلمان مقدمے باز تھے۔ ہر آدمی نے انہیں یقین دلایا کہ وہ محفوظ ہیں اور انہیں اوران کے گھر بار کو کوئی نقصان نہیں

پہنچے گا۔ جب انخلاء نے زور پکڑا تو اس وقت بھی وہ ان یقین دہانیوں پر اعتماد کرنا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کچھ دنوں کے لئے ان کا یہاں سے چلا جانا ہی عقلمندی ہے۔ جب دوبارہ امن ہو جائے تو وہ پھر سے واپس آ جائیں گے۔ کسی کو بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔

ایک دن دو ہزار پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ٹرین گجرات آ کر رکی۔ ان میں بیشتر لوگوں کا تعلق جہلم اور اس سے پرے کے مسلمان علاقوں سے تھا۔ گجرات کے سٹیشن پر اس ٹرین کو روک لیا گیا۔ قریب و جوار کے مسلمان نے جو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبروں سے مشتعل ہو چکے تھے' اس ٹرین پر حملہ کر دیا اور اسے لوٹتے رہے۔ یہ خونریزی ناقابل بیان تھی۔ کئی گھنٹے رکنے کے بعد ٹرین چل پڑی۔ یہ لاشون سے بھری ہوئی تھی اور اس میں ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ جب لاشوں سے بھری ہوئی یہ ٹرین امرتسر پہنچی تو لوگوں نے مسلمان مہاجروں پر حملہ کر کے اس کا بدلہ لیا۔ شیخو پورے اور جالندھر کی دوسری طرف بھی بڑا کشت و خون ہوا۔ مغربی پنجاب سے چھ ملین ہندوؤں اور سکھوں کا ایک بہت بڑا جم غفیر پناہ کی تلاش میں حرکت کرنے لگا۔ بارڈر کے دوسری طرف سے مہاجروں کا ایسا ہی انبوہ مخالف سمت میں حرکت میں آ چکا تھا۔

ایک رات چچا کے مسلمان دوست ان کے پاس آئے اور آنسوؤں سے روتے روتے انہیں نے کہا کہ وہ اب ان کی مزید حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہے اور انہیں اور ان کے گھر والون کو صبح سے پہلے چلے جانا چاہئے۔ اب دوارکا پرشاد پر روشن ہو گیا کہ انہیں وہاں سے نہ صرف چند دنوں کے لئے بلکہ ہمیشہ کے لئے چلے جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سٹیشن پر قتل عام کے بعد انہیں اس بات کا خیال تو تھا ہی لیکن وہ نکلیں کیسے۔ یہ حالات تھا جب انہوں نے مجھے پوسٹ کارڈ بھیجا۔

دوارکا پرشاد کے دوست ایک ہندوستانی فوجی کانوائے کی طرف بھاگے ہوئے گئے جو اسی شام گجرات پہنچا تھا اور وہاں سے ایک فوجی ٹرک لے آئے۔ جب چچا اور ان کے گھر والے دو سوٹ کیسوں اور چند کمبلوں کے ساتھ ٹرک میں روانہ ہو گئے تو ان کے دوستوں نے سکھ کا سانس لیا۔ جی ٹی روڈ پر ان کا ٹرک فوجی اور سول ٹرکوں' تانگوں' بیل گاڑیوں' گھوڑوں اور گدھے پر سوار لوگوں کی نہ ختم ہونے والی قطار میں شامل ہو گیا۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ میں اس سڑک نے اتنی بڑی ہجرت کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔ جب صبح طلوع ہو رہی تھی تو انہوں نے سڑک کے کنارے شیشم کے درختوں میں سے گجرات پر

آخری نظر ڈالی۔ چناب کے کنارے بیساکھی کے میلے پر یہ منظر انہوں نے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔

موسم زدہ گہرے بھورے رنگ کے چپٹے سروالے مخروطی شکل میں ابھرتے ہوئے شہر پر انہوں نے آخری نظر ڈالی۔ میری چچی کا آبائی گھر قلعے کے اندر سب سے اونچے محلے میں تھا اور انہیں وہ مقام نظر آ رہا تھا جہاں سے ستائیس سال پہلے ان کی ڈولی تنگ گلیوں میں سے گزرتی ہوئی نیچے کاری دروازے کے اندر ہمارے گھر آئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان کے گھر' الماریوں اور کپڑوں' برتنوں' چادروں سے بھرے ہوئے ٹرنکوں اور ان کی بھینس اور اس کے بچے کا کیا ہو گا جسے وہ صحن میں بندھا ہوا چھوڑ کر آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں ان کا گھر لٹ جائے گا لیکن وہ اس وقت اتنی بے حس تھیں کہ انہیں کسی چیز کا پرواہ نہ تھی۔ دھواں اٹھتے ہوئے قصبوں اور جلے ہوئے دیہاتوں میں سے یہ قافلہ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح رینگتا گیا۔ ایک موقع وہ بھی تھا جب ہیڈ بلو کی کے' جہاں میں پیدا ہوا تھا' تنگ پل پر سے بیس لاکھ انسانوں کا ہجوم گزر کر عافیت کی تلاش میں جا رہا تھا۔ کھاریاں' وزیر آباد' گکھڑ' گجرانوالہ' ایمن آباد سے گزرتا ہوا یہ کاروان آگے کی طرف بڑھتا رہا اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر سے آنے والے قافلے اس میں ضم ہوتے گئے۔ تاخیروں' حملے کی افواہوں اور خطروں کے اعلانوں کے بعد یہ قافلہ راوی کے کنارے پہنچا اور پل پر سے گزر کر کے لاہور میں داخل ہو گیا۔ ان لوگوں کو چچا کی پرانے ڈی اے وی کالج میں ٹھہرایا گیا جو ایک بہت وسیع کیمپ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہاں سے وہ چھوٹے چھوٹے کنوائے کی صورتوں میں نکلنے لگے اور چچا والی پارٹی واگہ کی نئی سرحدی چوکی پر پہنچ گئی جو کبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن اس وقت کی ڈرامائی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑا نمایاں ہو گیا تھا۔ جب اس سرحدی چوکی سے ان کا ٹرک گزرا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر پاکستان کو دیکھا جو ان کا وطن تھا لیکن اب انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ٹرک نے انہیں امرتسر اتار دیا۔ اور سیکشن کے انچارج نوجوان مرہٹے میجر نے انہیں الوداع کہا۔ اسے واپس بھاگنا تھا کیونکہ ابھی بہت سے لوگ سرحد کے دوسری طرف موجود تھے۔ چچا نے شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سراسیمگی میں اپنے خیالات کو مجتمع نہ کر سکے۔ انہیں صرف وہ مضطرب لمحات یاد آ گئے جب ان کے ٹرک کو شالیمار پولیس چوکی پر روکا گیا تھا اور ان کے ارد گرد ایک خطرناک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ مرہٹہ میجر لپک کر ٹرک سے اترا تھا اور اپنے پستول نکال کر اس نے کہا تھا کہ وہ گولی کے زور پر راستہ بنا کر نکل

جائے گا۔ پولیس پیچھے ہٹ گئی تھی اور ٹرک بچ کر نکل گیا تھا۔ جب وہ میجر کے ساتھ ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے میجر سے پوچھا تھا کیا وہ ہمارے وطن پنجاب سے واقف ہے۔ میجر نے انہیں بتایا تھا کہ وہ تو نہیں جانتا لیکن بہت پہلے ان کے خاندان کا ایک فرد پنجاب آیا تھا۔ میرے چچا کو پتہ نہیں تھا کہ اس میجر کا تعلق بھاؤ صاحب کی فوج میں ایک نمایاں سپاہی سے تھا جس نے ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کی واپسی پر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔

طغیانی میں آئے ہوئے دریا کی باہر پھینکی ہوئی تباہ شدہ چیز کی طرح وہ اپنی بیٹی کے گھر پہنچے۔ لیکن میری چچی کا کھتری فخر بڑا تند و تیز تھا۔ چند دنوں کے آرام کے بعد جس کے لئے چچی نے اپنی بچی کھچی رقم سے ادائیگی پر اصرار کیا' انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ بیٹی اور داماد دونوں نے کہا کہ ان کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ جا کہاں رہے ہیں؟ اگرچہ اب وہ ہندوستان میں تھے لیکن سڑکیں اب بھی خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ پورا پنجاب شورش کی لپیٹ میں تھا۔ ایک دفعہ منہ کو خون لگ جانے کے بعد کسی امتیاز کے بغیر قتل اور غارت گری کا خطرہ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ بضد تھیں اور وہ اپنی بیٹی کی مہمان نوازی قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔

یہ خاندان پھر چل پڑا اور جی ٹی روڈ پر دلی جانے والے ایک کنوائے میں شامل ہو گیا۔ اب بارشیں شروع ہو گئیں تھیں۔ بیاس اور ستلج میں ایک خوف ناک سیلاب تھا اور ابلتا ہوا پانی بہت سے گھروں کو بہا کر لے گیا تھا۔ جب چچا والا قافلہ پہنچا تو پانی اتر چکا تھا۔ دور سے انہوں نے ایک وسیع علاقہ میں بے شمار کالے دھبے دیکھے۔ جب وہ قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ ملبہ در اصل لاشوں کے کالے کالے سروں کے ڈھیر تھے جن کو سیلاب اترتے وقت اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

امرتسر سے سفر کم خطرناک لیکن زیادہ پیچیدہ تھا اور یہ جانے بغیر کہ منزل کہاں ہے وہ لڑھکتے ہوئے جا رہے تھے۔ انسانوں کی ایک لہر انہیں آگے کی طرف دھکیل رہی تھی اور ایک سیلاب کی طرح کی یہ اجتماعی نقل مکانی مشرقی پنجاب کے دیہاتوں' قصبوں اور جلدی جلدی قائم کئے گئے پناہ گزینوں کے کیمپوں میں لوگوں کو ادھر ادھر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ ان کا بڑا حصہ دہلی پہنچ گیا۔ یہاں سے پناہ گزین کوچین سے کوہیما تک پورے ہندوستان میں پھیل ہو گئے۔ چچا اور ان کا خاندان بظاہر کسی وجہ کے بغیر اجمیر پہنچ گیا۔

راحت کاری تنظیم نے پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں چچا کو کام دے دیا۔ کوشش کر کے انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا۔ وہاں وہ ایک سال رہے۔ ان کی نظر میں ان کا کام غیر تسلی بخش تھا کیونکہ انہیں احساس ہو گیا تھا صرف ان کی ہمت بڑھانے کے لئے ان کے لئے یہ کام پیدا کیا گیا تھا۔ یہ در اصل ایک چھپی ہوئی خیرات تھی۔ وہ ہر وقت معمول کی عملی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر وہ کار بار کرنے کے خیال سے بھی دل بہلاتے رہے اگرچہ ایسا کام ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ اس وقت ان کی عمر باسٹھ سال تھی اور ایک دوسرے بھیس میں موت ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہی پتہ چلا کہ انہیں گلے کا کینسر ہے اور مشورے کے لئے وہ بمبئی آئے۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا اور بڑی صاف گوئی سے انہیں بتا دیا کہ ان کا معاملہ کافی خراب ہو چکا ہے اور واحد راستہ لاہور میں ایکس ریز کے ذریعے علاج ہے۔ ڈاکٹر کی رائے سننے کے بعد جس طریقے سے وہ باہر نکلے اسے دیکھ کر ڈاکٹر متاثر ہوا اور انہیں واپس بلا کر کہا، "ممکن ہے یہ لاعلاج بیماری ہو اور میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ معجزے بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ کو حوصلہ رکھنا چاہئے شاید اس سے کوئی مدد ملے" اور چچا کے معاملے میں واقعی معجزہ ہو گیا۔ مسلسل علاج کے بعد ڈاکٹروں نے انہیں بتایا کہ کینسر کے کوئی نشانات نہیں ہیں۔ در اصل انہیں کینسر تھا ہی نہیں۔

چنانچہ چچا نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور زندگی کو دوبارہ شروع کرنے کے موقعہ کی تلاش میں رہے۔ جب انہوں نے سنا کہ حکومت دلی سے اسی میل دور کرنال میں پناہ گزینوں کو زمین اور مالی امداد دے رہی ہے تاکہ وہ اپنا گھر بنا کر آباد ہو سکیں تو انہوں نے یہ موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اجمیر میں اپنی ملازمت ترک کرنے کے بعد انہوں نے کرنال میں اپنا گھر بنایا اور دوبارہ پریکٹس شروع کر دی۔ مختصراً ان کا کام چل رہا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اچھا چل رہا تھا۔ وہ جن کی طرح کام کرتے تھے لیکن اس میں انہیں خوشی نہیں ملتی تھی۔ وہ ہمارے والد سے بڑے مختلف تھے۔ وہ مجلسی آدمی تھے اور بڑی دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ لیکن گجرات چھوڑتے وقت وہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے سوا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لئے وسائل مہیا کریں، اس نئی خوشحالی سے انہیں کوئی خوشی نہ مل سکی۔ موت سے دو دفعہ بچنے کے بعد ان کا خاتمہ عجیب طریقے سے ہوا۔ ان کی السیشین کتیا نے انہیں اور ان کے ایک دوست کو کاٹ لیا۔ دونوں کا علاج ہوا لیکن چند ہفتے بعد پتہ چلا کہ چچا پر ویکسین کا اثر نہیں ہوا۔ اب انہیں کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ سخت اذیت میں جلا

ہو کر فوت ہوئے۔ آخری وقت تک ان کے ہوش و حواس قائم تھے۔

آج گجرات میں ہمارا کوئی نہیں۔ تقسیم کے وقت تمام ہندو وہاں سے چلے گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ راوی اور چناب کے درمیان، چناب اور جہلم کے درمیان، جہلم سے دریائے سندھ کے درمیان اور ہمالیہ کی پہاڑیوں سے لے کر پنج ند تک جہاں یہ پانچوں دریا ملتے ہیں، اس سارے علاقے میں جو ہماری برادریوں کا وطن تھا اور جو وہ سرزمین تھی جس میں تاریخ کے آغاز سے ہی ہم رچے آئے تھے، اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔

تقسیم نے کئی زندگیوں کا راستہ بدل دیا۔ اگر تقسیم نہ ہوتی تو یہ زندگیاں اپنے عمومی راستوں پر چلتی رہتیں۔ کچھ خوش قسمت تھے جن کو تھوڑا بہت سہارا مل گیا اور انہوں نے از سر نو اپنی زندگیوں کا آغاز کیا۔ لیکن اصلی دکھ اٹھانے والے وہ لوگ تھے جن کو بتدریج کم ہوتے ہوئے سیلاب کی موجیں دوبارہ بہا کر لے گئیں۔ جب تقسیم کی رستا خیز ختم ہو گئی تو چند ایک نیک نیت مگر کوتاہ اندیش لوگوں نے اغوا شدہ لڑکیوں کی بازیابی سے تقسیم کے دکھوں کا اندمال کرنے کوشش کی۔ انہوں نے اپنے بڑے مصمم ارادوں سے برسوں تک اغوا شدہ عورتوں کو تلاش کیا۔ ان میں نمجھ داری کی مریضانہ حد تک کمی نے بعض اوقات ان عورتوں کو دوبارہ جڑوں سے اکھیڑ دیا اور ان کے لئے تازہ المئے کھڑے کر دئے۔ ایسی ہی ایک کہانی میرے ایک بھتیجے نے سنائی جو فوج میں ایک افسر ہے۔

تقسیم سے پانچ سال بعد ۱۹۵۲ء میں ہری کلکتے میں تعینات تھا۔ وہاں اس کی اور اس کی بیوی کی ملاقات ایک نوجوان سکھ سے ہو گئی جو ان کے گھر کے پچھواڑے رہتا تھا۔ وہ بڑا سادہ اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ ہری اور اس کی بیوی اسے بہت پسند کرتے تھے۔ ہری کو معلوم ہوا کہ وہ سکھ نوجوان سابقہ فوجی ہے۔ یوں ایک اور رشتہ پیدا ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہری وردی میں تھا تو اس نوجوان نے ہری کو فوجی انداز سے سیلوٹ کیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ عادت سے مجبور ہو کر اس نے ایسا کیا ہے کیونکہ وہ فوج میں رہ چکا تھا۔ وہ اک سکھ رجمنٹ میں تھا اور اس نے مشرق بعید میں فوجی خدمات سر انجام دی تھیں۔ پھر وہ انڈین نیشنل آرمی میں چلا گیا جو جاپانیوں سے مل گئی تھی۔ ہری اور اس نوجوان میں دوسری مشترکہ چیز گھڑ دوڑ تھی۔ ٹپس کے لئے وہ اکثر ہری کے پاس آتا تھا۔ اس معاملے میں ہری کی خفیہ معلومات پر اسے پورا اعتبار تھا۔ ان ٹپس کی بنا پر ایک دفعہ وہ بڑا کامیاب رہا تھا۔

ایک دن یہ سکھ نوجوان ہری کو بڑا پریشان نظر آیا جو اس کے لئے ایک غیر معمولی چیز

تھی۔ جب زور دے کر اس سے پوچھا تو اس سارا معاملہ یوں بیان کیا۔

انڈین نیشنل آرمی سے فارغ ہو کر وہ جالندھر واپس آ گیا اور اپنے والدین کے پاس رہنے لگا۔ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو ہر شخص پاگل ہو گیا۔ وہ بھی اس دیوانگی میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن اس نے اور اس کے ایک دوست نے ایک مجمع دیکھا جو دو مسلمان لڑکیوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس مجمعے نے ان لڑکیوں کے گھر کو آگ لگا دی تھی اور جو بھی باہر نکلا اسے قتل کر دیا تھا۔ صرف یہ دو بہنیں باقی بچی تھیں۔ وہ ان کی خوف زدگی اور حسن سے بڑا متاثر ہوا اور اس کے حواس بحال ہو گئے۔ کسی خوف کے بغیر اس نے اس مجمعے کو مخاطب کر کے کہا: "دیکھو تم نے اس مسلمان گھر اور ان کے سامان کو جلا دیا ہے۔ تم نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ ان دو لڑکیوں کے سوا سب آدمی مر گئے ہیں۔ تم انہیں کیوں مارنا چاہتے ہو؟ میں ایک غریب آدمی ہوں اور میرا دوست بھی میرے جیسا ہی غریب ہے۔ ان لڑکیوں کو ہمارے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟ ہم انہیں سکھ بنا لیں گے اور ان سے شادیاں کر لیں گے۔ ان کو قتل کر کے ضائع کرنے کی بجائے ان دو سکھ بھائیوں سے نیکی کرو"۔

وہ ہجوم ایک دن کے لئے شاید کافی قتل کر چکا تھا۔ ان کو یہ دلیل اچھی لگی اور ان لوگوں نے ان لڑکیوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ یہ سکھ نوجوان ایک لڑکی کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔ اس کی ماں نے اس لڑکی کو فوراً پسند کر لیا۔ جب لڑکی کا خوف دور ہو گیا تو اس نے بھی اس بہادر نوجوان کو پسند کرنا شروع کر دیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ ان کی شادی ہو گئی اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ والدین اور سابقہ زندگی کی یادیں دھندلانے لگیں۔ وہ دونوں بڑے خوش تھے۔ ان کے ہاں ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔

اس دوران سوشل کارکن اغوا شدہ لڑکیوں کو برآمد کر کے مغربی اور مشرقی پنجاب میں ان کے رشتے داروں کے حوالے کرنے لگے تھے۔ شوہروں سے جن سے وہ محبت کرنے لگی تھیں اور بچوں سے جدا کر کے کئی لڑکیوں کو ان کے والدین کو واپس کیا گیا جو سمجھتے تھے کہ وہ لڑکیاں مر چکی ہیں۔ یوں ایک معزز شادی شدہ عورت کے مقام سے گر کر وہ یکدم اچھوت بن گئیں اور ذات باہر ہو گئیں۔ ان میں ہمت نہ رہی کہ وہ بتا سکیں کہ وہ اغوا ہونے کی مدت کے دوران خوش تھیں۔ لیکن سوشل کارکن جن میں اکثریت ٹھنڈی اور جذبات سے عاری عورتوں کی تھی، بڑے جوش اور جذبے سے کام کرتی رہیں اور پولیس اور

قانون کی مدد سے وہ اپنے جال کو زیادہ سے زیادہ تنگ کرتی گئیں۔

دوسری بہن اتنی خوش نصیب نہیں تھی۔ لڑکا جو اسے اپنے گھر لے گیا تھا اس لڑکی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ وہ بھاگ گئی اور پولیس کی مدد سے اپنے والدین کے پاس پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنے والدین کو اپنی دوسری بہن کے بارے میں بتایا۔ اس کے باوجود کہ اسے پتہ تھا کہ اس کی بہن خوش ہے یا شاید اسی بنا پر اس نے پاکستان پولیس کو اطلاع کر دی اور اس کا جالندھر میں پتہ بھی بتا دیا۔

اس پر جالندھر پولیس نے تحقیقات شروع کر دی۔ اس سکھ نوجوان کو بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ بھاگ کر کلکتے آ گیا۔ یہاں کئی برسوں تک وہ چھپا رہا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس جالندھر نہیں جا سکتا۔ سوشل کارکن اور پولیس اس تک یہاں بھی پہنچ گئے۔ وہ اس کے گھر کے چکر لگاتے رہے اور ہمسائیوں سے بھی پوچھ گچھ کرتے رہے۔ یہ بیچارہ نوجوان بڑا خوف زدہ تھا اور ہری کے پاس مشورے کے لئے آیا تھا۔ اس نے ہری سے درخواست کی کہ وہ اپنی بیوی اوشا کو اس کی بیوی کے پاس یہ اطمینان کرنے کے لئے بھیجے کہ وہ خوش ہے کہ نہیں اور وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے کہ نہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ہری سے مدد مانگے گا۔

اوشا نے اس کی بیوی کو گھر بلایا۔ وہ انیس یا بیس سال کی خوبصورت، خاموش اور شرمیلی لڑکی تھی۔ چند الفاظ میں ہی اس نے اپنے شوہر کے بیان کی تصدیق کر دی۔ وہ اپنے بچے اور شوہر سے محبت کرتی تھی اور اپنے والدین کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اب اس کا گھر یہیں تھا۔ جب وہ اس بے انصافی کی بات کر رہی تھی تو اس کے الفاظ میں خاصا جوش پیدا ہو گیا تھا اور اس نے کہا کہ وہ خود کشی کر لے گی مگر واپس نہیں جائے گی۔

ہری اور اوشا کافی متاثر ہوئے کیونکہ وہ میاں بیوی بھی ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے تھے۔ ہری اور اوشا کی ملاقات بھی اسی قسم کے فسادات میں ہوئی تھی۔ انہوں نے لڑکی کو چھپا لینے کی پیشکش کر دی اور کہا کہ اس دوران وہ اسے بچانے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے چند دوستوں سے بات کی جنہوں نے سوشل کارکنوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور آخر کار عدالت سے تمام کاروائی کو تا حکم ثانی معطل کروا لیا۔ قانون اپنے بھاری بھرکم طریقے سے چلتا رہا۔ اسی اثنا میں اپنی بیوی کو کھو دینے کے ڈر سے اس نے پھر بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ پولیس اس کو ضرور پکڑ لے گی۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ پنجاب کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں چلے جائیں جہاں ان کو

کوئی نہ جانتا ہو اور پولیس والوں سے اسے کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس کی بیوی کو دوسرا بچہ ہونے والا تھا۔ ہری اور اوشا ان کے جانے پر بڑے ناخوش تھے اور اپنی خواہش کے برعکس وہ اس بات پر رضامند ہو گئے۔ ان کے خیال کے مطابق شاید اس وقت ان حالات میں صرف یہی ایک راستہ ہو۔ اس اثنا وہ اس کو چھڑانے کی کوشش میں لگے رہیں گے تاکہ وہ چین سے رہ سکیں۔

ایک سال سے زیادہ وقفے کے بعد وہ سکھ نوجوان واپس آیا۔ جب وہ رات کو واپس گھر لوٹے تو ہری اور اوشا نے اسے منتظر پایا۔ لیکن وہ بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی زندہ دلی اور خوش باشی ختم ہو چکی تھی۔ ہری نے سوچا کہ جب وہ اسے بتائے گا کہ اس کی بیوی آزاد ہو چکی ہے تو وہ بڑا خوش ہو گا۔ لیکن اس شخص کے آنسو بہہ نکلے۔ "کپتان صاحب بہت دیر ہو گئی ہے اب عدالتی حکم بے معنی ہے"۔

وہ پنجاب کے ایک دیہات میں چلے گئے تھے کچھ عرصے تک حالات ٹھیک رہے لیکن پولیس پھر آ گئی اور پھر پوچھ کچھ کرنے لگی۔ اس کی بیوی کی زچگی کا وقت قریب آ چکا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑا اور وہ اور اس کی بیوی گنے کے کھیت میں چھپ گئے۔ وہاں اس نے ایک گڑھا کھودا ویسے ہی جیسے اسے فوج میں تربیت دی گئی تھی اور مورچہ بنا لیا۔ بیوی کو ہر ممکن آرام پہنچانے کے بعد خود بندوق لے کر وہاں چھپ کر لیٹا رہا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے اس سے اس کی بیوی کوئی نہیں چھین سکتا۔ اسی گڑھے میں اس نے خود اپنی بیوی کی زچگی کرائی۔ دوسرے دن اس کی بیوی کو بخار آ گیا۔ پولیس کے خوف سے وہ اسے ہسپتال نہ لے جا سکا۔ پولیس اور سوشل کارکنوں سے وہ بہت خوف زدہ تھا۔

"کپتان صاحب جو کچھ آپ نے میرے لئے کیا اگرچہ اب بے سود ہے تاہم میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ اب انہیں یقین آ گیا ہے کہ وہ میرے پاس نہیں ہے"۔

یہ الفاظ کہہ کر وہ مڑا اور چل دیا۔ ہری اور اوشا نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اٹھارہواں باب

تقسیم کے وقت ہم تینوں بھائی پنجاب سے باہر مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ جنگ سے پہلے ہی میرا بڑا بھائی شمالی بہار میں ایک شوگر فیکٹری میں بطور انجینئر کام کر رہا تھا اور میرا چھوٹا بھائی بمبئی میں ایک ایئر لائن میں کام کر رہا تھا۔ دونوں کی شادیاں لاہور کی پنجابی لڑکیوں سے ہوئی تھیں۔ گارڈ اور اس کی رشتے کی بہنیں سال میں ایک دفعہ لاہور جاتی تھیں۔ میرے بھائی اپنی سالانہ چھٹیوں میں ان کے پاس لاہور ہی آ جاتے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں میں اکثر لاہور جایا کرتا تھا۔ ہر دفعہ گارڈ اور بچے کئی مہینے میرے والد کے پاس رک جاتے تھے۔ ہم تینوں بھائیوں نے اپنے اپنے گھر بنانے کے لئے پلاٹ خرید لئے تھے کیونکہ خیال تھا کہ کالج میں تعلیم کے لئے ہمارے بچے شاید لاہور ہی آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، ہمارے بچے ہندوستان میں اور دور دور تک چلے جائیں مگر ان کا وطن تو لاہور ہی ہو گا۔ وہیں ہمارے بچوں کی شادیاں ہوں گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ بچے لاہور ہی میں آباد ہو جائیں کیونکہ پنجاب ترقی کر رہا تھا اور اندازہ تھا کہ یہاں کافی مواقع میسر آئیں گے۔ ہمارے یہاں مستقل نہ رہنے کے باوجود دوستوں اور ہمسائیوں کے ساتھ ہمارے والدین کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ ہمارے بچوں کو یہ تعلقات ورثے میں ملیں گے۔ چنانچہ ہم نے اپنی زندگیوں کی ایسی منصوبہ بندیاں کی تھیں جن میں لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل تھی ہمارے خیال میں یہی وہ جگہ تھی جہاں ہم بھی ریٹائر ہونے کے بعد آ کر رہیں گے۔

لیکن تقسیم نے سب کچھ بدل دیا۔ پنجاب میں اب ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ کئی پناہ گزین مشرقی پنجاب میں آباد ہو گئے تھے لیکن ہمارے لئے اور کئی بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے بھی جب مغربی پنجاب ہی چلا گیا تو سب کچھ چلا گیا اب وطن وہی تھا جہاں ہم اپنی روٹی کماتے تھے۔ وہ لوگ جنہیں مشرقی پنجاب میں سہارا نہ ملا وہ پورے ہندوستان میں پھیل گئے ان کی ہمت اور حوصلے کی لوگ داد دیتے تھے۔ یہ سادے لوگ جو اپنے گھروں سے کبھی پچاس میل دور نہیں گئے تھے، ہندوستان میں چاروں طرف نکل کر پھیل گئے اور ایسی ایسی جگہوں پر پہنچ گئے جن کا نام بھی انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ ایک سکھ جو پشاور

میں ہماری کمپنی کا تھوک فروش تھا' بمبئی میں میرے دفتر آیا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سرحد کے دونوں طرف ہماری کمپنی اپنے ڈیلروں اور سٹاف کی بحالی میں مدد دے گی۔ میں نے اسے کٹک میں ڈیلر شپ کی پیش کش کر دی جو کلکتے کے جنوب میں چار سو اور پشاور سے مشرق میں دو ہزار میل دور تھا۔ وہ بہت خوش ہو ا اور کہا بس وہ جگہ بڑی اچھی ہے اس کی آب و ہوا بھی اچھی ہے اور کاروباری مستقبل بھی اچھا ہے۔ وہ میرا بڑا ممنون ہوا اور مجھے بتایا کہ اس کا بیٹا اور وہ پہلی ہی گاڑی سے کٹک پہنچیں گے۔ لیکن باہر جاتے وقت اس نے مڑ کر مجھ سے پوچھا" ٹنڈن صاحب ویسے کٹک ہے کہاں؟ یہ بالائی ہندوستان میں ہے یا زیریں ہندوستان میں؟ ہم نے پیشاور میں یہ نام کبھی نہیں سنا تھا"۔ اس نے اپنی ناواقفیت کے لئے معافی مانگی اور کہا کہ میری پیش کش اس کی ناواقفیت سے متاثر نہیں ہو گی۔ اس کے دور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ صرف جاننا چاہتا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی اور میں نے پنجاب کو بھول جانے اور بمبئی کو ہی اپنا گھر سمجھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پالی ہل کے نیچے عیسائیوں کی اکثریت والی آبادی میں ہم نے ایک دوسرے کے قریب دو چھوٹے چھوٹے گھر بنا لئے تھے۔ ہم پہلے بھی کئی سال اس علاقے میں رہ چکے تھے۔ یہاں ہم نے کئی دوست بنا لئے تھے۔ فطری طور پر ہم نے اپنی جڑیں گہری اتارنی شروع کر دیں تھیں۔ شادیوں' جشنوں اور جنازوں پر ہمیں ان کی بلاوے آتے تھے۔ انہیں ہمارے پنجابی یا جیسے کہ وہ سمجھتے تھے ہندوستانی' طور طریقے غیر معمولی لگتے تھے۔ ہمارے بچے مقامی سکولوں میں جاتے تھے جہاں وہ انگریزی پڑھتے تھے اور گھر میں وہ ہندی بولتے تھے۔ پنجابی انہوں نے سیکھی ہی نہیں۔

والد نے اپنا وقت ہم تینوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ شمالی بہار میں میرے بڑے بھائی کے پاس ٹھہرتے تھے' کچھ عرصہ میرے پاس اور کچھ عرصہ میرے چھوٹے بھائی کے پاس۔ لیکن میرے خیال میں وہ خوش نہیں تھے۔ وہ کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے اور انہیں ہمیشہ لاہور کی یاد ستاتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن' اپنے ہم عمر دوست اور ریٹائر شدہ سرکاری ملازم انہیں یاد آتے تھے جن کے ساتھ کام کرتے ہوئے انہوں نے عمر گزاری تھی۔ انہیں پنجاب' اس کی آب و ہوا اور اپنے وسیع گھر کی آسائش یاد آتی تھیں۔ انہیں اپنے پرانے رشتے دار بھی یاد آتے تھے جن کے ساتھ وہ خاندانی معاملات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ جب کبھی ان کی ابتدائی زندگی اور ملازمت کا ذکر آتا وہ چہک اٹھتے تھے۔ میری ملازمت میں انہیں بڑی دلچسپی تھی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق صنعت میں میری افسری

اتنی ہی نئی تھی جتنی کہ پچاس سال پہلے ان کی اپنی ملازمت۔

جب میرے چھوٹے بھائی کا تبادلہ دہلی ہو گیا تو والد بھی اسی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں وہ اپنے آپ کو پنجاب کے قریب محسوس کرتے تھے۔ انہیں ملنے کے لئے رشتے دار اور پرانے دوست کبھی کبھی آ جاتے تھے۔ ان کی عمر کم ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے گھر سے باہر کی دنیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے آخری دن ان میں غیر معمولی طور پر کچھ زندہ دلی نظر آئی۔ انہوں نے سردیوں کی ساری دوپہر برآمدے میں گرم دھوپ میں بیٹھ کر گزاری۔ اپنی بھتیجی' اس کے شوہر اور ان کے بچوں سے ملاقات کر کے وہ بہت خوش تھے۔ کرشن کا خیال تھا کہ بہت دنوں کے بعد والد اتنے خوش نظر آئے تھے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ گہری نیند سو گئے۔ نئے سال کی صبح کو کرشن اور اس کی بیوی ان کے کمرے میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ جلدی ناشتہ کرنے بعد وہ پھر سو گئے ہیں۔

جب وہ لوگوں سے ملنے کے بعد واپس آیا تو اس وقت بھی والد سوئے رہے تھے۔ جب غور سے دیکھا تو وہ اس جہاں فانی سے جا چکے تھے۔ جاگے بغیر بڑے آرام سے وہ اپنی نیند ہی میں ابدی نیند سو گئے تھے۔